خوفناک نمبر

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

اس شمارے کے ساتھ رنگین پنسل بکس

مفت حاصل کیجئے

جنوری ۱۹۸۹ء

اس شمارے کو کمزور دل بچے نہ پڑھیں! سرورق کی اسٹوری "بھوت فیکٹری" اندر ملاحظہ کیجئے

لیور برادرز کا
بلوبینڈ
مارجرین
اب اور بھی مزیدار !
Blue Band
MARGARINE
لیور برادرز کا
بلوبینڈ مارجرین
لذت ہی لذت ـ توانائی ہی توانائی

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ABC آڈٹ بیورو سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت!

آنکھ مچولی

مُدیرِ اعلیٰ ظفر محمود شیخ

مُدیرِ مسئول تجمّل حسین چشتی

جلد ۳ شمارہ ۷ جنوری ۱۹۸۹ء جمادی الاول ۱۴۰۹ھ

مُشاورت مُشفق خواجہ، امجد اسلام امجدؔ مُدیرانِ اعزازی طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلسِ ادارت شاہ نواز فاروقی، سیّد خورشید عالم، محمّد اعظم منہاس خطّاطی عارف سعید

قیمت ۱۲ روپے

۸ درہم
۸ ریال

زرِ سالانہ کیلئے خصوصی بچت کا صفحہ دیکھیں

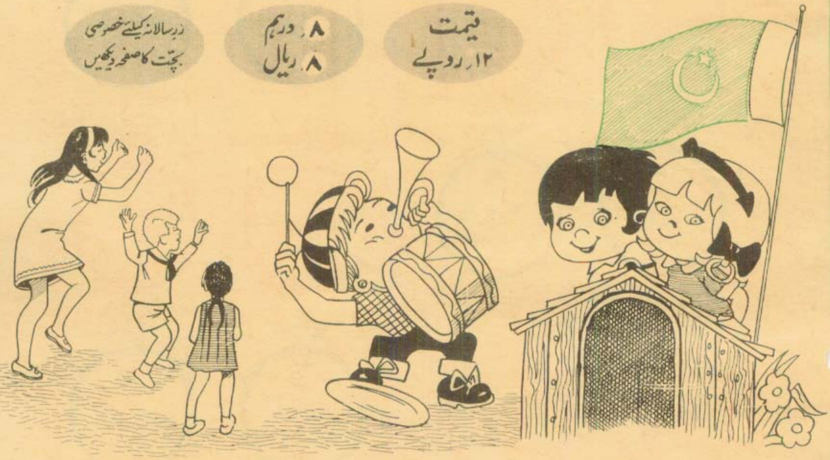

- ماھنامہ آنکھ مچولی میں شائع ھونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ھیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔
- ماھنامہ آنکھ مچولی میں شائع ھونے والی قرآن وحدیث پرمبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ھیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ھوگا۔
- ماھنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذھنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

نَاشِر : ظفر محمود شیخ طَابع : زاہد علی مَطبَع : لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

خط وکتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

حسنِ ترتیب

- ۶ بازگشت — تاریخ کے دریچے سے
- ۷ حمد — حفیظ جالندھری
- ۹ اداریہ
- ۱۱ ڈاکیہ ڈاک لایا — خطوط کے جواب
- ۱۵ جن بھوت قرآن کی روشنی میں — حافظ احسان الحق
- ۲۱ ایک رات قبرستان میں — عبدالسلام سلامی
- ۲۶ پہچان تو لیا ہوگا (نظم)
- ۲۷ ڈریکولا — عقیل عباس جعفری
- ۳۱ وہ کون تھا؟ (دمق اسکواڈ) — اخلاق احمد
- ۳۹ بے چین روح — قدرت اللہ شہاب
- ۴۷ چھن چھن چھن... — ڈاکٹر جمیل جالبی
- ۵۷ ڈھانچوں کے درمیان — جنید شمیم
- ۵۹ ہم کیوں ڈرتے ہیں؟ — طاہر مسعود
- ۶۵ ہمارا آسیبی گھر — سیدہ خورشید عالم
- ۷۱ فضا میں معجزہ — ترجمہ: س، خ، ج
- ۷۴ انوکھا انتقام — ماہر یونس
- ۸۶ بے چارہ بے قصور (نظم) — شعرا: جہانگیر، عارف، اختر
- ۸۸ خلا میں بھوت — شانی ایوب
- ۹۳ وہ ایک رات — سید عبدالودود شاہ
- ۱۰۱ امتحان کا خوف (نظم) — علی ذوالقرنین جگنو

۱۰۳ کھیلوں میں خوف کے لمحے — ضیاء الرحمٰن ضیاء
۱۰۷ دُنیا میرے آگے — بچوں کا خبرنامہ
۱۱۱ بھوت فیکٹری — مشہود شہزاد
۱۱۵ وہ رات اور کالا باغ — ثمین فاروقی
۱۲۳ خوف + ناک خوفناک — محمد جاوید خالد
۱۲۹ کھٹے میٹھے — (منتخب لطائف)
۱۳۵ عکس (سلسلے وار سائنسی ناول) — شاہ نواز فاروقی
۱۴۰ عجیب و غریب لوگ — محمد شعیب خازیانی
۱۴۷ انٹرویو خواجہ شمس الدین عظیمی — محمد سلیم مغل
۱۶۳ سامری جادوگر — مریم رضوی
۱۶۸ ہاتھی اور چھ نابینا (نظم) — شاہ نواز فاروقی
۱۷۰ دُنیا کے عظیم بھوت — ابن عالم
۱۷۵ میری ڈائری — بچوں کی ڈائریوں سے اقتباسات
۱۷۹ نیک جن — کلیم چغتائی
۱۸۷ طالبات سے طلبہ بہتر ہیں — نتائج تحریری مباحثہ
۱۹۳ لنکن اور کینیڈی — نسیم سحر اکبرآبادی
۱۹۵ جب میں نے بھوت کو قتل کیا — طارق جمیل
۱۹۹ ہم مسلمان ہیں؟ (نظم) — سید نظر زیدی
۲۰۱ پہلا شکار — رابعہ محمود
۲۰۷ کتابوں کی دُنیا — کتب پر تبصرہ (ادارہ)
۲۱۱ سائنس انکوائری — نیر ابدالی
۲۱۵ کھٹی چٹی معلومات — عقیل عباس جعفری
۲۱۹ ننھی نگارشات — نئے لکھنے والوں کی تحریریں
۲۴۲ امی ابو کا صفحہ — اُم ریحا

تاریخ کے دریچے سے

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں رات بھر غائب رہے۔ ہم لوگ سخت پریشان تھے کہ کہیں آپ پر کوئی حملہ نہ کر دیا گیا ہو۔ صبح سویرے ہم نے آپ کو حرا کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا۔ پوچھنے پر آپؐ نے بتایا کہ ایک جن مجھے بلانے آیا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ آکر یہاں جنوں کے ایک گروہ کو قرآن سنایا۔ (مسلم

مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کی ایک اور روایت ہے کہ ایک مرتبہ مکّہ میں حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ آج رات تم میں سے کون میرے ساتھ جنوں کی ملاقات کے لیے چلتا ہے؟ میں آپؐ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مکّہ کے بالائی حصّہ میں ایک جگہ حضورؐ نے لکیر کھینچ کر مجھ سے فرمایا کہ اس سے آگے نہ بڑھنا۔ پھر آپؐ آگے تشریف لے گئے اور کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے اشخاص ہیں جنہوں نے آپؐ کو گھیر رکھا ہے اور وہ میرے اور آپؐ کے درمیان حائل ہیں۔ (ابن جریر - بیہقی - دلائل النبوۃ - ابونعیم اصفہانی) بحوالہ تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۶۱۹

تو ہی سب کا پالن ہار

حفیظ جالندھری

تُو نے یہ سنسار بنایا اتنا سارا کھیل رچایا
موتی، ہیرے، سونا، رُوپا تیری دولت تیری مایا
دِن کے مُکھ پر تیرا پرتو رات کے سَر پر تیرا سایا
پُھولوں سے دھرتی مہکائی تاروں سے آکاش سجایا
آگ، ہوا، مٹی اور پانی سب میں جانداروں کو بسایا
تُو ہی پالنے والا سب کا سب تیرے بالک ہیں خُدایا

تُو سب سے رکھتا ہے پیار
تُو ہی سب کا پالن ہار

"کیا آج
آپ نے دانت
میکلینز
کیے ؟"
"ہر روز
دو بار"
FLUORIDE-CALCIUM
macleans
macleans
میکلینز
کیلشیم اور فلورائیڈ کے ساتھ۔
دُنیا بھر میں، دانتوں کی مکمل ترین حفاظت!
8-3-87
ASIATIC

اداریہ

یہ تو آپ بھی مانیں گے کہ آنکھ مچولی پٹے پٹائے ہوئے رستے پر چلنا اور چبے چبائے نوالے کو چبانا پسند نہیں کرتا۔ یہ رسالہ ہمیشہ اپنے لیے نئی راہ نکالتا ہے اور نئے موضوعات تلاش کرتا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ آنکھ مچولی اپنے پڑھنے والے ساتھیوں کو وہ مواد فراہم کرے جو بہترین ہو، لائق تحسین ہو اور جس کی مثال دوسرے پیش نہ کر سکتے ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی تعریف اپنے منہ سے اچھی نہیں لگتی۔ لیکن غیر ضروری انکساری بھی کوئی قابل تعریف بات نہیں۔ ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے وہ کوئی ایسا دعویٰ نہیں جس کی تصدیق بھی نہ ہو سکے۔ آنکھ مچولی کے عام شمارے اور اس سے بڑھ کر ایک ہزار چار سو چوالیس صفحات پر پھیلے ہوئے اس کے دو ضخیم سالنامے، ایک خاص نمبر اور پھر "کرکٹ اسپیشل" "قہقہہ نمبر" اور اب "خوفناک نمبر" اسی دعوے کو جانچنے کے پیمانے ہیں۔

"خوفناک نمبر" بچوں کی صحافت میں ایک انوکھا اچھوتا اور جرأت مندانہ تجربہ ہے۔ یہ انسان کے ایسے بنیادی جذبے وجبلت کے متعلق معلومات کے خزانے کو یکجا کرنے کی کوشش ہے جو ہر عمر کے افراد کی یکساں دلچسپی اور کشش کا باعث ہے۔ ممکن ہے "خوفناک نمبر" سے بہت سے ساتھی یہ تاثر لیں کہ اس شمارے کی اشاعت کا مقصد پڑھنے والوں کو ڈرانا یا اُنھیں خوفزدہ کرنا ہے۔ حقیقتاً ایسا بالکل نہیں ہے۔ اس خصوصی شمارے کی اشاعت کا اصل مقصد خوف کے جذبے کے مختلف پہلوؤں کو مذہبی، علمی اور تفریحی نقطۂ نظر سے پیش کرنا ہے۔ لہٰذا آپ دیکھیں گے کہ مضامین اور کہانیاں اور دیگر چیزیں نہ صرف آپ کی معلومات میں اضافہ کریں گی بلکہ آپ کو لطف اندوز بھی کریں گی۔

"خوف ناک نمبر" اس توقع کا اظہار ہے جو ہم اپنے پڑھنے والوں سے رکھتے ہیں۔ اور وہ توقع یہ ہے کہ زندگی کو ہر قسم کی خرافات سے پاک ہونا چاہیے۔ خواہ یہ خرافات بے سروپا توہمات کی شکل میں ہو یا واقعات کی صورت میں (اس کا بہت کچھ اندازہ آپ کو ان کہانیوں سے ہو سکے گا جو شائع کی جا رہی ہیں) ایک ستھری ستھری زندگی کا تصور، نئی نسل ہی کے ذہن میں واضح ہو سکتا ہے، جس نے جنگلوں سے زیادہ شہر دیکھے ہیں۔ اور جو اندھیروں کی نہیں اُجالوں کی باسی ہے۔

چلتے چلتے ایک وضاحت۔ عین ممکن ہے کہ بعض تحریریں آپ کے اعصاب پر سوار ہونے کی کوشش کریں تو یہ اس بات کا امتحان ہوگا کہ آپ کو اپنے اعصاب پر کتنا کنٹرول ہے۔

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

ایک بار کی زحمت

سال بھر کا آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے ہر ماہ حاصل کرنے کے لیے

صرف ایک بار زحمت کیجیے اور ۱۲ ماہ تک اپنا پسندیدہ رسالہ باقاعدگی سے حاصل کیجیئے۔

آنکھ مچولی کے (۱۲) شماروں کی قیمت مع دو خاص نمبر اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ (۱۳۲) روپے بنتی ہے، لیکن خصوصی بچت اسکیم کے تحت آپ کو صرف (۹۰) روپے ادا کرنے ہوں گے۔ یوں گویا بہ یک وقت آپ دو فائدے اٹھا سکتے ہیں۔

① **۴۲** / روپے کی خصوصی بچت۔

② گھر بیٹھے رجسٹرڈ ڈاک سے رسالے کی بحفاظت ترسیل۔

یاد رہے کہ

رسالے کی قیمت میں اضافے کے باوجود زرِ سالانہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

اگر آپ سالانہ خریداری کے لیے ہماری خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہونا چاہتے ہوں تو **۹۰ روپے** کا منی آرڈر اور مندرجہ ذیل کوائف ایک علیحدہ کاغذ پر روانہ کریں۔

① خریدار کا نام ② مکمل پتہ ③ رسالہ کس ماہ سے جاری کیا جائے ④ فون نمبر (اگر ہو) ⑤ دستخط

"خصوصی بچت اسکیم" ماهنامہ آنکھ مچولی۔ ڈی-۱۱۲- نورس روڈ سائٹ کراچی ۱۶

ڈاکیہ ڈاک لایا

طارق احسان، لیاقت آباد، کراچی:۔ میں اسٹال پر پہنچا تو چمکتا دمکتا آنکھ مچولی نظر آیا۔ فوراً خریدا، سرورق تو اتنا خوبصورت تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ آپ اتنے اچھے اچھے سرورق کیسے بناتے ہیں۔ ضرور بتائیے گا۔

○ پیارے بھائی۔ سرورق کسی بھی رسالے کا چہرہ ہوتا ہے اور چہرے کو حسین تو ہونا ہی چاہیے۔ ویسے کہا گیا ہے کہ حُسن دیکھنے والی آنکھ میں ہوتا ہے تو اس میں اصل کمال آپ کے اندازِ نظر کا ہے۔

شکیل احمد، فیصل آباد:۔ البیرونی کے متعلق ایک مضمون بھیج رہا ہوں۔ باری آنے پر شائع کر دیجیے گا۔ میں آپ کو مضامین کہیں سے نقل کر کے نہیں بھیجتا بلکہ اپنے ڈیڈی کی کتاب سے لکھ کر بھیجتا ہوں.... مجھے اخلاق احمد کی کہانیاں بہت پسند ہیں۔

○ ایک مضمون لکھنے کے لیے کئی کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ مضمون اچھا ہو تو ضرور شائع کیا جاتا ہے۔ اخلاق احمد آپ کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔

رانا گلزار احمد، علی پور:۔ پیاری باجی! کچھ عرصے پہلے میں نے آپ کے پاس دو کہانیاں بھیجی تھیں ان کا آپ نے حشر نشر کر دیا۔ مجھے آپ پر بہت غصہ آیا اور میں نے دو ماہ تک غصے سے آپ کا رسالہ بھی نہیں پڑھا۔ اب پھر ایک کہانی "عہد" بھیج رہا ہوں۔

○ بھئی آنکھ مچولی میں کوئی باجی تو ہوتی نہیں ہیں، یہاں سب کے سب بھیا یا بھائی جان ہیں اور یہ چھوٹی موٹی باتوں پر اتنا غصہ نہیں کیا کرتے لکھنے والے تو باہمت لوگ ہوتے ہیں۔ کہانی باری آنے پر پڑھی جائے گی۔

اورنگ زیب عالمگیر، سدھانڈی، چکوال:۔ امان خان دل نے "ہائے ہماری ہاکی ٹیم" لکھ کر ہمارا دل موہ لیا۔ مگر اس ہاکی ٹیم میں شرم وحیا نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ ہاکی کے عہدیداران ان لوگوں کی نکتہ چینیوں کو ہنس کر سہہ جاتے ہیں اور کہتے ہیں ؏ "شرم ہم کو مگر نہیں آتی"۔

○ اورنگ زیب میاں! ہاکی ٹیم اور اس کے عہدیداران تو جیسے ہیں ویسے ہیں۔ لیکن ہم لوگوں کا رویّہ بھی مثبت نہیں

ہے ۔ جب ٹیم جیتتی ہے تو ہم اُسے سَر پہ بٹھا لیتے ہیں ۔ اور ہارتی ہے تو اُسے اُٹھا کر زمین پر دے مارتے ہیں ۔ ٹیم کی شکست پر جھنجھلانے کے بجائے اس کا حوصلہ بڑھانا چاہیے ۔ تاکہ اگلی بار تو محنت سے کھیل کر کامیابی حاصل کرے ۔

محمد جمال ۔ اسلام آباد ،۔ مجھے اپنے بھائی کی رنگین تصویر آنکھ مچولی میں شائع کرانی ہے ... کیا میں تصویر بھیج دُوں ؟

○ آنکھ مچولی میں صرف ان بچّوں کی رنگین تصویریں شائع کی جاتی ہیں جنہوں نے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہو.

ایم آصف ، نارتھ کراچی ،۔ میری کہانی قابلِ اشاعت ہونے کے باوجود اب تک کیوں نہیں چھپی ؟

○ واقعی آپ کی کہانی اب تک چھپ جانی چاہیے تھی ۔ لیکن صفحات کم ہونے اور دیگر مجبوریوں کی بنا پر آپ کو انتظار کرنا پڑا ۔ انشاءاللہ جلد ہی شائع کر دی جائے گی ۔

شازیہ فرحین ، ناظم آباد ، کراچی ،۔ ایک دفعہ پھر ڈھیٹ بَن کر خط لکھ رہے ہیں ۔ آنکھ مچولی کو پڑھتے ہوئے ایک سال مکمل ہُوا ۔ اس کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہ سب سے پہلے مارکیٹ میں آجاتا ہے ۔ دسمبر کی کہانیاں اور نظمیں نہ چٹخارے دار تھیں نہ متاثر کُن ۔ اور ہاں اپنی کہانی " ہم بنے شاعر " کے بارے میں ہم کچھ نہیں پوچھیں گے ۔

○ آپ نے ڈھیٹ بَن کر خط لکھا لیکن ہم انتہائی عاجزی و انکساری سے جواب دے رہے ہیں ۔ چونکہ آپ ناراض ہیں شاید اس لیے کہانیاں اور نظمیں اچھی نہیں لگیں "ہم بنے شاعر" تو چھپ ہی جائے گی ۔ کوئی اور تحریر بھی تو بھیجیے ۔

عامر رحیم ، راولپنڈی ،۔ میں آپ کو شاندار چیز بھیجوں گا ، ایک سو سالہ کیلنڈر جو ۱۹۰۰ء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک کے لیے کار آمد ہو گا ، ہاں ایک اور بات کیا آنکھ مچولی کے صفحات بڑھ نہیں سکتے ؟

○ آپ کے کیلنڈر کا شدت سے انتظار ہے ۔ آنکھ مچولی کے صفحات میں مستقل اضافے پر ہم غور کر رہے ہیں. لیکن صفحات بڑھے تو قیمت بھی بڑھ جائے گی ، اس سے آپ لوگ خفا تو نہیں ہوں گے !

محمد عقیل یُونس ، ناظم آباد ، کراچی ۔ میں تحریریں بھیجتا ہوں. مقابلوں میں شرکت کرتا ہوں. لیکن نہ تو میری تحریریں شائع ہوتی ہیں اور نہ مقابلوں میں میرا نام ہوتا ہے . آپ کو ہم چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے ۔ لیکن یہاں تو حوصلہ شکنی کی جاتی ہے ۔

○ غضب خُدا کا ایسا بالکل نہیں ہے ۔ بھئی تحریریں اگر نہ چھپیں تو آپ کو لکھنے پر اور محنت کرنی چاہیئے ۔ اس لیے ہم نے کہانی ، اور مضمون لکھنے کے طریقوں پر مضامین بھی چھاپے ہیں ، رہے مقابلے تو اگر جوابات دُرست نہ ہوں تو نام کیسے آسکتا ہے . آپ خود سوچیئے ۔ انصاف سے سوچیے ۔

وسیم عباس ، سیالکوٹ ، کینٹ ،۔ نومبر کا آنکھ مچولی گرج چمک کے ساتھ کراچی سے ٹپکا اور سیالکوٹ میں اٹکا ، قارئین کی رائے کے مطابق شمارے میں مزاح سرے سے نہیں تھا ۔ اور ضرب الامثال کا تناسب لفظ ، محاورات سے افسوسناک حد تک گر گیا ، ایک سروے کے مطابق ، رسالے میں نئی سلسلے وار کہانی صرف ایک تھی ۔ جبکہ معلومات کی تو لادھا

بارشش آخر تک رہی۔ جاسوسیت کا دباؤ رسالے میں کہیں نہ تھا۔ آئندہ چوبیس گھنٹے میں آنکھ مچولی کے دفتر میں زبردست خطوط آنے کی توقع ہے۔

○ آپ کا تبصرہ بلا تبصرہ شائع کیا جا رہا ہے۔

لیلیٰ خالد۔ پشاور:۔ اس سے پہلے بھی آپ کو کئی خط لکھ چکی ہوں، مگر آپ نے جواب نہیں دیا۔ آخر کیوں؟

○ پیاری بہن! ہم صرف ان ہی خطوط کا جواب دیتے ہیں۔ جن میں رسالے پر تبصرہ کیا گیا ہو۔ کوئی بات ...ہی گئی ہو۔ کوئی تجویز دی گئی ہو۔ جس خط میں کوئی بات ہی نہ ہو، آپ ہی سوچئے اُس کا کیا جواب دیا جائے۔ اگر آپ ایسے خط لکھیں گی تو ضرور جواب دیا جائے گا۔ ٹھیک ہے نا!

کاشف رضا اور عظمیٰ۔ نوشہرہ:۔ ہم لوگوں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ گھر بیٹھے رسالہ خرید سکیں سوالنامے میں آپ نے سب سے بڑا مسئلہ پوچھا ہے تو یہ پوری دنیا کا یا صرف دو ایک ملکوں کا۔

○ بھئی آپ رسالے کے سالانہ خریدار بن جائیں۔ رسالہ گھر بیٹھے مل جایا کرے گا۔ سوالنامے میں پوری دنیا کا سب سے اہم مسئلہ پوچھا گیا ہے۔

غلام حسین میمن۔ حیدرآباد۔ ؎ بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

نہ جانے جنوری ۸۹ء سے کون سا روپ اختیار کرے گا۔ دسمبر کے مہینے میں ہم قائداعظمؒ اور نیوٹن پر مضمون پڑھنے کے خواہاں تھے۔ لیکن سخت کوفت ہوئی۔

○ آنکھ مچولی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کیجیے شور صحیح تھا یا غلط۔ قائداعظمؒ پر مضامین شائع کیے جاتے رہے ہیں۔ دسمبر میں بھی ایک تحریر شامل ہے۔ نیوٹن پر مضمون کسی اور شمارے میں پڑھ لیجیے گا۔

شیر بہادر دُرّانی۔ میانوالی کالونی، کراچی:۔ مجھ سے آپ کو کیا دشمنی ہے۔ جو آپ میری تحریر کردہ کہانیاں شائع نہیں کرتے۔ اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو سکتا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔

○ آپ کی کہانیاں ہم نے پڑھیں، ہمیں ان کو شائع کر کے خوشی ہوتی لیکن افسوس کہ یہ ناقابلِ اشاعت ہیں۔ آپ ابھی اور محنت کیجیے۔ اچھی کہانی تو ہماری ضرورت ہے۔

شکیل بدر۔ جمشید روڈ کراچی۔ آپ صرف اُن لوگوں کا خط شائع کرتے ہیں جو آپ سے شکایت کرتے ہیں۔ اب ہم بھی آپ سے شکایت کر رہے ہیں۔ کہ آپ جمشید روڈ والوں کا خط کیوں شائع نہیں کرتے؟

○ لیجیے شائع تو کر رہے ہیں۔ ہاں بس اتنی سی بات ہے کہ اس خط کا جواب جلدی دیا جاتا ہے جس میں کوئی جواب طلب بات ہو۔

عامر منیر:۔ شہر کا نام نہیں لکھا:۔ میں آپ کے رسالے کے لیے کہانیاں لکھنی چاہتا ہوں۔ مہربانی فرما کر مجھے اجازت نامہ بھیج دیجیے۔

○ بھئی! آنکھ مچولی کیا کسی بھی رسالے میں کہانی بھیجنے کے لیے اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ شوق سے کہانی بھیجیے۔ اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

علی رضا عمرانی، ٹھٹھہ۔ کیا آپ لوگوں کا ہم سے جھگڑا ہے کہ نہ آپ نے جواب دیا اور نہ تصویر شائع کی۔

○ آپ سے ہمیں محبت ہے۔ اور محبت میں جھگڑا کیسے ہو سکتا ہے۔ تصویر اگر پہنچی ہے تو ضرور چھپے گی۔

ایس اے علی، ٹانڈہ لیانوالہ۔ ماہِ نومبر میں آپ نے تین کہانیاں ایسی شائع کی ہیں۔ جو چوری کی ہیں "آخری کلاس" "عظیم الشان مملکت" "عقلمند خلیفہ" یہ تینوں کہانیاں دوسرے رسالوں میں چھپ چکی ہیں۔ دوسروں کی کہانیاں رسالے میں بھیجنا، مہذب انسانوں کو زیب نہیں دیتا۔

○ آپ کی نشاندہی کا شکریہ۔ اب ہماری وضاحت سُن لیجیے۔ "آخری کلاس" اور "عقلمند خلیفہ" انگریزی کی کہانیاں ہیں جسے لکھنے والوں نے ترجمہ کیا ہے۔ ایک غیر ملکی کہانی کا بعض اوقات کئی لکھنے والے اپنے اپنے طریقے سے۔۔۔ ترجمہ کرتے ہیں اور اس میں کوئی بُری بات نہیں۔ "عظیم الشان مملکت" قرآنی کہانی ہے۔ لہٰذا یہ کہانی جہاں بھی نقل کی جائے چوری نہیں کہلائے گی۔ ویسے ہم آپ کی محنت کی داد دیتے ہیں۔

شکیل احمد خان، شہر کا نام نہیں لکھا۔ مجھے اخلاق احمد کا "حق اسکواڈ" بہت پسند ہے۔ اخبارات سے معلوم ہُوا ہے کہ وہ بہت بیمار ہیں۔ اللہ انہیں جلد از جلد اس موذی بیماری سے نجات دلائے۔

○ شکیل بھیّا! "حق اسکواڈ" کی پسندیدگی کا شکریہ! ویسے "حق اسکواڈ" کے اخلاق احمد اللہ کے فضل و کرم سے بالکل صحت یاب اور خوش و خرم ہیں۔ جن اخلاق احمد صاحب کے متعلق آپ نے پڑھا وہ کوئی اور صاحب ہیں اللہ انہیں صحت عطا فرمائے۔ آمین۔

گل خرّم گل، شہر کا نام نہیں لکھا۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ ہم کتنے ارمانوں کے ساتھ آپ کو خط لکھتے ہیں۔ مگر آپ جواب نہیں دیتے، تو ہمارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ مجھے یہ بھی بتا دیں کہ میرے لطیفے شائع کریں گے یا نہیں۔

○ سچ پوچھیے تو ہمیں خود کبھی کبھی بہت افسوس ہوتا ہے کہ سینکڑوں خطوط ہمیں ملتے ہیں اور ہم اُس میں صرف چند ہی کے جواب دے پاتے ہیں۔ لیکن آپ ہی بتائیے کہ اس کا کیا علاج ہے؟ اگر ہم سارا وقت خطوط کے جواب ہی دیتے رہیں پھر رسالہ کون نکالے گا۔ اور رسالہ وقت پر نہیں آیا تو کیسے شکایت ہوگی؟

وطنِ عزیز

ہمارا وطن گلشنِ حُسن ہے، لیکن یہ گلشن صرف اُس صورت قائم رہ سکتا ہے جب خود اس گلشن کے پھول اس کو مکمل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے مفاد کی خاطر ذاتی مفادات کو نظر انداز کر دیں۔ اور اس کو مکمل دیکھنے کی خواہش میں اپنی زندگی کے خوشگوار لمحات کو خیر باد کہہ دیں تاکہ آنے والی نسلیں اس کے حُسن کا نظارہ کر سکیں۔

(محمد اکرم سیالوی، وکیل والا)

جن اور بھوت کی حقیقت

قرآن کی روشنی میں

پروفیسر حافظ احسان الحق

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو جنوں اور بھوتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ڈرے ہوئے اور توہم پرست لوگوں نے جنوں اور بھوتوں کے وجود کو فرض کر لیا ہے اور جھوٹ موٹ ایسے واقعات مشہور کرتے رہتے ہیں۔ جنہیں سُن کر لوگ خوفزدہ ہوں۔ اس مختصر سے مضمون میں ہم آپ کو یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ قرآنِ حکیم اس بارے میں کیا کہتا ہے... قرآنِ حکیم کتاب ہدایت ہے اور ہمیں ہر معاملے میں سب سے پہلے اسی سے رجوع کرنا چاہیے۔

سورۂ رحمان میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "انسان کو اُس نے ٹھیکری جیسے سوکھے گارے سے بنایا اور جن کو آگ کی لپٹ سے" اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ انسانوں کی طرح جن بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ دوسری اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ انسان خاکی مخلوق ہے اور جنات آتشیں وجود رکھتے ہیں۔ جن عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا مفہوم ہے پوشیدہ ہونا یا غائب ہونا۔ اس لفظ کے مادّے سے جتنے الفاظ بھی بنتے ہیں مثلاً جن، جنین، جنون، جنّت وغیرہ میں قدرے مشترک یہ ہی ہے۔ کہ یہ سب چیزیں عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتیں۔ چونکہ جنوں کے جسم خالص آتشیں اجزا سے مرکب ہیں۔ اس لیے وہ انسانوں کو عام طور پر نظر نہیں آتے۔ سورۂ اعراف کی یہ آیت اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ "کہ شیطان اور اس کا قبیلہ تم کو ایسی جگہ سے دیکھ رہا ہے۔ جہاں تم اس کو نہیں دیکھ سکتے"۔ یہاں پر یہ بھی یاد رہے کہ جنوں کی پیدائش انسانوں سے پہلے ہوئی۔ سورۂ کہف میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو پیدا کیا تو "فرشتوں سے کہا کہ وہ سجدہ کریں تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ کیونکہ وہ جنوں میں سے تھا۔ اور اُس نے اپنے رب کی نافرمانی کی"۔ معلوم یہ ہوا کہ سجدہ کا یہ حُکم تمام مخلوقات کے لیے تھا۔ تاکہ انسان کی برتری و عظمت کا اعتراف کیا جائے۔ اور اُسے اشرف المخلوقات مانا جائے۔ چونکہ فرشتے حکم الٰہی سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا وہ حُکم بجا لائے۔ جبکہ شیطان جنوں میں سے تھا۔ اختیار کی آزادی رکھتا تھا۔ لہٰذا غرور و تکبر کی وجہ سے اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور خدا کے غضب کا نشانہ بنا۔ انسانوں کے مقابلے میں جنات کی طاقت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

سورۂ سبا میں ہے۔ کہ مُلکِ سلیمان میں جنات حضرت سلیمانؑ کے تابع فرمان تھے۔ جو آپ کے حکم سے بڑے بڑے کام انجام دیتے تھے۔ ارشاد ہے کہ "وہ ان کے لئے قصر مجسّمے اور حوض جیسے بڑے بڑے لگن اور بھاری جمی ہوئی دیگیں بناتے تھے۔ سورۂ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے جب ملکۂ سبا کا تخت طلب کیا۔ جو اُن کی سلطنت سے ہزاروں میل دُور تھا۔ تو ایک عفریت (دیو ہیکل) جنّ بولا۔ کہ میں وہ تخت آپ کے بیٹھ کر اُٹھنے جتنے وقت میں حاضر کر دوں گا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جنّات کتنی غیر معمولی طاقت رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جنّات غیب کا علم رکھتے ہیں۔ مستقبل کی بات جان سکتے ہیں۔ جبکہ یہ بات بالکل بے اصل اور غلط بات ہے۔ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے کوئی مخلوق بھی غیب کی بات کو اپنی صلاحیت اور طاقت سے نہیں جان سکتی۔ سورۂ سبا میں ہی ہے کہ حضرت سلیمان لاٹھی کے سہارے کھڑے جنّوں سے کام لینے میں مصروف تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ جنّوں کو ان کی موت کا پتہ بھی نہ چلا اور وہ مصروف رہے۔ یہاں تک کہ ان کی لاٹھی کو جب کیڑے نے کھایا اور وہ گر پڑے تو جنّوں کو معلوم ہُوا کہ سلیمان علیہ السّلام انتقال کر چکے ہیں۔ البتہ جنّات عالمِ بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں۔ مگر ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اگر وہ اس حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو شہابِ ثاقب مار کر اُنھیں بھگا دیا جاتا ہے۔ یہ مضمون سورۂ حجر میں بیان ہُوا ہے۔

جنّ انسانوں کی طرح بااختیار مخلوق ہے۔ جس طرح اللہ نے انسانوں کو عبادت کا حکم دیا ہے۔ جنّوں کی پیدائش کا مقصد بھی عبادت ہی قرار دیا گیا ہے وماخلقت الجن والانس الالیعبدون ہ لہٰذا جنّوں میں بھی مومن، کافر، فاسق اور گنہ گار ہوتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی جنّات کی دو مرتبہ ملاقات ثابت ہے۔ ایک ملاقات کا ذکر سورہ احقاف میں ہے اور دوسری ملاقات کا ذکر سورۂ جنّ میں ہے۔ طائف کا مشہور واقعہ ہم سب کے علم میں ہے کہ اہلِ مکّہ کے ایمان نہ لانے اور مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیتیں دینے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف والوں کو اسلام کی دعوت پہنچانے کا ارادہ فرمایا۔ طائف والوں نے بھی آپ پر پتھر برسائے۔ یہ واقعہ ہجرت سے تین سال پہلے ۱۰ھ نبوی میں پیش آیا۔ اس سفر سے واپسی پر آپ نخلہ ایک جگہ پر جا کر ٹھہرے اس مقام پر رات کو آپؐ قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنّوں کے ایک گروہ کا اُدھر سے گزر ہُوا اُنہوں نے قرآن سُنا، ایمان لائے اور واپس اپنی قوم میں جا کر تبلیغِ اسلام شروع کر دی۔ اس واقعہ کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے۔

"اور وہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے، جب ہم جنّوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سُنیں۔ جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا۔ خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ

پڑھا جا چکا تو وہ خبر دار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے - انہوں نے جا کر کہا اے ہماری قوم کے لوگو، ہم نے ایک کتاب سُنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے - تصدیق کرنے والی ہے، اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی رہنمائی کرتی ہے. حق اور راہ راست کی طرف - اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو - اور تمہیں عذابِ الیم سے بچائے گا۔" (سورۂ احقاف، آیت نمبر ۲۹، ۳۰، ۳۱)

جنوں سے ہٹ کر بھوت، پریت کے الگ سے وجود کا علم ہم نہیں رکھتے - اتنی بات ضرور ہے کہ جنات لطیف جسم ہونے کی بنا پر اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں ڈھال لیتے ہیں - وہ انسان، حیوان، چرند پرند کا رُوپ بھی اختیار کر سکتے ہیں - تو عین ممکن ہے کہ عام لوگ جن چیزوں کو بھوت، پریت کے نام سے جانتے ہوں وہ جنات کی ہی بدلی ہوئی شکلیں ہوں - واللہ اعلم -

تکلیف دہ لمحہ، کیمرے کی زد میں

ویتنام کے شہر سائیگون کا پولیس ہیڈ جو معمولی بات پر لوگوں پر گولی چلانے کے حوالے سے مشہور تھا - مظاہرہ کرنے والے ایک شخص پر پستول تانے کھڑا ہے - ممکن ہے تصویر لیے جانے کے لمحہ بھر بعد یہ جیتا جاگتا شخص مُردے میں تبدیل ہو گیا ہو -

نام بھی انعام بھی

مقابلۂ تحریر میں شرکت کیجیے
۵۰۰۰ روپے کے نقد انعامات جیتیے۔

آنکھ مچولی اپنے لکھنے والے ساتھیوں کی تخلیقی سرگرمیوں کی نشوونما اور اُن کے درمیان صحت مند مقابلے کی پروان چڑھانے کی غرض سے ایک منفرد مقابلۂ تحریر منعقد کر رہا ہے۔

اپنے ذہن کو بیدار اور قلم کو تیار کر لیجیے

مقابلے میں شامل ۵ موضوعات

مقابلہ نمبر ۱۔ **کہانیاں** ـــــ عام تاثراتی / مہماتی / شکاریات / سائنس فکشن
مقابلہ نمبر ۲۔ **سفرنامے** ـــــ دلچسپ اور معلوماتی، مُلکی یا غیر مُلکی سفرنامے
مقابلہ نمبر ۳۔ **سچی آپ بیتیاں** ـــــ ناقابل فراموش سچے اور انوکھے واقعات
مقابلہ نمبر ۴۔ **طنز و مزاح** ـــــ کہانی / مضمون
مقابلہ نمبر ۵۔ **مضامین** ـــــ عام نوعیت کے معلوماتی مضامین / سائنسی موضوعات پر مبنی مضامین
جدید ترین ایجادات و اختراعات پر مبنی مضامین ـــــ

آپ ان پانچ موضوعات میں سے اپنے دو پسندیدہ موضوعات پر تحریر لکھ کر ہمیں روانہ کر سکتے ہیں، ہر موضوع پر پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والی کہانیوں اور مضامین کو بالترتیب پانچ سو روپے، تین سو اور دو سو روپے کے نقد انعامات دیئے جائیں گے، گویا ہر مقابلے کے لیے ایک ہزار روپے کے انعامات

مقابلے کی شرائط

○ آپ کی نگارشات ہمیں ۳۱ جنوری ۸۹ء تک مل جانی چاہئیں۔
○ مقابلے میں صرف وہی تحریریں شامل ہوسکیں گی جو ہمارے معیار کے مطابق ہوں گی۔
○ اگر کسی موضوع پر ہمیں معیاری تحریریں موصول نہ ہوئیں تو موضوع مقابلے سے خارج ہو جائے گا۔
○ اپنی تحریر کی نقل اپنے پاس محفوظ کر لیں اور واپسی کا تقاضہ نہ کریں۔
○ کچھ پوچھنا مقصود ہو تو جوابی لفافہ بھجوائیے۔
○ لفافے پر آنکھ مچولی کا پتہ لکھنے سے پہلے "مقابلۂ تحریر" ضرور لکھیے۔
○ مقابلے میں شرکت کے لیے عُمر کی کوئی قید نہیں ـــــ منصفین کا فیصلہ حتمی ہوگا

قلم اُٹھائیے ـــــ خوش قسمتی آپ کی جانب بھی مُسکرا کر دیکھ رہی ہے

آپ ہمارے سر آنکھوں پر

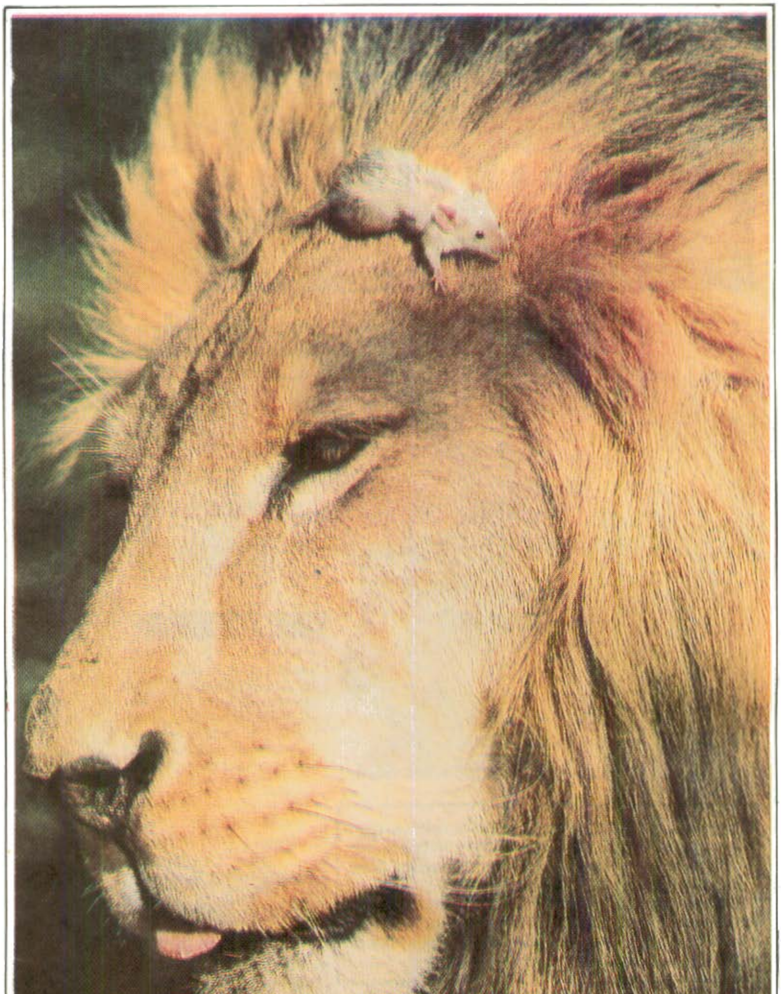

اس محاورے کی عملی تصویر آج دیکھ لیجیے۔ شیر نے چوہے کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھالیا ہے مگر شاید چوہے کو شیر کی
اس فراخ دلی کا یقین نہیں آرہا۔ غالباً اسی لیے چوہے میاں صاحب خوفزدہ نظر آرہے ہیں۔ جو ابھی ... اور کیا کرے آخر چوہا جو ٹھہرا۔

OUR CHALLENGE

INCOMPARABLE DRY-CLEANING

We dry-clean on the most innovative system, BOWE COMET P200, World's No. 1 Plant with the best chemicals imported from France to give your clothes the finish you've never seen before. Backed by unbeatable 40 years' experience.

SEE ALSO THE PRICE DIFFERENCE:

	Snowhite	The Cleaners	5-Star Hotels
Lady Shalwar Suit	18/-	30/-	34-50/-
Sari	15/-	25/-	30-40/-
Gent Suit	31/-	40/-	42-60/-
Trousers	11/-	15/-	17-25/-
Shirt	6/-	10/-	14-25/-
Shalwar Suit	11/-	20/-	28-50/-

Member iFi International Fabricare Institute

Member ASCR Association of Specialists in Cleaning and Restoration U.S.A.

Your Economy Through our Technology.

Visit our Clifton Branch.
(Behind Maxim's Restaurant)

Snowhite
DRY CLEANING INDUSTRIES
Karachi 511711 Rawalpindi 67988
The country's largest network of cleaning services

Flowline

ایک رات قبرستان میں

عبدالسلام سلامی

بچپن کی پراسرار حماقتوں کا دلچسپ احوال

بات کچھ بھی نہیں تھی۔

بس پرُاسرار کہانیاں اور جاسوسی ناول پڑھ پڑھ کر دماغ خراب ہوگیا تھا۔ اور بھئی آپ توجانتے ہی ہیں کہ جب دماغ خراب ہوجائے تو آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے۔

چنانچہ ہم نے بھی بہت کچھ کیا۔

سب سے پہلے تو اپنے جیسے پانچ، چھ پاگل تلاش کیے جن کے دماغ بھی پرُاسرار کہانیاں اور جاسوسی ناولیں پڑھ کر خراب ہوچکے تھے، لیکن تلاش کا یہ کام پرُاسرار طور پر کیا گیا۔ ان پاگلوں کو قطعی پتا نہیں چلنے دیا۔ کہ اُنھیں تلاش کرلیا گیا ہے۔ پھر ان پانچ چھ پاگلوں میں جو سب سے زیادہ پاگل نظر آیا اُسے ایک دن ایک

خط لکھا۔ خط کچھ اس طرح تھا۔

مائی ڈیئر وائی۔ ایچ

اس وقت شہر کی جو صورتحال ہے اس سے آپ بخوبی واقف ہیں چند معاملات پر گفتگو اور مشورے کے لیے آپ اتوار کو شام ۶ بجے نور پور اسکول کے پیچھے کیفے ڈی پھونس جی دروازے کے ساتھ والی پہلی میز پر آکر ملیے۔

اگر میز پر بیٹھنے والا شخص سیاہ قمیض پہنے ہو اور اپنے قلم سے کھیل رہا ہو تو اس سے شناخت کے الفاظ دہرائیے۔ شناخت کا لفظ ہے "نور" جس کا جواب ہے "پور"۔ خیر اندیش

اتوار کے دن ہم کالی قمیض پہن کر پونے چھ بجے کیفے ڈی پھونس میں جاکر بیٹھ گئے۔ ٹھیک چھ بج کر ۵ منٹ پر وائی ایچ، ہوٹل کے دروازے پر نظر آئے۔ ان کے اوسان خطا تھے اور چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ مقرّرہ میز پر ہمیں بیٹھا دیکھ کر انہیں کچھ اطمینان ہُوا۔ کُرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولے

"یہ کیا حرکت ہے ...؟"

ہم خاموشی سے اُنہیں گھورتے رہے پھر انتظار کرتے رہے کہ وہ شناختی لفظ بولیں، کُرسی پر بیٹھنے کے بعد اُنھوں نے ایلومینیم کے میلے جگ سے پانی نکال کر پیا۔

"میں ایک میل پیدل چل کر آرہا ہوں... تم گھر پر نہیں مل سکتے تھے..." وائی ایچ نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

بالآخر ہمیں بولنا پڑا "براہِ کرم شناختی لفظ بتائیے..."

"ایں... ؟" "تم مجھے نہیں جانتے... یہ کیا راز ہے ؟"

"براہِ کرم شناختی لفظ دہرایے تاکہ آگے بات کی جائے" ہم نے دوبارہ کہا۔

کچھ دیر اسی بات پر بحث ہوتی رہی۔ تنگ آکر وائی، ایچ نے کہا "نور" ہم نے جواب دیا "پور" اور اُٹھ کر اُن سے ہاتھ ملایا۔ ہمیں یقین ہوگیا کہ ہم صحیح آدمی سے مل رہے ہیں۔

اس کے بعد ہم نے آواز لگا کر بیرے سے چائے منگائی اور جب بیرا چائے رکھ کر چلا گیا۔ تو اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

اس پُراسرار گفتگو کے نتیجے میں ہم دونوں نے مل کر ایک خُفیہ تنظیم "اجنبی فرشتے" بنائی۔ چونکہ یہ خیال ہمارا تھا اس لیے تنظیم کی سربراہی کا بوجھ ہمیں اپنے کاندھوں پر اُٹھانا پڑا۔ وائی ایچ کے علاوہ چار اور پاگل اسی طرح جمع کیے اور یہ طے ہُوا کہ اغراض و مقاصد اور لائحہ عمل طے کرنے سے پہلے جاسوس اور خفیہ ایجنٹوں جیسی تربیت مکمل

کی جائے ۔ تیز دوڑنے، جوڈو کراٹے سیکھنے، چلتی گاڑی سے اُترنے یا اس میں سوار ہونے، خوفناک اور ویران جگہوں پر بیٹھ کر دشمن کا انتظار کرتے، کئی کئی میل پیدل چلنے، بھرے بازاروں میں مشتبہ شخص کا تعاقب کرنے کی مشق کی جائے، پٹاخہ پستول سے دشمن کو ہینڈز اپ کرنے اور اگر وہ ہمیں ہینڈز اَپ کرلے تو اس پر قابو پانے کے طریقے سیکھے جائیں۔ اکیلے ہونے کے باوجود کئی کئی دشمنوں کے چھکے چھڑانے کا ہُنر معلوم ہو جائے۔

اس تربیتی مرحلے میں پہلے تو یہ چھ پاگل شہر کے بازاروں میں کئی کئی میل پیدل چل کر مشتبہ افراد کا تعاقب کرتے رہے اکثر ایسا ہوتا کہ مشتبہ شخص بازار میں شاپنگ کرنے کے بعد اپنی گاڑی میں بیٹھ کر پھُر ہو جاتا۔ چلتی بس اور ٹرین سے اُترنے کی کوشش میں کئی بار چوٹیں آئیں، ایک رات کو اجنبی فرشتہ نمبر ۳ کے ساتھ اس کے گھر کی دیوار سے کودنے میں ٹخنہ اُتر گیا۔ کئی دن لنگڑا کے چلنا پڑا۔ اسکول میں زبردستی جھگڑے کیے تاکہ ایک ساتھ کئی "دشمنوں" کے چھکے چھڑانے کی مشق ہو جائے اس کے نتیجے میں بہت مار کھائی اور ایک بار چشمہ ٹوٹ جانے کے سبب گھر پر بھی کان کھینچے گئے۔ اس "تربیتی پروگرام" کے ایک مرحلہ میں ہم نے پُراسرار طریقے پر ایک رات قبرستان میں بھی گزاری تاکہ "خوفناک اور ویران جگہوں پر دشمن کا انتظار کرنے کی مشق" مکمل ہو جائے۔

ایک دن "اجنبی فرشتوں" کے خفیہ اجلاس میں جو ہمارے گھر کی کھلی چھت پر جولائی کی دوپہر کی سخت دھوپ میں اس لیے منعقد کیا گیا کہ "ہر موسم برداشت کرنے کی مشق ہو جائے" یہ فیصلہ کیا گیا کہ باری باری ہر شخص ایک رات قبرستان میں گزارے گا۔ چار فرشتوں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اُن کا کہنا تھا کہ اس قسم کی حرکت کسی بڑی مصیبت میں مبتلا کر سکتی ہے۔ بالآخر انہیں دھمکی دے کر چُپ کرانا پڑا۔ "یہ باس کا حکم ہے۔ جو حکم نہیں مانے گا اُسے سخت سزا مل سکتی ہے۔" طے یہ ہُوا کہ ابتداً اجنبی فرشتہ نمبر ۶ سے ہوگی۔ اسے بتایا گیا کہ تمام ہدایات اُسے علیحدہ پُراسرار طریقے سے مل جائیں گی۔ گرمی کی وجہ سے سب کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ اس لیے یہ خفیہ اجلاس ۱۵ منٹ کے اندر اندر ختم کر دیا گیا۔

فرشتہ نمبر ۶، ہماری خفیہ تنظیم کا سب سے کم عمر لیکن سب سے تیز رکن تھا۔ دوڑنے میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ بند تالوں کو منٹوں میں کھولنے کی خداداد صلاحیت پائی جاتی تھی۔ لڑنے بھڑنے اور مارکٹائی کا اسے پیدائشی شوق تھا۔ اور تنظیم کے ہر اُلٹے سیدھے کاموں میں وہ آگے رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

لیکن قبرستان میں تنہا رات گزارنے کا سُن کر اس کے ہوش بھی اُڑ گئے تھے۔
بُدھ کے دن اُسے ایک تفصیلی خط جس میں کہا گیا تھا کہ جمعرات کو رات ۱۱ بجے وہ قبرستان پہنچ جائے اور نوگزے پیر کے مزار کی مشرقی سمت، چالیسویں قبر کے پاس سے گورکن کی کوٹھری کے دروازے پر نظر رکھے جب گورکن کی کوٹھری میں روشنی بجھ جائے تو مزار کی مغربی سمت دسویں قبر کے ساتھ بیٹھ کر اُس وقت کا انتظار کرے جب تک اُسے قبرستان کے بڑے دروازے پر ٹارچ کی روشنی میں تین بار جلتی بجھتی نظر نہ آئے۔ ٹارچ کا اشارہ ملنے کے بعد "فرشتہ نمبر ۶، اپنے گھر جا سکتا ہے۔ اُسے یہ بھی بتایا گیا کہ اس کی مسلسل نگرانی ہوتی رہے گی اور اگر اُس نے ہدایات کے مطابق رات قبرستان میں نہ گزاری تو اُسے تنظیم سے خارج کر دیا جائے گا۔
جمعرات کی رات قبرستانوں میں عام طور پر خاصی دیر تک لوگوں کا آنا جانا رہتا ہے۔ لیکن عشار کی نماز کے بعد سناٹا چھا جاتا ہے۔ چونکہ ہمیں 'باس' کی حیثیت سے "فرشتہ نمبر ۶، کی نگرانی" کرنی تھی اس لیے جمعرات کو رات پونے دس بجے ہم قبرستان پہنچ گئے۔ دن میں یہاں کا دورہ کر کے ہم نے وہ جگہ منتخب کر لی تھی۔ جہاں رات کو قیام کیا جا سکے۔ دو بڑی موم بتیاں، کچھ اگر بتیاں اور چھوٹے قرآن مجید کا نسخہ ہمارے ساتھ تھا۔ تاکہ اگر کوئی اتنی رات کو قبرستان میں موجودگی کا سبب پوچھے تو اُسے بتا سکیں کہ وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔
ٹھیک دس بجے فرشتہ نمبر ۶، ہمیں نوگزے پیر کے مزار کے دروازے کی روشنی میں مزار کے سامنے نظر آیا۔ اس نے مزار کے ساتھ رکھے مٹکے سے پانی پیا۔ وہیں بیٹھ کر وضو کیا۔ اس کے بعد وہ مقررہ قبر کے نزدیک جا کر اس طرح بیٹھ گیا کہ ہمیں نظر نہ آ سکا۔
رات گیارہ بجے کے بعد قبرستان میں آمد و رفت ختم ہو گئی۔ نوگزے پیر کے مجاور بھی روشنی بجھا کر مزار کے دروازے پر تالا لگا کر چلے گئے۔ اب قبرستان میں دُور تک سناٹا تھا۔ آبادی سے ہلکی ہلکی آوازیں ہَوا کے ساتھ کبھی کبھی سُنائی دیتیں۔ چاند کی دسویں شب تھی اور بہت ہلکی چاندنی میں چاروں طرف قبروں کے سرہانے لگے پتھر عجیب سا منظر پیش کر رہے تھے۔ اگست کے ابتدائی دن تھے۔ ہلکی ہلکی ہَوا چل رہی تھی۔ جس سے جھاڑیاں اور درخت آہستہ آہستہ ہلتے تو ان کی سرسراہٹ اس ملگجی رات کی ویرانی اور سناٹے میں دل میں خوف پیدا کرتی۔
قبرستان کے حوالے سے بچپن میں پڑھی اور سُنی ہوئی تمام کہانیاں اور واقعات آہستہ آہستہ یاد آنے لگے۔ مُردوں کا راتوں کو قبروں سے نکلنا، جنوں اور بھوتوں اور چڑیلوں کا قبرستان میں رہنا، عجیب وغریب

اور دہشت ناک واقعات کا ویران راتوں میں ظاہر ہوتا ... یہ سب باتیں دل میں خوف کو بڑھاتی رہیں۔ ہم نے موم بتی جلائی اور آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا کہ روشنی سے بُری چیزیں دُور بھاگتی ہیں اور آیۃ الکرسی بدروحوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن موم بتی کی روشنی نے کچھ اور ہی تماشہ دکھایا۔ روشنی دیکھ کر ایک تو پورے قبرستان کے سارے مچھر اِدھر آ گئے اور انہوں نے ہاتھوں پاؤں اور چہرے کے بوسے لے لے کر ذرا سی دیر میں ہاتھ پاؤں اور منہ کو سجا دیا۔ دوسرے موم بتی کی روشنی سے آس پاس کی جھاڑیاں اور ان کے ہلتے ہوئے سائے اور بھیانک نظر آنے لگے۔ خوف نے اب پوری طرح ہمیں دبوچ لیا تھا۔ ہم نے فرشتہ نمبر ۶ کو آواز دی کہ ایک سے دو ہوں گے تو مل کر یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ لیکن آواز کے جواب میں ہمیں اپنی بائیں جانب آہٹ اور پھر کسی کے غرّانے کی آواز سُنائی دی۔

ڈر کے مارے خون خشک ہو گیا۔ حلق میں ایک دَم کانٹے سے اُبھر آئے اور شدید پیاس لگنے لگی۔ ہم نے بلند آواز سے آیۃ الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔ چور نظروں سے بائیں جانب دیکھا تو جھاڑیوں کی آڑ سے کوئی لمبی سی سفید چیز زمین پر گھسٹتی اپنی طرف آتی نظر آئی۔ اب ہم نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ایسا محسوس ہُوا جیسے زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ ہَوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور موم بتی بُجھ گئی ... اب ہر طرف اندھیرا تھا۔ وہ پُراسرار شے سرسراتی ہوئی ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ غرّانے کی آواز... ماحول کی دہشت میں اضافہ کر رہی تھی۔ اچانک پیچھے سے قمیض کا دامن کسی نے کھینچا۔ بے اختیار ہماری چیخ نکل گئی۔ اور اس کے بعد ہوش نہیں رہا۔

جب ہوش آیا تو ہم اپنے بستر پر تھے۔ فرشتہ نمبر ۶ ساڑھے دس بجے ہی قبرستان سے واپس گھر آ گیا تھا۔ اُس نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور گھر واپس آنے کے بعد کچھ دیر اس کشمکش میں رہا کہ ہمارے پاگل پن کی اطلاع ہمارے گھر والوں کو دے یا نہ دے۔ بالآخر اُس نے ہمارے گھر جا کر بتا دیا کہ ہم قبرستان میں ہیں اور بڑے بھائی اپنے ایک دوست اور فرشتہ نمبر ۶ کے ساتھ عین اُس وقت قبرستان پہنچے تھے، جب ہماری چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہ ہمیں بے ہوشی کی حالت میں گھر لائے تھے۔

گھر پر ہمارے ساتھ جو سلوک ہُوا وہ ہم آپ کو نہیں بتانا چاہتے خفیہ سرگرمیوں میں یہ سب کچھ تو ہوتا ہی ہے۔

شام کے بعد روز آتی ہوں
میری آنکھوں میں ڈوب کر سورج
دن کی رونق ہے آفتاب کا پھول
اپنا رنگِ حیات رکھتی ہوں
میرے دامن میں چاند تارے ہیں
میں ہوں باہر سے تیرگی کا گھر
مجھ سے سب فائدہ اُٹھاتے ہیں
کتنی آرام دہ ہے گود مری

صبح ہوتے ہی لَوٹ جاتی ہوں
روز لاتا ہے اِک سحر سورج
میری خوشبو ہے ماہتاب کا پھول
اپنی اک کائنات رکھتی ہوں
مجھ میں کتنے حسیں نظارے ہیں
میرا سینہ ہے روشنی کا نگر!
مجھ کو پا کر سکون پاتے ہیں
دُور کرتی ہوں میں تھکن سب کی

رات ہُوں، جان تو لیا ہوگا
مُجھ کو پہچان تو لیا ہوگا

دہشت کی دنیا کا ایک لافانی کردار

ڈریکولا

عقیل عباس جعفری

یہ ۱۸۹۷ء کی بات ہے۔
آئرلینڈ کے ایک ناول نگار نے ایک ناول تحریر کیا جو ایک ایسے کردار کے بارے میں تھا۔ جسے انسانوں کا خون پینے کی عادت تھی۔ اس ناول کو چھپے ۹۲ برس ہونے کو آئے مگر آج بھی یہ ناول دُنیا کے خوفناک ترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے اور اس کا نام آتے ہی بدن میں ایک جھرجھری سی آجاتی ہے۔ اس ناول نگار کا نام تھا برام اسٹوکر اور ناول کا نام تھا "ڈریکولا" جس کے لغوی معنی تھے "شیطان کا بیٹا"!

مشہور کردار ڈریکولا کے دو خوفناک روپ

ڈریکولا کی کہانی پندرہویں صدی عیسوی کے ایک شہزادے ولیڈ ٹیپس (VLAD TEPES) کی زندگی سے متاثر ہو کر تحریر کی گئی تھی۔ جو ویلیچیا کا شہزادہ تھا۔ ویلیچیا آج کل رومانیہ کا حصہ ہے۔ ولیڈ ٹیپس ۱۴۳۲ء کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ اس کی عمر تقریباً چار برس تھی جب اس کا باپ ولیڈ سینئر ویلیچیا کا بادشاہ بنا۔ اس کی بہادری اور جواں مردی سے متاثر ہو کر اُسے اژدہے (DRAGON) کا خطاب دیا گیا۔ چونکہ رومانوی زبان میں اژدہے (ڈریگون) کو ڈریکول بھی کہا جاتا تھا جس کے ایک معنی شیطان بھی ہوتے ہیں اس لیے ولیڈ سینئر کو ڈریکول اور اس کے بیٹے ولیڈ ٹیپس کو ڈریکولا کہا جانے لگا۔ جس کے معنیٰ تھے "شیطان کا بیٹا"۔

۱۴۴۴ء میں ولیڈ سینئر کی ترکوں سے ایک شدید جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں ولیڈ ٹیپس یرغمالی بنا لیا گیا۔ ۱۴۴۷ء میں ولیڈ سینئر تخت و تاج کے جھگڑوں میں مارا گیا۔ اگلے برس ولیڈ ٹیپس ترکوں کی قید سے فرار ہو کر اپنے وطن واپس پہنچا۔ جہاں اُسے اپنے باپ کے قاتلوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور ایک طویل جدوجہد کے بعد وہ مئی ۱۴۵۶ء میں ولیڈ پنجم کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔

ان دنوں ولیڈ پنجم کی سلطنت ترکوں کو خراج دیا کرتی تھی۔ ولیڈ پنجم نے تخت نشین ہوتے ہی یہ خراج دینا بند کر دیا۔ بلکہ اس کی سلطنت ترکوں کو فوجی مقاصد کے لیے جو جوان مہیا کرتی تھی اس کا سلسلہ بھی بند کر دیا۔ ترکوں نے اُس پر سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ نتیجہ جنگ کی صورت میں نکلا جس میں ولیڈ پنجم کو کامیابی حاصل ہوئی اور ترکوں کے ۲۰ ہزار کے قریب فوجی مارے گئے۔

مگر ان فوجیوں کو قتل کرنے کا طریقہ بڑا دہشتناک تھا۔ ولیڈ پنجم اپنے قیدیوں کو یکدم قتل نہیں کرتا تھا بلکہ اُن کے جسموں میں میخیں ٹھونک کر انہیں تڑپا تڑپا کر مارا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا خطاب "The Impaler" پڑ گیا تھا۔ جس کا مطلب ہوتا ہے "میخیں ٹھونک کر ہلاک کرنے والا"۔

ولیڈ پنجم اپنی سلطنت میں رہنے والے بدمعاشوں اور باغیوں کو بھی بڑی وحشیانہ سزائیں دیتا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ کسان اس کے محل پر مظاہرہ کرنے آئے۔ ولیڈ نے اُنہیں ایک کمرے میں بند کیا اور زندہ جلا دیا۔ ایک مرتبہ اُس نے اپنے باغیوں پر کیکڑے چھوڑ دیے۔ جنہوں نے اُنہیں ہلاک کر دیا۔ ایک اور موقع پر اُس نے کچھ افراد کو زندہ جلا کر اُن کی بیواؤں کو اُن کا جلا ہُوا جسم کھانے پر مجبور کیا۔ بعض مواقع پر اُس نے والدین کو اپنے بچّوں کا گوشت کھانے پر مجبور کیا۔ ولیڈ پنجم کے ظلم و بربریت کا خاتمہ اسی پر نہیں ہُوا بلکہ اُس نے کچھ عرصے بعد اپنے مخالفین کا خون پینا شروع کر دیا۔

بالآخر عوام کا صبر رنگ لایا اور ۱۴۶۲ء میں ولیڈ پنجم کو تخت سے اُتار دیا گیا۔ ولیڈ پنجم فقط چھ برس

حکمران رہا۔ مگر اس مختصر عرصے میں اس نے کوئی ۴۰ ہزار افراد موت کے گھاٹ اُتار دیے۔ اس کے بعد اُس کا بھائی جو تُرکوں کا حامی تھا، تخت نشین ہُوا۔ ولیڈ پنجم بھاگ کر بوڈاپسٹ چلا گیا جہاں اُس نے ہنگری کے بادشاہ میتھائس کاروینس کی بہن سے شادی کرلی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنا تخت و تاج واپس لینے کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ بالآخر ۳۱ جنوری ۱۴۷۶ء کو اُس کی یہ کوششیں کامیاب ہوئیں اور وہ دوبارہ بادشاہ بن گیا۔ مگر ایک سال بعد ہی اُسے قتل کر دیا گیا۔ اور اس کو بخارسٹ کے نزدیک دفن کر دیا گیا۔

ولیڈ پنجم نے اپنی زندگی ہی میں ڈریکولا کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ انیسویں صدی میں آئرلینڈ کے ناول نگار برام اسٹوکر نے ایک ایسے کردار پر ناول لکھنا چاہا جو انسانوں کا خون پیا کرتا تھا تو اُس نے تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی کی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا ناول تاریخ کی کسی حقیقی شخصیت کے گرد گھومتا ہو چنانچہ اُس نے ولیڈ پنجم کی شخصیت کو اپنے موضوع کے حوالے سے ایک مثالی کردار سمجھا اور کچھ حقیقت اور کچھ افسانہ ملا کر وہ ناول تخلیق کیا جو ۱۸۹۷ء میں ڈریکولا کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ اس ناول کے لیے برام اسٹوکر نے مقامات بھی وہی منتخب کیے تھے۔ جہاں ولیڈ پنجم کی سلطنت تھی۔ برام اسٹوکر اگرچہ خود کبھی اُن مقامات پر نہیں گیا تھا۔ مگر اُس نے برٹش میوزیم کی لائبریری میں اپنے موضوع اور اس کے جائے وقوع کے بارے میں خاصی تحقیقات کی تھیں۔

اس ناول کے چھپنے کے بعد رومانیہ کے لوگوں نے برام اسٹوکر پر کڑی تنقید کی ان کا کہنا تھا کہ بے شک ولیڈ پنجم ایک سفاک حکمران تھا مگر وہ انسانوں کا خون نہیں پیا کرتا تھا اور یہ صرف برام اسٹوکر کی افسانہ طرازی ہے اُن کا کہنا تھا کہ ولیڈ پنجم نے اپنی مملکت کو دشمنوں کے تسلّط سے نجات دلائی اور اس کے دور میں جرائم بالکل ختم ہو گئے۔ چنانچہ اُسے ایک قومی ہیرو کا درجہ دیا جائے۔ اسی تحریک کے باعث ۱۹۳۰ء میں ولیڈ پنجم کی قبر بھی کھولی گئی تو معلوم ہُوا کہ اس میں اس کی باقیات موجود نہیں ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یا تو ولیڈ پنجم کو اس قبر میں دفن ہی نہیں کیا گیا تھا یا پھر اُس کے دشمنوں نے اُس کی ہڈیاں بھی قبر میں سلامت نہیں چھوڑی تھیں۔

بیسویں صدی میں جب خوفناک موضوعات پر فلمیں بننے کا آغاز ہُوا تو فلم سازوں نے ڈریکولا کے موضوع پر بھی متعدد فلمیں بنائیں۔ ان میں سب سے پہلی فلم جس کا نام صرف ڈریکولا تھا ۱۹۵۸ء میں ریلیز ہوئی تھی اس فلم میں ڈریکولا کا مرکزی کردار مشہور اداکار کرسٹوفر لی نے ادا کیا تھا۔ کرسٹوفر لی نے اس کے بعد ڈریکولا اور دوسرے موضوعات پر بننے والی متعدد خوفناک (HORROR) فلموں میں مرکزی کردار ادا کیے اور فلم بینوں سے داد حاصل کی۔

A Great Deal-Swift
SUZUKI
SWIFT
1000cc
When we opted to design a new driving machine, it had to be Swift. A perfect blend of form & function. What makes this car so Swift is its wind-tunnel perfected, aerodynamic shape — allowing the air to flow along its contours, swiftly. And those interiors, styled with common sense, so ergonomical as to give you safe, relaxed and swift rides.
Also it is that 5-speed transmission which swiftly engages into a 1000cc power plant. Power that's responsible for those swift manoeuvres at peak time traffic — and of course for that swift highway cruising. And everything else that goes into making this machine a great deal Swift.
Spare Parts and After Sales Service, available throughout Pakistan.
For information please contact:
Accredited Suzuki Dealers, or
PAK SUZUKI MOTOR CO. LTD.
A PACO COMPANY
West Wharf Road, Karachi. Tel. 202726-29
OVER 2LAC SUZUKI VEHICLES ON ROADS.
P.I.D. ISLAMABAD
sasa

وہ کون تھا؟

اخلاق احمد

حق اسکواڈ کا ایک پُراسرار معرکہ ...

بہت دنوں سے کوئی ایڈونچر نہیں ہُوا تھا۔

حق اسکواڈ کے چاروں ارکان فارغ تھے۔ شہریار، سرفراز، ضیاء اور شہزاد۔ چاروں پڑھائی میں ہی مصروف تھے۔ اس کے سوا کوئی مصروفیت ہی نہیں تھی۔

ایک روز اپنے غار نما ہیڈ کوارٹر میں، جب وہ چاروں چائے سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے، سرفراز نے کہا "بھائیو۔ میں تو بیٹھے بیٹھے بور ہو گیا ہوں۔"

ضیاء نے کہا... "تو کھڑے ہو جاؤ..."

سرفراز نے غصّے سے ضیاء کو دیکھا اور کہا... "میرا مطلب تھا کہ بہت دنوں سے کچھ مار دھاڑ، کوئی اُٹھا پٹخ، کوئی دھڑا دھڑ نہیں ہوئی۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت دنوں سے نیند میں ہوں۔ ایسے تو میری صلاحیتوں کو زنگ لگ جائے گا۔"

"زنگ آلودہ آدمی۔" شہزاد بولا... "تم بولتے بہت ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے، حق اسکواڈ کو ہر وقت مار دھاڑ

میں ہی مصروف رہنا چاہیے ؟ ہماری تنظیم کوئی غنڈوں کی تنظیم ہے کہ ہر وقت مار پیٹ میں مصروف رہے "
شہریار نے کہا ..." سرفراز کا مطلب یہ نہیں تھا۔ وہ صرف یہ کہہ رہا تھا کہ بہت دنوں سے ہم سب بے کار بیٹھے ہوئے ہیں ۔ میں خود بھی یہی محسوس کر رہا ہوں ۔ آج دوپہر ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا تھا جیسے یہ بیکاری ختم ہونے والی ہے ۔ کوئی ایڈونچر شروع ہونے والا ہے ۔ لیکن پھر پتا چلا کہ میرا خیال غلط ہے "
"کیا مطلب ...؟" سرفراز نے چونک کر پوچھا۔
ضیاء اور شہزاد بھی حیرت سے شہریار کی طرف دیکھ رہے تھے ۔
"آج دوپہر میں یہاں آرہا تھا ۔ اپنے ہیڈکوارٹر" شہریار نے کہا " دُور دُور تک کوئی نہیں تھا ۔ دوپہر کا وقت ہو اور دھوپ ہو تو کوئی بھی نہیں ہوتا "
" یار ، ایک تو تم بات بتانے کے بجائے منظر بیان کرنے لگ جاتے ہو " سرفراز نے جھلا کر کہا " یہ سیدھی سی بات ہم سب کو پتا ہے کہ دھوپ ہو اور دوپہر ہو تو دُور دُور تک کوئی نہیں ہوتا ہے "
شہریار نے کہا " بھائی ۔ بات ہی بتا رہا ہوں ۔ تو ہُوا یوں کہ ہیڈکوارٹر کی طرف آتے ہوئے جب میں میدان سے گزرا تو مجھے یوں لگا جیسے ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے کوئی شخص کھڑا ہے ...! بس ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے وہاں کسی شخص کا سایہ نظر آیا ہو ۔ پھر میں نے مُڑ کر غور سے دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا "
" میں سمجھ گیا " سرفراز نے سر ہلا کر کہا " وہ یقیناً " کوئی بھوت ہوگا ۔ آج کل حالات بڑے خوفناک ہو رہے ہیں ۔ جن بھوت ، چڑیلیں ، راہ چلتے مل جاتی ہیں "
" میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ اس ٹوٹی دیوار کے پیچھے کوئی آدمی نہیں ہوگا " شہریار نے کہا " مجھے تقریباً یقین تھا کہ یہ میرا وہم ہے ۔ مگر پھر میں شبہ دُور کرنے کے لیے مُڑ کر اُسی طرف چلا گیا ۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کی طرف وہاں کوئی بھی نہیں تھا ۔ مگر نیچے زمین پر سگریٹ کا ٹکڑا پڑا تھا ...!! جس میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا "
ضیاء نے حیرت سے کہا ..." میرے خدایا ۔ یعنی وہاں کوئی نہ کوئی تھا ۔ جو سگریٹ پی کر اُسے بجھائے بغیر چلا گیا"
شہزاد نے پوچھا " مگر ... مگر کون تھا وہاں .... ؟"
شہریار مسکرایا " پتا نہیں کون تھا ۔ میں تو اب تک یہ بھی طے نہیں کر پایا ہوں کہ وہاں کوئی تھا کہ نہیں ۔ بار بار لگتا ہے جیسے یہ میرا وہم ہو ۔ مگر پھر سگریٹ کا وہ جلتا ٹکڑا یاد آجاتا ہے ۔ مجھے تو بس یوں لگا تھا جیسے کوئی آدمی اس دیوار کی آڑ میں سے چھُپ کر ہمارے ہیڈکوارٹر کی طرف دیکھ رہا ہے "
" لیجیے حضرات ..." سرفراز نے کہا " کہانی میں ایک اور سنسنی خیز موڑ آتا ہے ۔ پہلے کہا جا رہا تھا کہ وہ آدمی

دیوار کے پیچھے موجود تھا۔اب انکشاف ہوا ہے کہ وہ ہمارے ہیڈ کوارٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بتایا جائے گا کہ وہ آدمی اپنی توپ سے ہیڈ کوارٹر کا نشانہ لے رہا تھا۔یار شہر یار، تمہیں کیا ہوگیا ہے ؟ پہلے تمہیں ایک سایہ سا نظر آیا۔ پھر تم تلاش کرنے گئے تو تمہیں وہاں کچھ نہیں ملا۔سوائے سگریٹ کے ایک ٹکڑے کے۔اب تم خیال ظاہر کر رہے ہو کہ وہ آدمی .... بلکہ وہ سایہ ہیڈ کوارٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔سوچنے کی بات ہے۔اگر کسی کو ہیڈ کوارٹر دیکھنا ہی ہوگا تو دیوار کے پیچھے سے چھُپ کر کیوں دیکھے گا۔؟ سامنے سے دیکھتا ہُوا گزر جائے گا۔ پھر وہ تم سے ڈر کر کیوں چھُپے گا ...؟

"ناراض کیوں ہوتے ہو بھائی" شہر یار نے کہا "میں نے تو جو محسوس کیا تھا، وہ بتا دیا۔رہی یہ بات کہ کوئی آدمی چھُپ کر کیوں دیکھے گا یا ڈر کر کیوں چھُپے گا، تو بھائی ہو سکتا ہے وہ "حق اسکواڈ" کا کوئی دشمن ہو۔ہم نے غلط راہ پر چلنے والے بے شمار لوگوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ان میں سے کئی ایسے ہوں گے جو ہمیں نقصان پہنچانے کی دلی خواہش رکھتے ہوں گے"

ضیاء نے سر ہلا کر کہا "شہر یار کی بات تو ٹھیک ہے۔ہمارے دشمنوں کی تعداد کم تو نہیں ہے"

سرفراز ہنسا "کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔! ایک تو ہم کارناموں کے شہنشاہ اور اُوپر سے ہمارے دشمنوں کی بھاری تعداد"

شہزاد بولا "شہر یار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ہو سکتا ہے کوئی ہمارے ہیڈ کوارٹر کا جائزہ لے رہا ہو"

"اچھا بابا، اچھا" سرفراز نے کہا "وہ دشمن ملک کے ایجنٹ تھے اور ہمارے ہیڈ کوارٹر کی تصویریں اُتارنے آئے تھے۔کل وہ طیارے لے کر آئیں گے اور ہم پر بمباری کریں گے۔ٹھیک ہے ...؟"

"بالکل ٹھیک ہے" شہر یار نے کہا۔

مگر اگلے روز خود سرفراز بوکھلایا ہُوا اندر داخل ہُوا۔

ہیڈ کوارٹر میں شہر یار، ضیاء اور شہزاد پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔سرفراز نے اندر گھُستے ہی کہا "شہر یار۔ لگتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔ابھی ابھی مجھے بھی یُوں لگا ہے جیسے راستے میں اس ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے کوئی چھُپا ہوا ہے۔مجھے تو وہاں کسی کی ہلکی سی سرگوشی بھی سُنائی دی تھی"

ضیاء کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "سرگوشی ....!"

شہزاد نے پوچھا "تم نے .... تم نے جا کر دیکھا وہاں .....؟"

سرفراز نے تھوک نگل کر کہا "یار، ہمت ہی نہیں پڑی وہاں جانے کی۔ میں .... میں تو گھبرا گیا بُری طرح۔"
شہریار ہنسا ... "کل تو بڑی تقریر کر رہے تھے کہ آخر کوئی چھُپ کر کیوں دیکھے گا۔ آج غبارے میں سے ساری ہَوا نکل گئی ....؟"
"مگر یار ..." سرفراز نے کہا ... "ہے یہ سوچنے کی بات .... اگر وہاں کوئی ہے اور وہ ہماری نگرانی کر رہا ہے یا ہمارے ہیڈکوارٹر کا جائزہ لے رہا ہے تو کیوں ...؟ کیا پریشانی ہے اُسے ؟ اور ہمیں دیکھ کر وہ غائب کہاں ہو جاتا ہے ؟"
ضیاؔ بولا ... "بھائیو۔ مجھے تو اب کچھ ڈر سا لگنے لگا ہے۔ یہ غائب ہونے والا چکر کیا ہے ؟ یہ معاملہ تو اب پُراسرار اور خوفناک ہوتا جا رہا ہے۔"
شہریار نے کہا ... "کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لیے رات کے وقت یہاں آنا پڑے گا۔ چھُپ کر آئیں گے تو سارا معاملہ کھُل جائے گا ...."
"رات کے وقت ...." سرفراز نے لرز کر کہا ...؟ "کیسے آئیں گے یار رات کے وقت ....؟"
شہزاد بولا "ہاں بھائی شہریار۔ رات کو آنے میں کوئی خطرہ تو نہیں ہے ...؟"
شہریار مُسکرایا ... "سب کا آنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ میں خود ہی ایک چکر لگا لوں گا۔"
اس شام جب وہ اپنے اپنے گھر جانے کے لیے روانہ ہوئے تو چاروں خاموش تھے ان کے دلوں پر بوجھ سا تھا۔

شہریار اور ضیاء آگے آگے چل رہے تھے۔
سرفراز اور شہزاد ان سے چند قدم پیچھے تھے۔
جب وہ آدھا راستہ طے کر چکے تو سرفراز نے آہستہ سے کہا "بھائی شہزاد ہمیں بھی رات کو آنا ہوگا۔"
"کیا مطلب ؟" شہزاد نے چونک کر پوچھا۔
"شہریار کا تنہا یہاں رات کے وقت آنا مناسب نہیں ہے۔ ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے آئیں گے۔ نہ جانے کیوں مجھے خطرے کا احساس ہو رہا ہے .... کہیں .... کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"
شہزاد نے آہستہ سے کہا "کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ ہم شہریار کے تعاقب میں آئیں گے۔ اسے کوئی خطرہ لاحق ہوگا تو ہم اس کا ساتھ دینے کے لیے اچانک نکل آئیں گے۔"
"یہ ٹھیک ہے۔" سرفراز نے کہا "ضیاؔ کو بھی بتا دیں گے۔ شہریار کو نہ پتا چلے تو اچھا ہے۔ وہ یہی سمجھتا رہے کہ وہ اکیلا آیا ہے۔"

دونوں نے مُسکرا کر ہاتھ ملائے اور آگے چل پڑے۔

اس رات جب شہریار ہیڈ کوارٹر جانے کے لیے روانہ ہُوا تو اُسے اچانک احساس ہُوا کہ باہر سردی اور گھُپ اندھیرا ہے۔ آسمان پر بادل تھے جس کی وجہ سے چاند کی ہلکی سی روشنی بھی نہیں تھی۔

اس نے اپنی جیکٹ کی زِپ بند کی اور بغلوں میں ہاتھ دبا کر چل پڑا۔

گلیوں میں اتنی سردی نہیں تھی مگر میدان کے پاس پہنچتے ہی اُسے جھرجھری سی آئی۔ ٹھنڈی ہَوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ لرز کر رہ گیا۔

ہر جانب سناٹا تھا....!

سناٹا، اندھیرا اور ویرانی....!!

میدان سے گزرتے ہوئے شہریار نے اپنی رفتار آہستہ کر لی۔ اس نے کینوس کے جُوتے پہن رکھے تھے۔ جن سے قدموں کی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس کے حساس کان کوئی آہٹ، کوئی آواز سُننے کے لیے تیار تھے۔

اچانک کھڑکھڑاہٹ سی ہوئی۔!

شہریار اُچھل پڑا۔ ایک لمحے میں وہ کسی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

مگر اُسی وقت "میاؤں" کی آواز آئی۔ ایک بلّی درخت سے چھلانگ لگا کر نیچے اُتری تھی۔

شہریار مُسکرا دیا۔

وہ خاموشی سے آگے چلتا گیا۔

یہ ویرانی، یہ خاموشی، یہ تاریکی اسے ڈرا رہی تھی۔ مگر وہ پورے عزم کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

اب وہ ٹوٹی ہوئی دیوار ذرا سی دُور رہ گئی تھی جہاں ایک روز قبل اُس نے پہلی بار کسی کو دیکھا تھا۔ بلکہ اُس کا سایہ سا دیکھا تھا۔ اس دیوار سے کچھ آگے، ہیڈ کوارٹر تھا۔ حق اسکواڈ کا ہیڈ کوارٹر۔

شہریار کی چھٹی حِس اچانک خطرے کی خبر دینے لگی۔ وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ اندھیرے میں بہت کم سُجھائی دے رہا تھا۔

شہریار رُک گیا اور ایک قریبی جھاڑی کے پاس جا بیٹھا۔

سناٹے میں ایک آہٹ سی سُنائی دی تھی۔ یوں جیسے سوکھے ہوئے پتّوں پر کسی نے آہستہ سے قدم رکھا ہو

پہلی بار..... گھر سے روانہ ہونے کے بعد پہلی بار شہریار کے دِل میں خوف جاگا۔
پہلی بار اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔
کاش .... اس نے سوچا .... کاش اس وقت سرفراز، ضیا اور شہزاد بھی ساتھ ہوتے۔
اچانک .... وہ آہٹ پھر سُنائی دی .....
شہریار کو اب یقین ہو چکا تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی تھا۔ آس پاس .... کہیں قریب ہی .... وہ ساکت بیٹھا رہا۔ اس کا ذہن تیزی سے چل رہا تھا۔
وہ آہٹ اچانک بہت قریب سُنائی دی .... بالکل پیچھے سُنائی دی۔
شہریار نے پلٹ کر دیکھا
اور بے اختیار اُس کی چیخ نکل گئی۔
ایسا خوفناک چہرہ اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
جھُرّیوں بھرا سفید چہرہ ....!
بڑے بڑے دانت ....!
اور سُرخ آنکھیں ....!!
شہریار نے اس چہرے کو تاریکی میں اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔
وہ چیخنا چاہتا تھا۔ مدد کے لیے کسی کو بلانا چاہتا تھا۔
مگر اس پہلی چیخ کے بعد اُسے دوسری چیخ کی مہلت نہیں ملی۔
اس چہرے کے پیچھے سے ایک ہاتھ نمودار ہُوا اور مضبوطی سے شہریار کے منہ پر جم گیا۔
شہریار نے تڑپ کر خود کو چھُڑانا چاہا۔ اُس نے کراٹے کا ایک خاص وار کیا۔
مگر اُسی وقت کوئی سخت چیز اُس کے سر سے ٹکرائی۔
اُس کی نظروں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ پھر ہر جانب تاریکی چھا گئی اور شہریار بے ہوش ہو گیا۔

- پھر کیا ہُوا ....؟
- وہ خوفناک چہرہ کس کا تھا....؟
- حق اسکواڈ ایک نئے مرحلے میں قدم رکھ رہا ہے ....!

اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیے ....!!

جام جیلی مارملیڈ
اب نئے انٹرنیشنل پیک میں
AHMED PRESERVES
Produce of Pakistan
AHMED
RASPBERRY JAM
AHMED FOOD INDUSTRIES (PVT) LTD
APPLE JELLY
ORANGE MARMALADE
قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا

ھمّت کے شناور کو بھنور بھی ہے کنارا

آپ نے دریاؤں سمندروں اور جھیلوں میں لوگوں کو کشتی چلاتے دیکھا ہوگا مگر کشتی چلاتے ہوئے آبشار سے گرنے کا منظر پہلی بار دیکھ رہے ہوں گے۔ مغربی جرمنی کے دو مُہم جُو اس خطرناک مہم پر نکلے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تین منزلہ آبشار عبور کر گئے . . . .

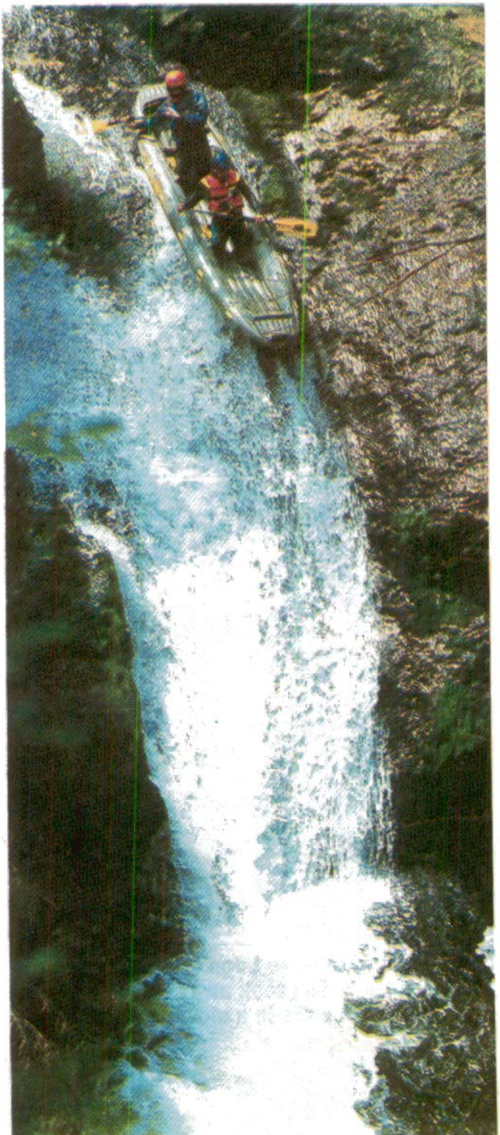

خوف سے کوسوں دُور دو بہادر کھوَیّے، آبشار کے
تُند دھارے کے سامنے سینہ سپر

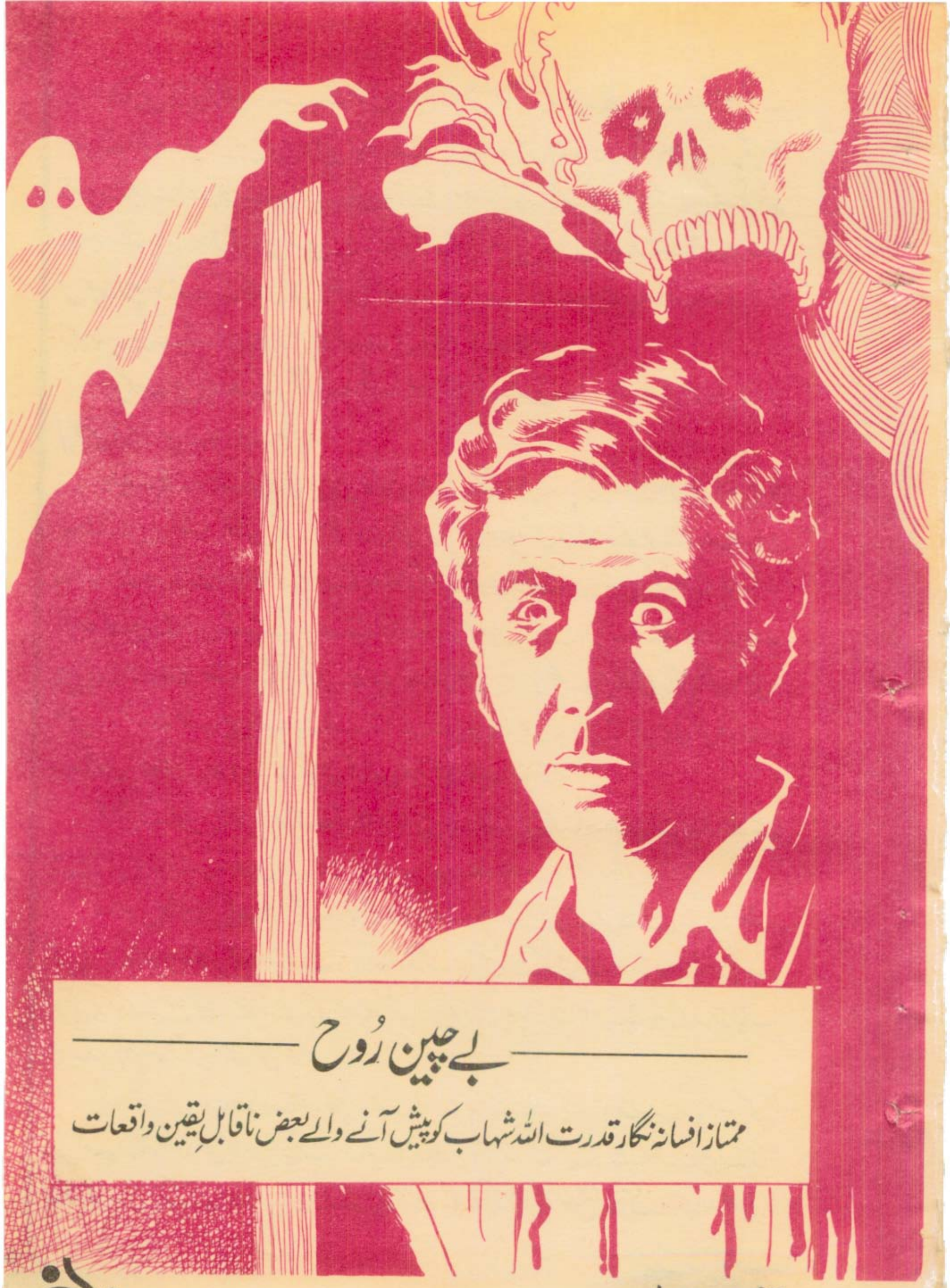

بے چین رُوح

ممتاز افسانہ نگار قدرت اللہ شہاب کو پیش آنے والے بعض ناقابلِ یقین واقعات

منسٹری ہری کرشن مہتاب بڑے خوش مزاج اور خوش اطوار وزیرِاعلیٰ تھے، اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے ذاتی مسائل میں بھی گہری دلچسپی لیا کرتے تھے۔ ایک روز میں چند فائلیں لے کر ان کے پاس گیا، تو انہوں نے میرے مکان کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہُوا کہ کٹک کی سول لائنز میں ایک کوٹھی ہے، جو سالہا سال سے غیر آباد چلی آرہی ہے۔ جب کبھی کوئی کوٹھی میں رہائش اختیار کرتا ہے تو چند ہی روز میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ کیونکہ اس گھر کے متعلق مشہور ہے، کہ یہ آسیب زدہ ہے۔ مہتاب صاحب نے کہا اگر تم وہمی طبیعت کے مالک نہیں ہو تو بڑی خوشی سے اس بنگلے کو آزما کر دیکھ لو۔

میں کلب میں ایک کمرے کی گھٹن سے تنگ آیا ہُوا تھا، اس لیے میں نے فوراً حامی بھر لی اور سول لائنز کی کوٹھی نمبر ۱۸ میرے نام الاٹ ہو گئی۔

یہ ایک ہلکے زرد رنگ کی چھوٹی سی خوش نما کوٹھی تھی جس کے گرد ڈیڑھ دو ایکڑ کا وسیع و عریض لان پھیلا ہُوا تھا۔ لان میں گھٹنوں گھٹنوں تک اُونچی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اور چاروں طرف سوکھے ہوئے کالے پیلے پتّوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جا بجا سوکھے ہوئے اور تازہ گوبر پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ایک طرف جامن اور آم کے کچھ پیڑ تھے۔ جن کے نیچے بلّیاں اور کُتے وقتاً فوقتاً اپنی مخصوص آواز میں رویا کرتے تھے۔ دوسری طرف پیپل کا پُرانا درخت تھا۔ جس کی شاخوں سے بے شمار کالی کالی، بھُوری بھُوری چمگادڑیں اُلٹی لٹکی رہتی تھیں۔ کوٹھی کے عقب میں ایک کچا تالاب تھا۔ جس کے پانی پر سبز کائی کی دبیز تہہ جمی ہوئی تھی اور کناروں پر مینڈکوں، جھینگروں اور دوسرے کیڑوں مکوڑوں کا جمِ غفیر موجود رہتا تھا۔

کوٹھی سے کوئی ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر باورچی خانہ تھا۔ اسی کے ساتھ دو سرونٹ کوارٹر تھے، جن میں میرا کشمیری خانساماں رمضان اور بنگالی ڈرائیور روز محمد رہتے تھے۔

۱۸ سول لائنز میں ایک ڈرائنگ روم، ایک ڈائننگ روم، اور تین بیڈ روم تھے۔ میں نے اپنے استعمال کے لیے جو بیڈ روم منتخب کیا، اس کا ایک دروازہ ڈائننگ روم کی طرف کھُلتا تھا۔ دوسرا دروازہ اور ایک کھڑکی برآمدے میں کھُلتے تھے۔ جس کے سامنے عقبی لان کا وسیع پھیلاؤ تھا۔ اس بیڈ روم کے ساتھ ایک ڈریسنگ روم اور غسلخانہ بھی ملحق تھا۔

ایک رات میں سب دروازے اور کھڑکی بند کر کے بستر پر لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرے پاس کوئی ٹیبل لیمپ نہ تھا، اور بجلی کا سوئچ پلنگ سے دُور والی دیوار پر لگا ہُوا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب میں نے کتاب بند کر کے تپائی پر رکھ دی، اور بجلی بجھانے کے لیے اُٹھنے لگا تھا کہ بٹن کا سوئچ کھٹاک سے بجا اور بجلی اپنے

آپ بُجھ گئی - میں نے سوچا کہ سوئچ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہو گا، اس لیے اس کا بٹن اپنے آپ ہل گیا ہے - لیکن پھر خیال آیا، کہ بجلی آف کرنے کے لیے سوئچ کا بٹن کافی زور سے اُوپر کی طرف گھُمایا جاتا ہے - اگر وہ ڈھیلا ہو گیا ہے، تو اُسے نیچے کی طرف گرنا چاہیئے تھا - وہ خود بخود اُوپر کی طرف کیسے اُٹھ سکتا ہے؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا، کہ سوئچ پھر کھٹ سے بجا اور بجلی آن ہو گئی - ساتھ ہی ڈرائنگ روم والے بند دروازے پر تین بار دھیمی سی دستک ہوئی جیسے کوئی انگلی بند کر کے اس کے جوڑ سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے - میں نے ڈرتے ڈرتے اُٹھ کر دروازہ کھولا، تو ڈرائنگ روم بالکل خالی تھا - البتہ صوفے کے قریب سفید دھوئیں کا ایک چھلا ضرور نظر آیا جو دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں تحلیل ہو گیا - اس چھلے کی ہیئت کچھ اس طرح کی تھی جس طرح کہ سگریٹ کا کش لے کر دُھوئیں کے رِنگ بنائے جاتے ہیں - جس جگہ یہ چھلا ہوا میں معلق تھا، وہاں پر انگریزی سینٹ اور حنا کے عطر کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی -

اب یہ روز کا معمول ہو گیا، کہ اِدھر میں کتاب بند کرتا، اُدھر بجلی خود بخود کھٹ سے بُجھ جاتی تھی - دوسرے تیسرے دن دروازے پر دستک بھی بدستور ہوتی تھی، اور ہر بار دُھوئیں کا چھلا پہلے کی نسبت بڑا نظر آتا تھا اور زیادہ دیر تک قائم رہتا تھا - ایک رات میں اپنے بیڈ روم میں آیا، تو میرے سلیپر غائب تھے - کافی دیر ڈھونڈتا رہا، لیکن کہیں نہ ملے - لیکن جب میں بستر پر لیٹا، تو تکیئے سے چُرمُر، چُرمُر کی آواز آئی - اُٹھ کر دیکھا تو دونوں سلیپر تکیے کے غلاف کے اندر پڑے تھے - سلیپر پہن کر منہ ہاتھ دھونے باتھ روم گیا، تو صابن دانی غائب تھی - واپس آکر بستر پر لیٹا تو وہ بھی تکیے کے غلاف سے برآمد ہوئی - صابن دانی غسلخانے میں رکھ کر دوبارہ کمرے میں آیا، تو تکیے پر بسکٹوں کا ڈبہ کھُلا پڑا تھا - جو میرے بیڈ روم کی الماری میں رکھا رہتا تھا - دو تین بسکٹ باہر گرے ہوئے تھے - میں نے ان بسکٹوں کو اُٹھا کر کھا لیا - اور ڈبہ الماری میں رکھ کر پلنگ کی طرف مڑا تو، دیکھا کہ تکیے پر سگریٹ کیس کھُلا ہُوا رکھا ہے جو ڈرائنگ روم کی میز پر مہمانوں کے لیے پڑا رہتا تھا - اپنی آٹومیٹک سروس ایجنسی کی اس دل لگی پر مجھے ہنسی آگئی - میں سگریٹ پیتا تو نہ تھا، لیکن سوچا کہ اپنے نادیدہ بامذاق خدمت گزار کا دل خوش کرنے کے لیے آج سگریٹ نوشی میں کوئی حرج نہیں - چنانچہ میں نے ایک سگریٹ منہ میں رکھا اور ماچس جلائی .... دیا سلائی کا سُلگنا تھا کہ سگریٹ میرے ہونٹوں سے کھنچ کر دُور جا پڑا - ساتھ ہی ڈرائنگ روم والے دروازے پر وہی مخصوص دستک ہوئی - میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا، تو قریب ہی ریشم کے کپڑے کی سرسراہٹ سُنائی دی - پھر سفید دُھوئیں کا حلقہ تقریباً نصف کمرے میں پھیل گیا - سارے کمرے میں بھینی بھینی خوشبو کی پھُوار سی برس رہی تھی، اور فضا میں کچھ اس طرح کا ارتعاش لرزاں تھا جیسا کہ فوارہ

چلنے سے محسوس ہوتا ہے۔ ان دنوں مجھے موسیقی کا شوق تھا اور اسراج بجانے میں کچھ ریاض بھی کیا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم کی بتی جلائی، تو میری اسراج صوفے کے قریب قالین پر یوں پڑی تھی، جیسے ابھی ابھی کسی نے وہاں لاکر رکھی ہو۔ میں بغیر سوچے سمجھے فرش پر بیٹھ گیا۔ اور اسراج بجانے لگا۔ لیکن تار بالکل (DEAD) تھے۔ ان سے کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ چند لمحے ایک عجیب سا بولتا ہُوا سناٹا رہا، پھر اچانک ایک زور کا دھماکہ ہُوا جیسے کمرے میں بارُود سے بھرا ہُوا گولہ پھٹ گیا۔ سفید دھوئیں کا حلقہ مکڑی کے جالے کے تاروں کی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اور اس کے ٹکڑے ہَوا میں اس طرح کپکپانے لگے جس طرح بادل کی لڑی کا عکس پانی کی متلاطم لہروں میں ٹوٹ ٹوٹ کر لہراتا ہے۔ ساتھ ہی بالکل بند کمرے میں چاروں طرف سے پتھروں اور اینٹوں کی بارش شروع ہو گئی۔ اب میں جہاں کہیں بھی بیٹھتا تھا، میرے آگے پیچھے، دائیں بائیں پتھر ہی پتھر برستے تھے۔ بستر پہ لیٹا تو پلنگ کے اردگرد سنگ وخشت کا انبار لگ گیا۔ ایک پتھر جو پلنگ کے اوپر میرے عین قریب آکے گرا، اس کا وزن کئی سیر تھا۔ کمروں کے روشن دان، کھڑکیاں، دروازے سب بند تھے، لیکن پتھر بڑے زور سے سنسناتے ہوئے آتے تھے۔ اور میرے بالکل قریب زمین پر گر جاتے تھے۔ خوش قسمتی سے کوئی پتھر مجھے لگتا نہ تھا۔ ورنہ ان میں کچھ اتنے وزنی اور نوکدار ہوتے تھے، کہ چند ہی ضربوں میں انسان کی ہڈی پسلی ایک کر دینے کے لیے کافی تھے۔

اس واقعے کے ساتھ ہی اگلے چند ماہ کے لیے میری زندگی کا ڈھرّا بالکل تبدیل ہو گیا۔ آٹومیٹک سروس کی پُرلطف آنکھ مچولی بند ہو گئی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ایک جانی پہچانی شائستہ اور معطر سی دستک بھی موقوف ہو گئی۔ اس غیر مرئی سے ماحول میں ایک عجیب قسم کی لطافت، رفاقت اور ادراکی اشتراک کا جو عنصر تھا، اس کی جگہ اب فوق الفطرۃ، پُر اسرار اور ہیبت ناک واقعات کا ایک تسلسل شروع ہو گیا جسے پوری تفصیل سے بیان کرنا آسان نہیں۔ اس لیے نمونے کے طور پر فقط چند چیدہ چیدہ اور نسبتاً اہم واقعات ہی درج ذیل کرتا ہوں۔

میرا کشمیری ملازم اور بنگالی ڈرائیور روز محمد عموماً رات کے دس ساڑھے دس بجے کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے تھے۔ جو کچن کے ساتھ کوٹھی سے دو سو گز کے فاصلے پر واقع تھے۔ ان کے جاتے ہی کارروائی کا آغاز اینٹوں اور پتھروں سے شروع ہو جاتا تھا۔ کئی بار ایسا ہُوا کہ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور کمرے کے اندر جو اینٹیں اور پتھر برس رہے ہیں وہ بالکل خُشک ہیں۔ صبح سویرے منہ اندھیرے میں اس ملبے کو ٹوکروں کے حساب سے سمیٹ کر لان کے تالاب میں پھینک آتا تھا، تاکہ اس ماجرے کی خبر پاکر رمضان اور ڈرائیور خوفزدہ نہ ہوں۔ یہ کارروائی روزمرہ کا دستور تھی۔

اینٹوں کی بارش کے بعد گھر کے سب دروازے، کھڑکیاں، اور روشندان کھٹ کھٹ کر کے خود بخود کھُل جاتے تھے اور اپنے آپ بند ہو جاتے تھے۔ بند ہوتے وقت دروازوں اور کھڑکیوں کے پٹ ایک دوسرے سے اس زور سے ٹکراتے تھے جیسے شدید آندھی آئی ہو۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ عمل کئی مرتبہ دُہرایا جاتا تھا۔ گھر کی سب بجلیاں بھی اسی رفتار سے جلتی اور بجھتی رہتی تھیں۔ کبھی کسی کھُلے دروازے کو بند کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بند نہ ہوتا تھا۔ اور اگر بند دروازے کو کھولنا چاہتا تو وہ کھُلتا نہ تھا۔ ایک بند دروازے کو کھولنے کے لیے ذرا زیادہ زور لگایا، تو اس کی چوکھٹ اُکھڑ کر دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ خود بخود اُچھل کر اپنی جگہ فِٹ ہو گئی۔

آدھی رات کے قریب میرے ڈرائنگ روم کی چھت چر چِرا کر اس طرح بولنے لگتی تھی۔ جیسے اس پر بے حد وزنی بوجھ ڈالا جا رہا ہو۔ کبھی تو یوُں محسوس ہونے لگتا تھا کہ اس بوجھ کے تلے چھت ٹوٹ کر نیچے آپڑے گی۔ پھر چھت پر ایسی آوازیں اُبھرتیں جیسے بہت سے لوگ لکڑی کی کھڑاویں پہنے اُچھل کوُد رہے ہوں۔ ساتھ ہی بڑے بڑے ڈھول دھما دھم اتنا زور سے بجنے لگتے کہ ان کی دھمک سے میرا کمرہ گوُنج اُٹھتا۔ ڈھول کے ساتھ کئی دوسرے ساز بھی بجنا شروع ہو جاتے تھے۔ جن میں طبلہ، چمٹا، ستار، نفیری اور شہنائی کی آواز خاص طور پر نمایاں ہوتی تھی۔ پھر یکا یک سنکھ بجنے لگتا، اور دیر تک لگاتار بجتا رہتا۔ رفتہ رفتہ سنکھ کی دلخراش گونج باقی سب آوازوں پر پوری طرح غالب آجاتی۔

میرے بیڈروم کے ساتھ عقبی لان کی طرف برآمدہ تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی اور دروازہ برآمدے میں کھُلتے تھے۔ رات کے وقت میں دونوں کو بند کر کے اندر سے کُنڈی لگا لیتا تھا۔ ایک روز چھت پر سنکھ کی آواز بلند ہوئی، تو یوُں سُنائی دینے لگا جیسے برآمدے کے پکّے فرش پر بہت سے شہہ زور گھوڑے بیک وقت سرپٹ بھاگ رہے ہوں۔ سُموں کے ٹاپوں کی آواز کے ساتھ اُن کی دُم کے بالوں کی سرسراہٹ اور نتھنوں سے زور زور سے سانس لینے کی پھڑ پھڑاہٹ بھی واضح طور پر سُنائی دیتی تھی۔ جب یہ آوازیں بڑی دیر تک جاری رہیں تو، مَیں نے کھڑکی کا ایک پَٹ ذرا سا کھول کر برآمدے میں جھانکا۔ وہاں پر گھوڑا تو کوئی نہ تھا، البتہ لال لال انگارہ سی آنکھوں والا اُلّو کی شکل و صورت کا ایک بھاری بھرکم پرندہ پَر پھیلائے ہَوا میں معلّق ہو کر اس طرح ہچکولے کھا رہا تھا جیسے وہ واقعی بھاگتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو۔ میرے جھانکتے ہی وہ اس قدر زور سے چیخا کہ میں نے فوراً کھڑکی بند کر لی۔ کافی دیر تک وہ چیخ برآمدے میں سائرن کی طرح بجتی رہی، اور اس کے بعد کچھ عرصہ یوُں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ عجیب الخلقت پرندہ اپنے

پنجوں سے کھڑکی کو کرید کرید کر توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ان دنوں میرے پاس ساگوان کی لکڑی کا بہت بڑا ڈائننگ ٹیبل تھا۔ جس کا وزن ڈیڑھ دو من ہوگا۔ ایک رات کوئی چیز لینے کے لیے میں نے ڈائننگ روم کی الماری کھولی، تو ہینڈل سے لپٹا ہوا ایک باریک سانپ بل کھاتا ہوا اُچھل کر میرے پاؤں پر آگرا۔ ساتھ ہی الماری میں رکھے ہوئے چینی کے برتن کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اُڑن طشتریوں کی طرح میز پر آجمع ہُوئے۔ اس کے بعد ڈائننگ ٹیبل آہستہ آہستہ ہوا میں اُٹھنا شروع ہُوا۔ اور اس قدر بلند ہو گیا کہ اس کے اُوپر پڑے ہوئے چینی کے برتن ٹن ٹن کر کے بجلی کے پنکھے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ پنکھے کو چھُو کر میز یکلخت دھڑام کر کے فرش پر واپس آگیا۔ اس کا ایک پایہ میرے بائیں پاؤں کے انگوٹھے پر اس قدر زور سے لگا، کہ انگوٹھے کا کچھ حصّہ آج تک بالکل بے حِس ہے۔

اس ساری ہنگامہ آرائی کا اصلی ہدف صرف ۱۸ نمبر کا بنگلہ تھا۔ رات ڈھلتے ہی یہ کوٹھی میرے لیے خوف و ہراس، عذاب و عتاب کا جہنّم بن جاتی تھی۔ ہر نئے واقعے میں اپنی قسم کی دہشت، اپنی قسم کا ہول، اپنی قسم کی وحشت سمائی ہوتی تھی۔ پتا کھڑکا، دِل دھڑکا والا مقولہ مجھ پر حرف بہ حرف صادق آتا تھا۔ یُوں تو رات بھر ڈر کے مارے مَیں بار بار پسینے میں شرابور ہوتا ہی رہتا تھا، لیکن کبھی کبھی میرے تن بدن پر خوف و ہیبت کی ایسی تھرتھری، کپکپی اور بدحواسی چھا جاتی تھی، کہ نبضیں بیٹھنے لگتی تھیں، دل دھڑکنے لگتا تھا، اور دَم گھُٹ کر گلے میں کانٹے کی طرح پھنس جاتا تھا۔ اس وحشت ناک اور لرزہ خیز ماحول میں میرے پاس خود حفاظتی کا ایک اور صرف ایک ہتھیار تھا۔ وہ ہتھیار کلمۂ طیبہ تھا۔ لاالہ اِلّا اللّٰہ محمّد رسول اللّٰہ۔ اگر سو برس کا کافر اپنے آخری سانس میں ایمان لاکر صرف ایک بار یہ کلمہ پڑھ لے، تو دوزخ کی آگ سے اس کی نجات ہو جاتی ہے۔ میری مصیبت تو دوزخ کے عذاب سے کہیں کم تھی۔ مُشکل صرف یہ تھی کہ اب تک یہ کلمہ میں نے صرف حلق سے پڑھا تھا۔ دل سے پڑھنے کی نہ کبھی توفیق نصیب ہوئی تھی نہ ضرورت پیش آئی تھی۔ لیکن خوف و ہراس کی شدّت میں بڑا مجبور کُن اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ اب جو بے کسی و بے بسی کے عالم میں کبھی مجھ پر سانپ گرتا تھا۔ کبھی میرے پاؤں کا انگوٹھا بھاری میز کے پائے تلے کچُلا جاتا تھا، کبھی فرش پر سفید چادر میں لپٹی ہوئی لاش سے ٹکر ہوتی تھی۔ کبھی چھت چٹخنے لگتی تھی، کبھی پتھر آتے تھے، کبھی اینٹیں برستی تھیں، کبھی انسانی ہڈیوں کا ڈھانچہ سامنے کھڑا ہو کر کٹ کٹ دانت بجاتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس طرح کے خوف کے دباؤ میں آکر صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ کبھی کبھی دل سے بھی کلمۂ طیبہ کا وِرد ہو جاتا تھا۔

اُن دنوں میرے پاس ایک چھوٹا سا جاپانی گراموفون تھا جو چابی چڑھا کر بجایا جاتا تھا۔ ایک رات میں

نے سہگل کا ایک پسندیدہ ریکارڈ سُننے کے لیے گراموفون کو چابی دی تو وہ آگے کی طرف گھومنے کی بجائے سپرنگ کی طرح لچک کر پیچھے کی جانب لوٹ آئی۔ چابی خود ہی اپنے آپ پہلے سے چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے گراموفون پر ریکارڈ رکھ کر چلایا، تو اس میں سے کے ایل، سہگل کے گانے کی جگہ عجیب وغریب خوفناک آوازیں آنے لگیں۔ کچھ آوازیں ایسی تھیں جیسے کسی کا گلا گھونٹا جا رہا ہو۔ بیچ بیچ میں عورت کی سسکیاں سُنائی دینے لگتی تھیں۔ کبھی کبھی ننھے سے بچے کے رونے کی آواز بھی آتی تھی۔ میں نے ایک کاغذ پر کلمۂ طیبہ لکھ کر گراموفون پر رکھا، تو فوراً یہ آوازیں بند ہو گئیں۔ اور ریکارڈ کا اصلی گانا بجنے لگا۔ اب میں کاغذ اُٹھاتا تھا تو خوفناک آوازیں شروع ہو جاتی تھیں۔ واپس رکھتا تو اصلی گانا بجنے لگتا تھا۔ تجربے کے طور پر میں نے کلمۂ طیبہ کا اُردو ترجمہ لکھ کر گراموفون پر رکھا، تو کوئی اثر نہ ہُوا۔ کلمہ کے الفاظ کو رومن حروف میں لکھ کر رکھا تو پھر بھی کوئی اثر نہ ہُوا۔ کلمۂ طیبہ کی یہ تاثیر صرف عربی زبان میں پائی۔ کلمۂ طیبہ کے علاوہ میں اپنی تقویت کے لیے آیۃ الکرسی سُورۃ فلق اور سُورہ ناس کا وِرد بھی اکثر کرتا رہتا تھا۔ ایک رات میرے گرد و پیش ہَول وہیبت کی فضا اپنے نکتۂ عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ انتہائی شکستگی، مایُوسی، اضطراب اور اضطرار کے عالم میں مَیں نے قرآن شریف کھولا تو سُورہ صٰفّٰت نکلی۔ اس کی ایک سو بیاسی آیات کا ایک ایک حرف میرے لیے آبِ حیات کا گھونٹ ثابت ہُوا۔ خوف وہراس کے ماحول میں جب کبھی میں نے اس سُورۃ کی تلاوت کی، ہر بار تازہ زندگی اور تابندگی پائی۔

کئی ماہ کی لگاتار ہیبت، وحشت اور آسیبیت کی تہہ میں انجام کار یہ راز کھُلا، کہ اٹھارہ بیس برس پہلے اس گھر میں آئی سی ایس کا ایک افسر رہا کرتا تھا۔ اس نے ایک ہندو عورت بملا کماری کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور لاش کو ڈرائنگ روم کے جنوب مشرقی کونے میں دفن کر دیا۔ اس وقت سے بملا کی نحیف و نزار ماں الٰہ آباد میں بیٹھی بڑی شدّت سے اپنی بیٹی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی وقت سے بملا کماری بھی اس کوشش میں سرگرداں تھی کہ کسی طرح وہ اپنی ماں تک صحیح صورتِ حال کی خبر پہنچا دے تاکہ انتظار کے اس کربناک عذاب سے نجات حاصل ہو۔ اس کے علاوہ اُس کی اپنی خواہش بھی تھی، کہ اس کی ہڈیوں کا ڈھانچہ کھود کر باہر نکالا جائے اور اس کے دھرم کے مطابق اس کا کریاکرم کیا جائے۔ اس عرصہ میں قاتل خود بھی مر چکا تھا اور اب بملا کی طرف سے پیغام رسانی کی ہر کوشش کو ناکام کرنے میں سرگرمِ عمل تھا۔

جس روز بملا کی ماں کو اصلی صورتِ حال کی خبر ملی، اور بملا کی بوسیدہ لاش کو چتا میں رکھ کر جلا دیا گیا، اسی روز ۱۸، سول لائنز کے در و دیوار، سقف و فرش سے آسیب کا سایہ اس طرح اُٹھ گیا جیسے آسمان پر چھائے ہوئے

بادل یکایک چھٹ جاتے ہیں۔ اُس رات نہ مینڈکوں کا ٹرّانا بند ہُوا۔ نہ جھینگروں کی آواز خاموش ہوئی، نہ پیپل کے درخت سے لٹکی ہوئی چمگادڑوں کا شور کم ہُوا۔ صبح تین بجے کے قریب اچانک فضا میں لاالٰہ الااللہ کی بے حد خوش الحان صدا بلند ہوئی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ آواز مشرق کے اُفق سے اُبھرتی ہے، ۱۸ ارسول لائنز کے اُوپر قوس بناتی ہوئی گزرتی ہے، اور مغرب کے اُفق کو جا کر چھُوتی ہے۔ تین بار ایسا ہی ہُوا، اور اس کے بعد اس مکان پر امن اور سکون کا طبعی دور دورہ از سرِ نو بحال ہو گیا۔

اس آپ بیتی کے مُشکل الفاظ اور اُن کے معنیٰ

عقب :۔ پیچھے — معلّق :۔ لٹکا ہوا۔ — سنگ و خشت :۔ پتّھر

جمِّ غفیر :۔ ہجوم — اسراج :۔ ایک قسم کا آلۂ موسیقی — ڈھرّا :۔ طریقہ

ہیئت :۔ شکل و صورت — متلاطم :۔ لہروں کا اُتار چڑھاؤ — سنکھ :۔ ایک قسم کا باجا

کریہہ المنظر :۔ گھناؤنا منظر — بساند :۔ گوشت یا مچھلی کی بُو

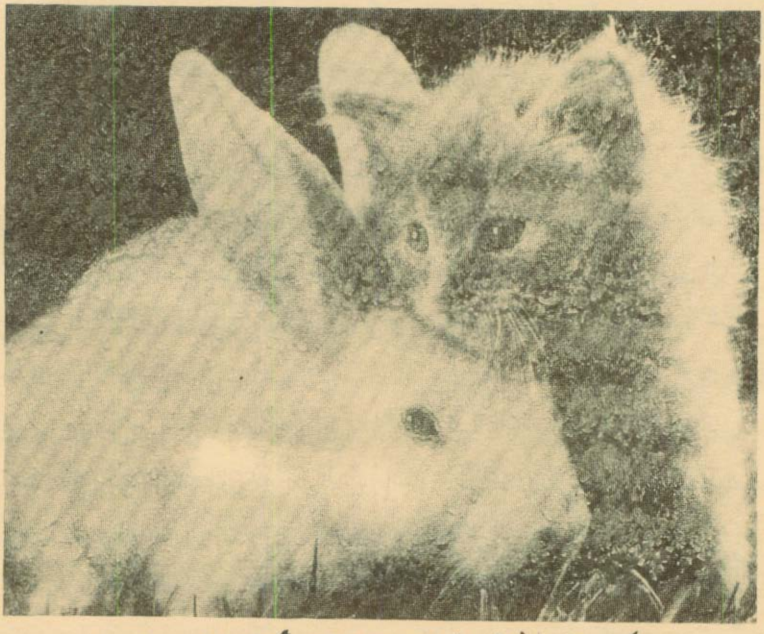

کسی انجانے خوف سے سہمے ہوئے دو دوست

چھن چھن چھن...

مشہور دانش ور ڈاکٹر جمیل جالبی کی

دل دہلا دینے والی آپ بیتی

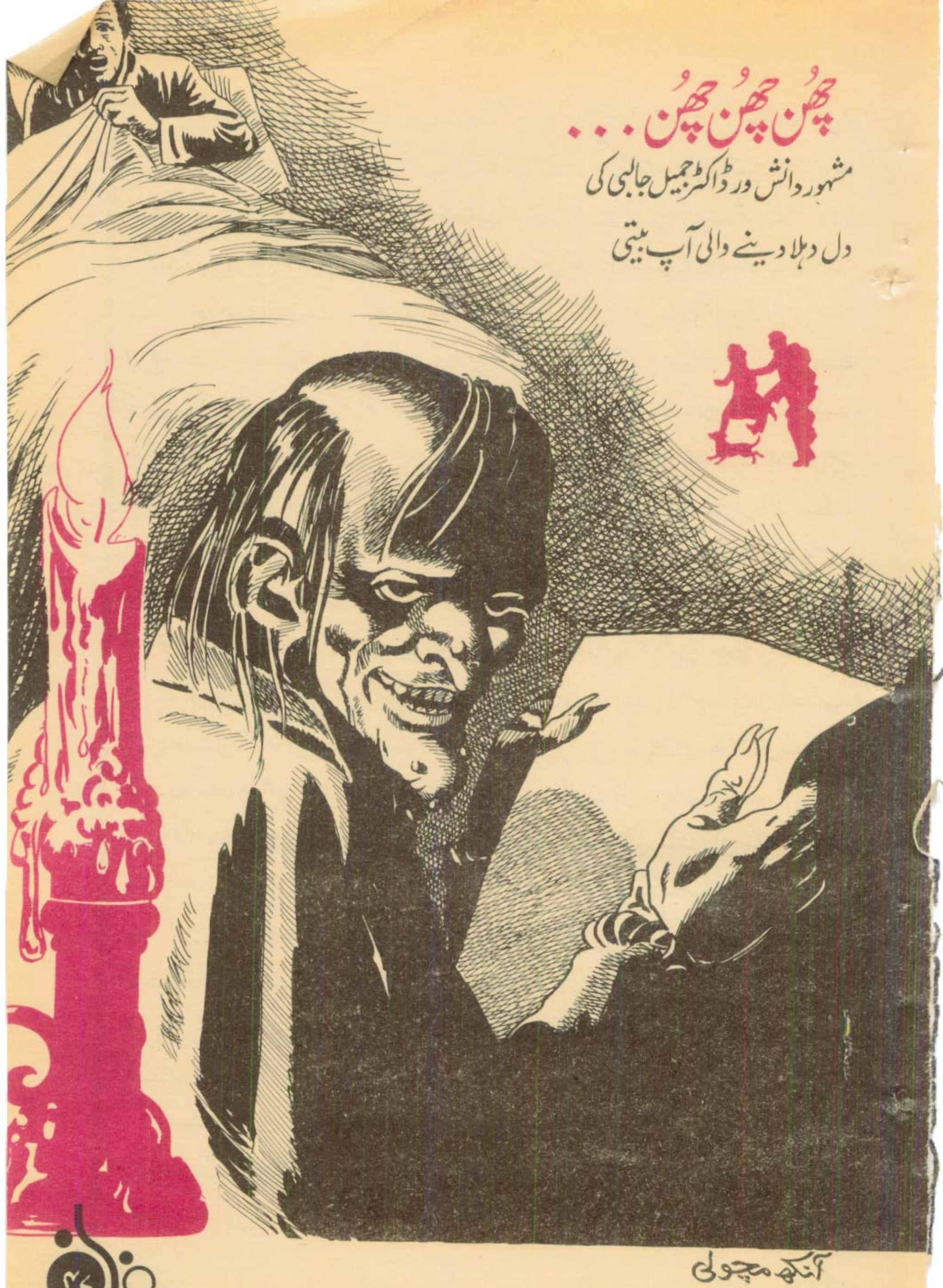

69 سردیوں کی ایک تاریک اور بھیانک رات تھی ۔ ہَوا سائیں سائیں چل رہی تھی ۔ گھر کے صحن کا نیم اتنے زور سے ہل رہا تھا کہ جانو اب گِرا ، اب گِرا ۔ آٹھ بجے تھے مگر یُوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے آدھی رات گزر چکی ہے ۔ میں اس زمانے میں سیکنڈ ایئر کا طالبِ علم تھا ۔"زینت" فلم تین دن پہلے شہر کے مشہور سینما "جگت ٹاکیز" میں لگی تھی ۔ اس پر اتنا رش تھا کہ ٹکٹ ملنا مشکل تھا ۔ ہمارے چچا جو سینما کے بے حد رسیا تھے ۔ نہ معلوم ٹکٹ کہاں سے اور کیسے لے آئے ۔؟ دفتر سے آتے ہی اُنہوں نے اعلان کیا کہ آج ہی سیکنڈ شو میں چلنا ہے ۔ اس زمانے میں دوسرا شو رات کے دس ساڑھے دس بجے شروع ہوتا تھا ۔ اور ایک ڈیڑھ بجے کے قریب ختم ہوتا تھا ۔ گھٹا اور تیز ہَوا کو دیکھ کر ہم سب کے دِل بیٹھے جا رہے تھے کہ کہیں بارش نہ ہو جائے ۔ اور سینما کا پروگرام دھرا کا دھرا رہ جائے ۔ ہُوا یہ کہ نو بجے کے قریب ہوا رُک گئی ۔ بادل چھٹ گئے اور موسم بہتر ہو گیا ۔ گھر سے سینما زیادہ سے زیادہ میل بھر کے فاصلے پر ہو گا ۔ کھانا کھا کر ہم سب لوگ پیدل روانہ ہو گئے ۔

ابھی تھوڑی دُور ہی چلے تھے کہ چچا نے کہا "جمیل میاں ! بھیّا سے بید تو لے آؤ" ۔ میں بید لینے بھیّا کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا کہ "تمہارے چچا بہت بُھلکڑ ہیں ۔ یہ بید جو میرے باپ کی نشانی ہے میں اُن کو نہیں دُوں گا" ۔ میں نے جا کر چچا سے کہا تو وہ بید لینے خود ہی آ گئے اور کہا "بھیّا آپ فکر نہ کریں ۔ بید واپس آ جائے گی" ۔ میں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور وعدہ کیا کہ میں بھی چلتے وقت چچا کو یاد دلا دوں گا ۔ آپ اطمینان رکھیے بید واپس آ جائے گی ۔ مجبوراً بھیّا نے بید چچا کے ہاتھ میں تھمادی اور ہم تیزی سے چلتے ہوئے خاندان کے دوسرے افراد سے آملے ، جو ابھی مسجد تک ہی پہنچے تھے ۔ یہ مسجد ہمارے گھر سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ہو گی ۔ اس سے دو سو گز کے فاصلے پر ایک اندھا کنواں تھا جو "بابو کا کنواں" کہلاتا تھا ۔ مشہور تھا کہ اس میں ایک "سر کٹا" رہتا ہے ۔ جو اندھیری رات میں ایک آدھ مرتبہ کنویں سے نِکلتا ہے اور رات گئے محلّے کے دروازوں پہ دستک دیتا ہے ۔ کنویں کے پیچھے گوروں کا قبرستان تھا اور اس کے بعد گرجا تھا جس کا بڑا دروازہ ٹھنڈی سڑک پر کُھلتا تھا ۔ جگت سینما جانے کے لیے بابو کے کنویں کو پار کر کے گرجا کی دیوار کے برابر ایک پتلی سی سڑک پر سے گزرنا پڑتا تھا ۔ پھر ایک پُلیا آتی تھی جو اس تنگ سڑک کو ٹھنڈی سڑک سے ملا دیتی تھی ۔ سڑک کے دونوں طرف اُونچے اونچے پُرانے گھنے درخت لگے تھے ۔

جب ہم راستہ طے کر کے ٹھنڈی سڑک پر آئے تو محسوس ہُوا کہ رات بہت ہو گئی ہے ۔ گھنے درختوں نے تاریکی کو اور تاریک کر دیا تھا ۔ ہم سب کی رفتار تیز ہو گئی ۔ آگے سو گز کے فاصلے پر ، سیدھے ہاتھ کی طرف ، ایک اسکول تھا ۔ اور بائیں طرف ایک میدان ، جو سڑک کی سطح سے تقریباً آٹھ نو فٹ نیچائی میں تھا ۔ یہ نیچا علاقہ

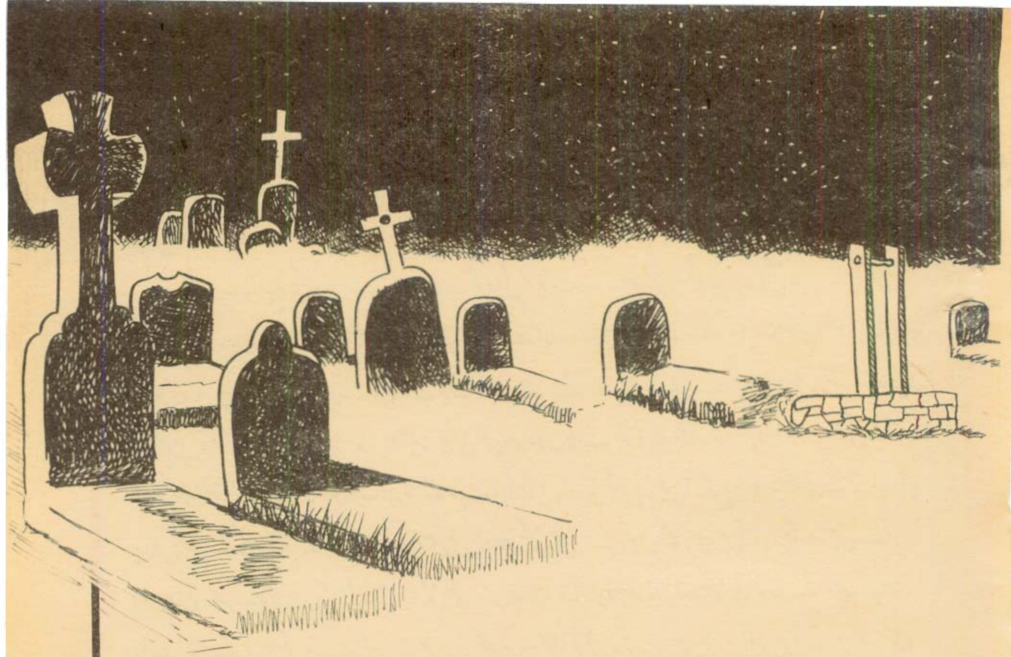

یا نشیبی میدان "ڈِگی" کے نام سے مشہور تھا۔ برسات ہوتی تو یہ تالاب بن جاتا۔ گرمیاں آئیں تو گھاس کا قطعہ یا ٹکڑا بن جاتا۔ اس کے جنوب میں کچھ کچے مکانات تھے، جن میں گھوسی اور گوجر رہتے تھے۔ ان مکانوں میں کہیں کہیں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ گرجا سے بیگم پُل تک سڑک بالکل سیدھی تھی۔ اسکول کے بعد سے دو دو فرلانگ کے فاصلے پر بجلی کے کھمبے لگے ہوئے تھے۔ بیگم پُل پر روشنی زیادہ تھی۔ ایک تو یہاں کئی دکانیں تھیں۔ جن پر گیس کی لالٹینیں جل رہی تھیں اور دوسرے اس پر دو سینما واقع تھے جن میں سے ایگ جگت ٹاکیز تھا۔ جب ہم سینما کی چاردیواری میں داخل ہوئے تو بہت بھیڑ تھی۔ پہلا شو ختم ہو چکا تھا اور دوسرا شو شروع ہونے والا تھا۔ ہم جلدی سے ٹکٹ دے کر اندر داخل ہوئے اور اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ سب سے آخری صَف میں ہماری سیٹیں تھیں اور آخری سیٹ بالکل دیوار سے ملی ہوئی تھی۔ چچا اسی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

سینما ختم ہُوا تو رات کا سوا بج چُکا تھا۔ جماہیاں لیتے، سُوں سُوں کرتے اور تیز تیز چلتے ہم گھر پہنچے اور یہاں پہنچ کر چچا کو یاد آیا کہ وہ بید سینما میں بھُول آئے ہیں۔ غضب ہو گیا۔ ان کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ انہوں نے التجا بھَری نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ "جمیل میاں جلدی سے سائیکل پر چلے جاؤ اور بید لے آؤ۔ شاباش۔" ایک تو چچا کا رُعب۔ پھر اُن کا یہ احسان کہ اُنھوں نے ہمیں سینما دکھایا اور دوسرے یہ کہ بید واپس لانے کی ذمّے داری میری بھی تھی۔ میں نے اچھا کہا اور جلدی سے زینے کے نیچے کھڑی سائیکل کی طرف بڑھا۔ میں نے اپنے بھائیوں میں سے ایک سے کہا بھی کہ وہ میرے ساتھ چلے مگر وہ نہایت بے مروّتی سے اِنکار کر کے اپنے

کمرے میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ میں نے سائیکل اُٹھائی مگر جیسے ہی اس پر سوار ہُوا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ اس کا پہیہ زمین سے لگ رہا ہے۔ دیکھا تو پہیے میں ہَوا نہیں تھی۔ میں نے غصّے میں آکر سائیکل کو وہیں پٹخا اور پیدل روانہ ہو گیا۔

مسجد ــــ بابو کا کنواں ــــ گرجا ــــ گرجا کی دیوار ــــ ٹھنڈی سڑک ــــ ڈِگی ــــ بیگم کا پُل اور سینما ــــ مینجر صاحب ابھی موجود تھے۔ اُن سے کہا۔ وہ چچا کو جانتے تھے۔ ایک آدمی انھوں نے میرے ساتھ کردیا۔ میں اندر گیا اور سیٹ کی طرف بڑھا جہاں چچا بیٹھے تھے۔ بید دیوار سے لگی تنہا کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر دَم میں دَم آیا اور پھر آگے بڑھا۔ ہَوا تیز ہوگئی تھی۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ ڈِگی کے قریب آیا تو کچے مکانوں میں سے ڈھولک اور گانے ناچنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں آگے چلا اور اسکول کے قریب آیا یہاں بجلی کے کھمبے ختم ہوجاتے تھے اور تاریکی بڑھنے لگتی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی سرنگ میں سے گزر رہا ہوں۔ میرے قدموں کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ فاصلہ جس قدر جلد طے ہوجائے، اچھا ہے۔ رات کی اس گہری تاریکی میں سے گزرتے ہوئے مجھے ہر وہ آواز خوفزدہ کررہی تھی جو اس لمبی چوڑی دنیا میں ہَوا کے ظلم کے خلاف اُٹھ رہی تھی۔

ابھی میں تھوڑی دُور ہی چلا ہوں گا کہ میں نے محسوس کیا کہ گھونگھروؤں کی سی آواز میرے پیچھے سے آرہی ہے۔ چھُن، چھُن، چھُن، چھُن، چھُن، چھُن۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے گھنگھرو کسی پالتو جانور کے پیروں میں بندھے ہوں اور اس کے چلنے سے چھُن، چھُن کی آواز پیدا ہورہی ہو۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو ایک بکری جیسا جانور مُجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اُسے دیکھ کر میری رفتار خود بخود تیز ہوگئی۔ میری رفتار کے ساتھ اس بکری نُما جانور نے بھی اپنی رفتار تیز کردی۔ میں یہ سمجھا کہ شاید ڈِگی میں رہنے والے گھوسیوں کی بکری ہے جو کھُل گئی ہے اور چلتے چلتے یہاں سڑک پر آگئی ہے۔ اب میں نے محسوس کیا کہ چھُن چھُن چھُن چھُن کی یہ آواز میرے قریب آگئی ہے۔ اس وقت میرا بُرا حال تھا۔ ایک ایک قدم سَو سَو مَن کا ہو گیا تھا۔ میں اپنے خیال میں بہت تیز چل رہا تھا۔ ڈِگی سے پُلیا کا فاصلہ، جو پلک جھپکتے ہی طے ہوجاتا تھا، اب میلوں کا فاصلہ معلوم ہورہا تھا۔ میں نے اپنی رفتار کو اور تیز کردیا۔ بکری نما جانور نے بھی اسی حساب سے اپنی رفتار کو اور تیز کردیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ آواز اب مجھ سے بہت قریب ہوگئی ہے۔ میں جلدی سے سڑک سے ہَٹ کر کچے میں ہو گیا۔ آیتہ الکرسی جو مجھے یاد تھی اُس وقت پوری کوشش کے باوجود یاد نہ آئی۔ دُرود پڑھنے کی کوشش کی وہ بھی یاد نہ رہا۔ بدحواسی کا عالم تھا۔ چاروں طرف سنّاٹا، تاریک رات، سائیں سائیں کرتی تیز ہَوا۔ پیپل کے پتّوں

کا بھیانک شور۔ ابھی میں کچے میں دو چار قدم چلا ہوں گا کہ کیا دیکھتا ہوں وہ بکری نما جانور ژوں ژوں کی آواز کے ساتھ ہوا میں اُڑا اور میرے سَر پر سے گزرتا ژوں ژوں کرتا چھن سے سڑک پر اُترا۔ اب وہ میرے سامنے تھا۔ میں کچے میں چل رہا تھا اور وہ سڑک پر چلتا ہُوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ چھُن چھُن چھُن چھُن چھُن چھُن چھُن چھُن۔ اب میں نے دیکھا کہ اس کا رنگ رات کی طرح سیاہ ہے۔ لمبے لمبے سینگ ہیں اور وہ بچھڑے کے برابر ایک بکری جیسا جانور ہے۔ اس کی آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ وہ برابر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ چھُن چھُن چھُن چھُن۔ میں ٹھہر گیا وہ چلتا رہا اور جب وہ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر رہ گیا تو پھر ژوں کی آواز کے ساتھ ہوا میں اُٹھا اور میرے سَر پر سے گزُرتا چھُن سے سڑک پر اُترا اور پھر چھُن چھُن چھُن کرتا میرے پیچھے آنے لگا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی کچے میں چل رہا ہے۔ میں پکی سڑک پر آگیا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی سڑک پر آگیا ہے۔ میں پھر کچے میں آگیا۔ یہ ذرا سا فاصلہ میرے لیے قیامت کا فاصلہ بن گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں چل رہا تھا۔ رینگ رہا تھا یا کھڑا تھا۔

اسی اثناء میں وہ پھر ژوں کی آواز سے ہوا میں اُٹھا اور میرے قریب ہی چھُن سے زمین پر اُترا۔ اب اس کا یہ

عمل تیز ہوگیا۔ وہ ژوں سے اُڑتا اور چھُن سے اُترتا، پھر ژوں ژوں کرتا اُڑتا اور چھُن سے اُترتا۔ کبھی پیچھے کبھی آگے۔ میں ایک قدم چلتا تو وہ میرے سامنے ہوتا۔ میں دو قدم پیچھے ہٹتا تو وہ میرے پیچھے ہوتا۔ پُلیا ابھی چالیس پچاس گز کے فاصلے پر تھی۔ فاصلے کا یہ اندازہ میں آج لگا سکتا ہوں۔ اُس دِن تو وہ مجھے چالیس پچاس میل سے بھی زیادہ معلوم ہو رہا تھا۔

اس بار جب وہ ژوں کی آواز سے ہَوا میں اُٹھا اور چھُن سے زمین پر اُترا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ دُور اُترا ہے۔ میں نے سوچا، بہتر یہ ہے کہ اپنی ساری قوّتوں کو جمع کرکے تیزی سے بھاگنے کی کوشش کی جائے۔ چھُن چھُن چھُن چھُن چھُن چھُن چھُن چھُن چھُن کی آواز میرے پیچھے سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں سَر پر پاؤں رَکھ کر بھاگا۔ کلمہ پڑھتا جاتا تھا اور بھاگتا جاتا تھا۔ بھاگتا جاتا تھا اور کلمہ پڑھتا جاتا تھا۔ اُسی اثناء میں پھر ژوں کی آواز آئی اور وہ میرے سر پر سے ہوتا ہوا۔ پھر ایک بار مجھ سے چند گز کے فاصلے پر چھُن سے زمین پر اُترا اور میری طرف بڑھنے لگا۔ میں بھاگتا رہا۔ بھاگتا رہا۔ اتنے میں پُلیا آگئی۔ میں جلدی سے اس پر آیا اور گرجا کی دیوار سے لگا بھاگتا ہوا "بابو کے کنویں" کے پاس آیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اتنے میں پھر ژوں کی آواز آئی اور وہ میرے سر پر سے اُڑتا ہوا مجھ سے پہلے اس کنویں کے چبوترے پر آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ بُت کی طرح بے حِس و حرکت کھڑا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ غائب ہوگیا اور پھر اُسی جگہ سے کفن کے سے لباس میں لپٹا، بغیر سر کا ایک آدمی، میری طرف آ رہا ہے۔ بابو کا کنواں میرے بائیں طرف تھا۔ میں دائیں طرف کو ہوکر پھر تیزی سے بھاگا۔ میری چیخ نکل گئی۔ میں چیختا جاتا تھا اور بھاگتا جاتا تھا۔ اتنے میں مسجد کے قریب پہنچ گیا۔ مسجد سے میدان اور پھر گھر۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ اندر سے کُنڈی لگائی اور جلدی سے لحاف میں دبک گیا۔ جیسا کہ پہلے زمانے کے مکانوں میں ہوتا تھا میرے کمرے کا دروازہ گھر سے باہر کی طرف بھی کھُلتا تھا۔ ہرے رنگ کا چھوٹا سا بلب کمرے میں روشن تھا۔ سامنے میز پر میری کتابیں اور کالج نوٹ بُک رکھّی تھی۔ میرا سانس پھُول رہا تھا۔ جسم کا سارا خون خشک ہوگیا تھا۔ میں نے لحاف کو سر تک تان لیا۔ کچھ دیر طرح طرح کے ڈراؤنے خیالات مجھے پریشان کرتے رہے اور پھر نہ معلوم میں کب سو گیا۔

ابھی سوئے ہوئے مجھے کچھ دیر ہی ہوئی ہوگی کہ اچانک میز پر سے کتاب کے گرنے اور کرُسی کے کھینچے جانے کی آواز سے میری آنکھ کھُل۔ میں نے لحاف منھ پر سے اُتارا اور دیکھا کہ ایک لمبے قد کی خاتون، گہرے سُرخ رنگ کی ساڑھی پہنے، میری طرف پیٹھ کیے، میز پر جھکی ہوئی، میری کالج نوٹ بُک کے وَرق اُلٹ پلٹ

رہی ہے۔ یا اللہ - یہ کون ہے ؟ اس قد اور جسم کی تو کوئی عورت ہمارے خاندان میں نہیں ہے اور پھر رات گئے میرے کمرے میں آنے کے کیا معنی ہیں ؟ کچھ دیر وہ اسی طرح جھکی کھڑی رہی - پھر اس نے پینسل سے کاغذ پر کچھ لکھا۔ لکھ کر کاغذ کو پھاڑا اور تہ کر کے اپنے سینے میں رکھ لیا - یہ کر کے وہ میری طرف مڑی - اُسے دیکھ کر میرا دَم ہی تو نکل گیا - بیل کی سی آنکھیں - ضرورت سے زیادہ چوڑی پیشانی اور بہت ہی لمبی ناک جو طوطے کی چونچ کی طرح، آگے کو مڑی ہوئی تھی - دہانہ سُوَر کی طرح گول اور تنگ - اس نے شاید محسوس کیا کہ میں لحاف میں سے اُسے دیکھ رہا ہوں - وہ میرے پلنگ کے قریب آئی اور بُت کی طرح بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی - بہت دیر تک وہ اسی طرح کھڑی رہی - میں دَم سادھے لحاف میں چُپ چاپ لیٹا تھا - نہ آواز نکال سکتا تھا اور نہ کسی کو مدد کے لیے بلا سکتا تھا - کچھ دیر بعد وہ میری پٹّی سے ہٹی اور میز کی طرف گئی اور کھونٹی پر ٹنگی ہوئی بید کو اُٹھا کر گھمانے لگی - گھماتے گھماتے وہ پھر میرے پلنگ کی طرف آئی - اس کے چلنے سے چھُن چھُن چھُن چھُن کی وہی آواز میرے کانوں میں آنے لگی - وہ اسی طرح بہت دیر تک بُت بنی میرے پلنگ سے لگی کھڑی رہی، پھر اُس نے بید کی نوک سے میرے لحاف کو اُتارنے کی کوشش کی - مجھے یُوں معلوم ہو رہا تھا کہ اب دَم نِکلا - اب دَم نِکلا - میں نے لحاف کو اور زور سے دبا لیا - کچھ دیر تک وہ یہی کرتی رہی - جیسے ہی وہ لحاف اُتارنے کی کوشش کرتی، میں پوری قوّت سے لحاف کو دَبا لیتا - میں سوچ رہا تھا کہ یا اللہ آج صبح کب ہو گی - یہ بھیانک تاریکی کب ختم ہو گی - باہر تیز ہَوا چل رہی تھی - صحن میں کھڑا نیم اور ہَوا کی سائیں سائیں خوف کو اور بڑھا رہے تھے - چھت پر دو بلیاں لڑ رہی تھیں، جن کی ڈراؤنی آواز مجھے مارے ڈال رہی تھی - میں نے محسوس کیا کہ شاید آج میری زندگی کی یہ آخری رات ہے - کوئی بھی تو ایسا نہیں تھا جو میری مدد کو آ سکے اور اس بَلا سے مجھے نجات دلائے - میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا کہ سَوا بجے سینما ختم ہُوا - پونے دو بجے ہم گھر پہنچے، پھر میں بید لینے سینما گیا اور پھر اس کے بعد چھُن چھُن چھُن چھُن والا واقعہ پیش آیا تو گویا تین بجے میں گھر آ گیا ہوں گا - اور کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں سویا بھی، تو پھر اس وقت ساڑھے چار تو ضرور بجنے چاہئیں - ابھی تک کوئی مُرغا بولا اور نہ زبیر (موذّن) نے اذان دی - وہ گھوسی جو صبح تڑکے ہی اپنی گائیں ہماری گلی میں سے لے جاتا تھا، آج وہ بھی نہیں آیا - یا اللہ یہ رات کیسے گزُرے گی - ؟ اب کیا بجا ہو گا ؟ کیا ابھی صبح نہیں ہوئی ؟ کیا آج صبح نہیں ہو گی ؟ چھت پر بلّیاں پھر لڑنے لگیں - اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ وہ میرے پلنگ سے ہَٹ کر پھر میری میز کی طرف جا رہی ہے - میز پر پہنچی اور جُھک کر میری کالج کی نوٹ بُک کے ورق اُلٹنے پلٹنے لگی - کچھ دیر اسی طرح کرتی رہی پھر میز پر رکھی ہوئی انگلش اُردو لُغت کو اُٹھایا اور اُسے آتشدان پر رکھ دیا - کُرسی کو کھینچا اور اس پر بیٹھ گئی۔

اور پھر کچھ لکھنے لگی ۔ بہت دیر تک وہ لکھتی رہی اور پھر پہلے کی طرح ورق پھاڑا ، تہ کیا اور اُسے اپنے سینے میں اُڑس لیا ۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس بار وہ میرے سرہانے کی طرف آئی اور پوری قوت سے میرے منہ پر سے لحاف اُتارنے لگی ۔ اِدھر وہ زور لگاتی ، اُدھر میں پُوری طاقت سے لحاف کو دباتا ۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی اُنگلیوں کی پکڑ سخت ہو گئی ۔ لمبے لمبے ناخن لحاف میں گڑ گئے ۔ اس بار اُس نے پوری کوشش سے لحاف کو میرے منہ پر سے اُتار دیا اور اسی کوشش میں جھر سے لحاف کے پھٹنے کی آواز میرے کانوں میں آئی ۔ اب میرا منہ کھُلا تھا اور میں اُس کے رحم و کرم پر پلنگ پر پڑا تھا ۔ کچھ ہی دیر بعد وہ میرے سرہانے بیٹھ گئی اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی ۔ جب وہ اُنگلیاں پھیرتی تو میرے سر میں مرچیں سی لگنے لگتیں ۔ ایک بار تو اُس نے اتنی زور سے ناخن گڑائے کہ میں نے محسوس کیا کہ میرے سَر کی ساری کھال اُتر گئی ہے ۔ کبھی وہ زمین پر پیر مارتی تو وہی چھُن چھُن کی آواز میرے کانوں میں آنے لگتی ۔ میں دَم سادھے یُوں ہی لیٹا رہا ۔ وہ میرے سر کو اُسی طرح سہلاتی رہی ۔ رہ رہ کر مجھے خیال آتا کہ آج شاید صبح نہیں ہوگی ۔ زبیر آج سوتے ہی رہیں گے ۔ روشن دان کی طرف دیکھا تو رات کی سیاہی روشنی میں تبدیل ہو رہی تھی ۔ وہ اُسی طرح اُنگلیاں چلاتی رہی اور میں چُپ چاپ اس کی اُنگلیوں سے پیدا ہونے والی تکلیف کو برداشت کرتا رہا کہ اتنے میں اذان کی آواز میرے کانوں میں آئی ۔ اذان کی آواز سُنتے ہی وہ اُٹھی ۔ بید اس کے ہاتھ میں تھی ۔ اُس نے دروازے کا رُخ کیا ۔ کُنڈی کھولی ۔ دروازہ دھڑ سے بند کیا ، اور باہر نکل گئی ۔ میں اُسی طرح پلنگ پر پڑا رہا ۔ میری ہمّت جواب دے چُکی تھی ۔ پلنگ سے اُٹھ کر کُنڈی لگانے کی بھی مجھ میں ہمت نہیں تھی ۔ کچھ دیر بعد دُودھ والے نے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ میں ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف گیا ۔ جلدی سے کُنڈی لگا دی اور آواز دی ۔ کون ہے ؟ جواب آیا " بھیا ! شبراتی " میں نے برتن دیا ۔ دُودھ لیا اور واپس آکر پلنگ پر بیٹھ گیا ۔ میں نے دیکھا کہ کوئی چیز میرے گالوں پر جم گئی ہے ۔ ہاتھ پھیرا تو وہ خُون تھا جو میرے سَر سے بہہ کر گالوں تک آگیا تھا ۔ لحاف دیکھا تو وہ پھَٹ گیا تھا ۔ آئینہ اُٹھایا تو سَر میں ایک زخم تھا اور بید ــــ وہ بھی غائب تھی ۔ کالج نوٹ بُک کے دو کاغذ پھٹے ہوئے تھے اور کئی صفحات پر کِرم کاٹنے سے بنے ہوئے تھے ۔ اور پھر یہ ہُوا کہ میرے سر کے بال تیزی سے گرنے لگے اور زخم کا وہ نشان آج تک میرے سر میں موجود ہے ۔

پہلے میں بھُوتوں ، پلیتوں ، چڑیلوں ، سَر کٹوں ، بدرُوحوں اور چھل پیریوں پر یقین نہیں رکھتا تھا ۔ لیکن اُس دِن سے یہ حال ہے کہ مجھے چاروں طرف یہی مخلوق نظر آتی ہے ۔ معلوم نہیں آپ کیا سوچتے ہیں ؟

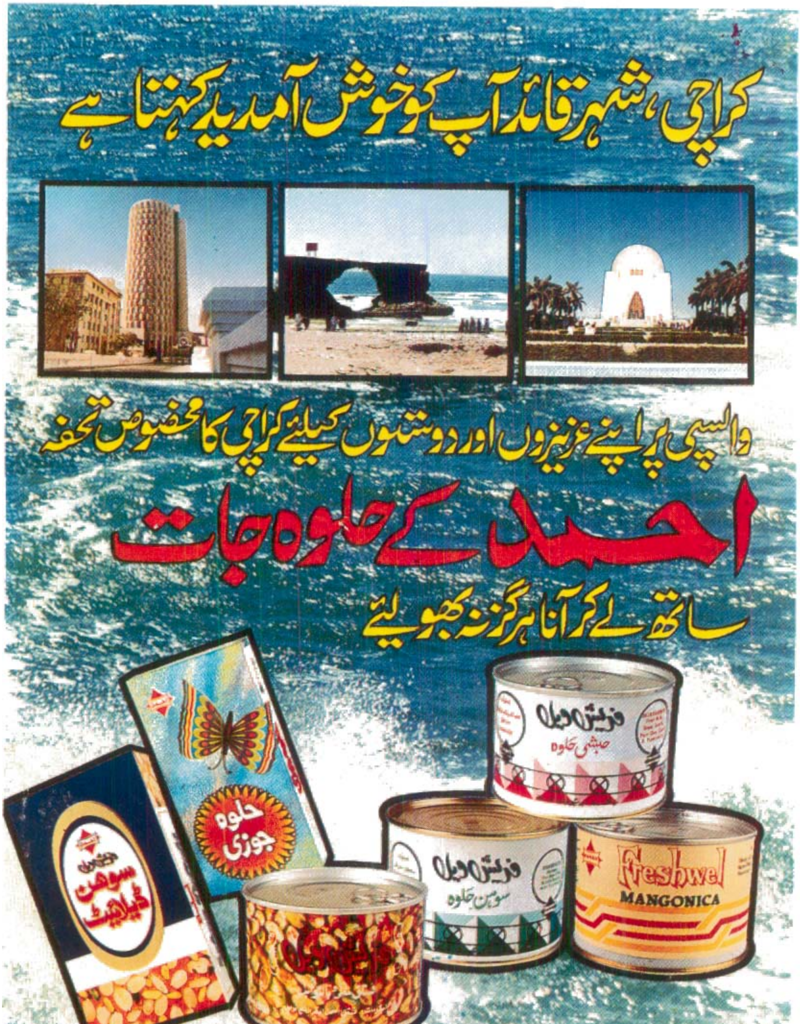

کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیے
فریش ویل
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
سوہن ڈیلائیٹ
فریش ویل
سوہن حلوہ
Freshwel
MANGONICA

MASS

خوفناک ڈھانچہ

بے خوف بچّے

راہ چلتے ہم اگر کسی مُردہ ڈھانچے کو دیکھ لیں تو ہماری تو جان ہی نکل جائے، مگر ان نڈر بچّوں کو دیکھیے۔ مُردہ ان کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑا ہے بلکہ غور سے دیکھیے مُردے کا گلا دبانے پر مُردہ کس بُری طرح سے چیخ رہا ہے۔ تصویروں کا مفصل احوال سامنے دیے ہوئے مضمون میں پڑھیے۔

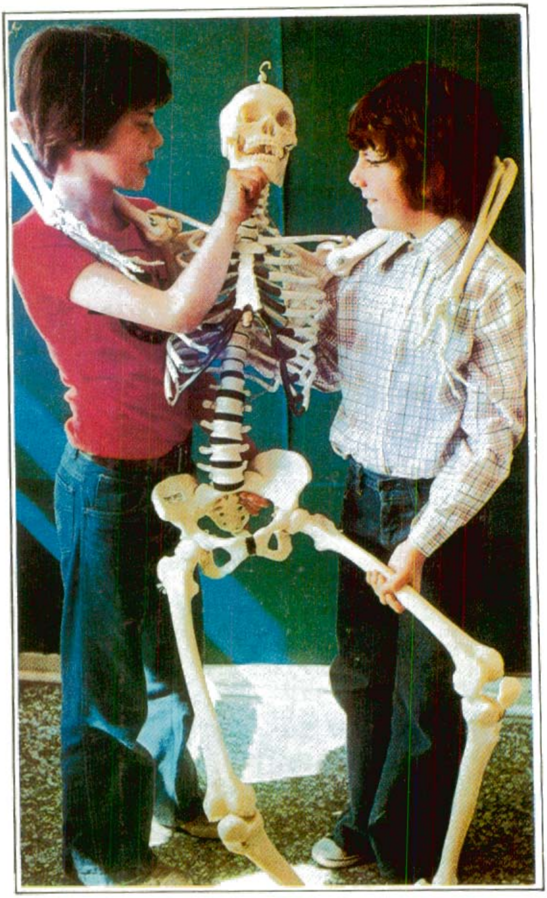

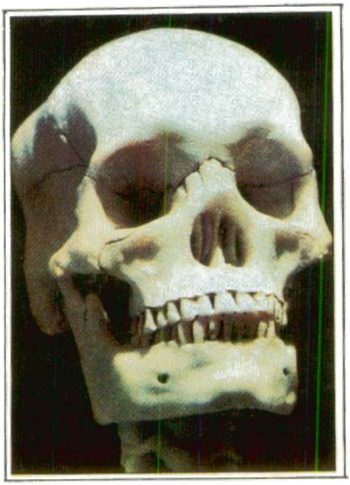

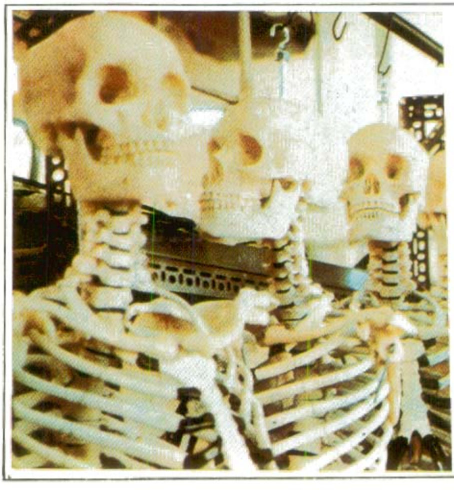

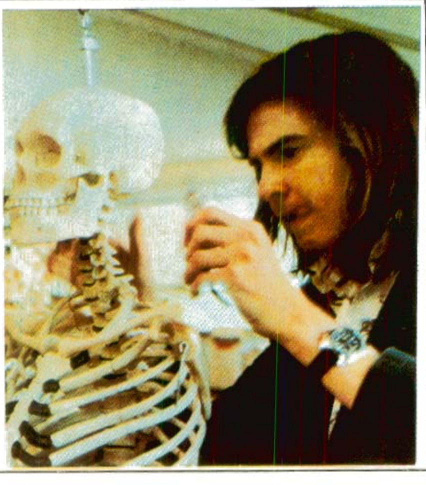

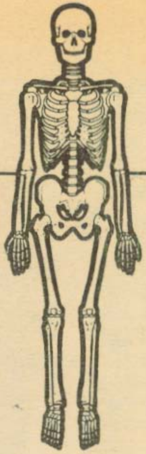

ترجمہ : جنید شمیم

ڈھانچوں کے درمیان

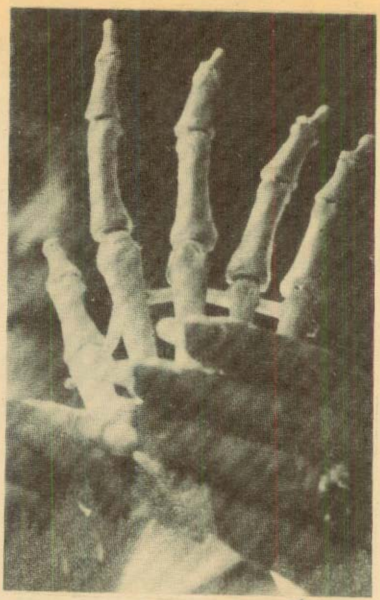

اگر آپ کسی ایسے کمرے میں داخل ہو جائیں جس میں ہر طرف انسانی ڈھانچے لٹکے ہوئے ہوں تو شاید آپ ڈر جائیں۔ ظاہر ہے آپ ہی کیا اچھے اچھے ڈر جائیں۔ مثلاً ہم - لیکن برطانیہ کی کاؤنٹی سرے میں واقع ایجوکیشنل اینڈ سائنٹیفک پلاسٹک فیکٹری میں کام کرنے والے افراد ایسے کمرے میں داخل ہو کر ہرگز نہ گھبرائیں گے۔ وجہ .... ؟ بھئی ان کا کام ہی ڈھانچے بنانا ہے۔ تاہم اس فیکٹری میں اصلی انسانی ڈھانچے نہیں بنائے جاتے بلکہ یہاں پلاسٹک کے ڈھانچے بنائے جاتے ہیں۔

اس فیکٹری میں تیار ہونے والے انسانی ڈھانچے دُنیا کے تقریباً چالیس ممالک کے اسپتالوں اور میڈیکل کالجوں کو فروخت کیے جاتے ہیں۔ یہ انسانی ڈھانچے میڈیکل کے طالب علموں کو انسانی جسم سے متعلق معلومات حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

یہ فیکٹری تقریباً تیس برس قبل قائم کی گئی تھی۔ اُس وقت یہ دُنیا میں انسانی ڈھانچے تیار کرنے والی واحد فیکٹری تھی۔ اس وقت فیکٹری میں ہر ہفتہ پانچ فٹ سات انچ قامت کے اوسطاً بیس ڈھانچے تیار ہوتے ہیں۔ فیکٹری میں تیار ہونے والے ایک انسانی ڈھانچے کی قیمت تین سو امریکن ڈالر یعنی تقریباً پانچ ہزار چھ سو روپے ہے۔

فیکٹری میں ہر انسانی ہڈی کا ایک فرمہ موجود ہے۔ ڈھانچے تیار کرنے کے لیے مخصوص قسم کی پگھلی ہوئی پلاسٹک ان فرموں میں ڈالی جاتی ہے تقریباً دو گھنٹوں کے بعد جب یہ پلاسٹک خشک ہو جاتی ہے تو اسے

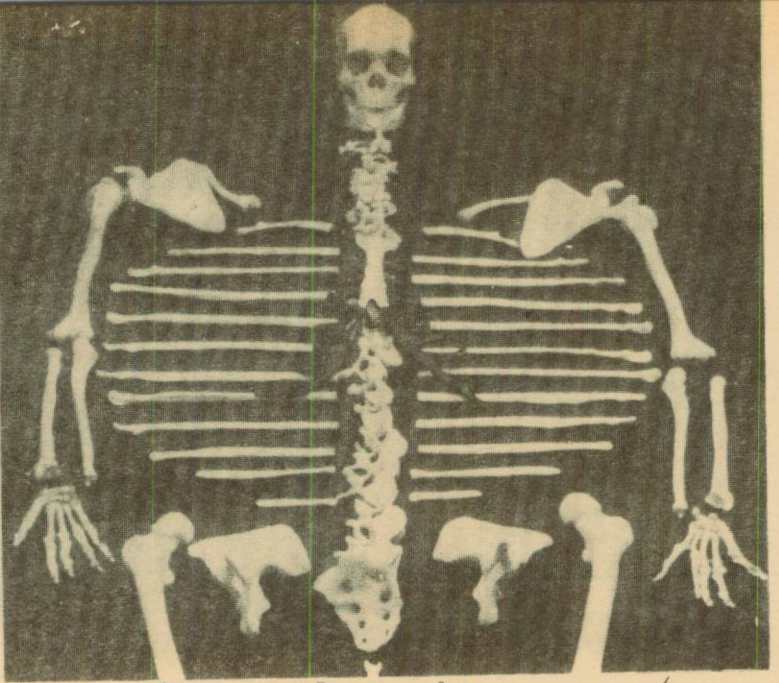

ان فرموں سے نکال لیا جاتا ہے اور یوں انسانی جسم میں موجود مختلف ہڈیاں تیار ہو جاتی ہیں۔

فرموں سے جس وقت ہڈیاں نکالی جاتی ہیں اُس وقت یہ ہڈیاں کھُردری ہوتی ہیں چنانچہ مخصوص مشینوں کے ذریعے ان ہڈیوں کو ہموار بنایا جاتا ہے ۔ ہڈیوں کے ہموار ہو جانے کے بعد انھیں مختلف کارکنوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ۔ تاکہ ان ہڈیوں کو آپس میں جوڑ کر مکمل انسانی ڈھانچہ تعمیر کیا جا سکے ۔ فیکٹری میں انسانی جسم کے ہر حصّے کا ایک اسپیشلسٹ موجود ہے ۔ مثلاً ہاتھوں کی ہڈیوں کا اسپیشلسٹ ، پیروں کی ہڈیوں کا اسپیشلسٹ وغیرہ ۔ چنانچہ یہاں ہر اسپیشلسٹ کو اس کی مہارت کے مطابق کام دیا جاتا ہے ۔ اگر کوئی کارکن نیا ہو اور اُسے معلوم نہ ہو کہ کون سی ہڈی کہاں اور کس طرح جوڑی جائے گی تو اُس کی مدد کے لیے وہاں پر پہلے سے تیار شدہ ڈھانچہ موجود ہوتا ہے ۔ جس کو دیکھ کر وہ درست ہڈیاں جوڑ سکتا ہے

انسانی جسم کے اُن حصوں کو جن میں جوڑ ہوتے ہیں تاروں کے ذریعے آپس میں جوڑا جاتا ہے ۔ ایسا کرنے کے لیے ہڈیوں میں سوراخ کیے جاتے ہیں ۔ آخر میں جب انسانی جسم کے تمام حصّے آپس میں جوڑ دیے جاتے ہیں ۔ تو ایک مکمل ڈھانچہ تیار ہو جاتا ہے ۔

اگر آپ کبھی برطانیہ جائیں تو یہ فیکٹری ضرور دیکھیں ۔ لیکن اپنے دل کو ذرا مضبوط بنا کر .... ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ڈھانچہ فیکٹری سے بے ہوش ہو کر نکلیں ۔

ہم کیوں ڈرتے ہیں؟

خوف کے نفسیاتی اسباب کا علمی جائزہ

طاہر مسعود

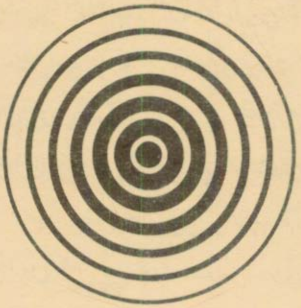

کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو اس بات کا اقرار کرنے کی ہمت رکھتے ہوں کہ وہ خوفزدہ بھی ہوتے ہیں۔ آپ کسی سے پوچھیے کہ کیا آپ کو ڈر لگتا ہے۔ وہ بے ساختہ کہہ اُٹھے گا "بالکل نہیں۔ مجھے ڈر ور نہیں لگتا"۔

جب آپ دوبارہ سوال کریں کہ اچھی طرح سے سوچ کر بتائیے کہ کیا آپ کبھی نہیں ڈرے؟ آپ کا سنجیدہ لہجہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ سوچ میں ڈوب جائے گا اور ممکن ہے اعتراف کرے کہ اُسے اندھیرے کمرے میں جانے سے وحشت ہوتی ہے یا وہ رات کے وقت قبرستان کے سامنے سے نہیں گزر سکتا۔ یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور جواب۔ لہٰذا اس سوال پر غور کرنے سے پہلے کہ "ہم کیوں ڈرتے ہیں؟" اس بارے میں سوچنا چاہیے کہ "ہم ڈرنے کا اعتراف کرنے سے اتنے شرماتے کیوں ہیں؟" اصل میں اس کی وجہ نفسیاتی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یا تو بچے ڈرتے ہیں یا پھر بزدل اور ڈرپوک لوگ۔ اور کون ہے جو خود کو بچہ یا بزدل کہلانا پسند کرے گا۔ اسی وجہ سے ایسے لوگ آپ نے مشکل ہی سے دیکھے ہوں گے جو اعلانیہ کہتے ہوں کہ مجھے تو بھئی بہت ڈر لگتا ہے۔ خاص طور پر اس قسم کے جملے لڑکوں یا مردوں کے منہ سے تو شاذ ہی نکلتے ہوں۔ اس کے برعکس ایسے سورماؤں سے شاید آپ واقف ہوں جو خود کو بہت بہادر، جی دار اور بے خوف ظاہر کرتے ہیں لیکن موقع آنے پر پتہ چلتا ہے کہ وہ تو اندر سے بے حد ڈرپوک نکلے۔ دراصل اس قسم کی بہادری ایک نقاب ہوتی ہے جسے پہن کر اکثر تیس مار خاں دوسروں پر رُعب گانٹھتے رہتے ہیں۔

ماہرینِ نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ خوف یا ڈر ایسی ہی جبلّت ہے جیسے خوشی اور غم، محبّت اور نفرت

وغیرہ۔ سائنس کتنی ہی ترقی کر جائے۔ علوم کے میدان میں انسان کتنا ہی آگے بڑھ جائے لیکن خوف کا مادہ اس کے اندر ہمیشہ موجود رہے گا۔ اس معاملے میں ایک وحشی اور جنگلی انسان اور ایک مہذب و متمدن انسان میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زمانے نے جیسے جیسے ترقی کی ہے بہت سی چیزوں کے متعلق انسانوں کا خوف ماضی کے مقابلے میں اب کم بلکہ بالکل ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ مثلاً قدیم زمانے کا انسان مظاہرِ فطرت سے خوف کھاتا تھا۔ مہیب پہاڑ، خوفناک چٹانیں، بادل کی گرج، بجلی کی کڑک اور اس قسم کے دیگر عناصرِ فطرت انسانوں کے لیے ڈراؤنے تھے۔ لیکن اب جبکہ سائنس نے ان کی حقیقت کھول کر انسانوں کے سامنے رکھ دی ہے۔ اس لیے آج کے انسان نے ان چیزوں سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو نادیدہ قوتوں سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ اور جنوں اور بدروحوں کے قصوں پر نہ صرف یقین رکھتے ہیں بلکہ اُن کا انجانا خوف اُنہیں دہلائے رکھتا ہے۔

اب آیئے اس سوال کی جانب کہ ہم آخر ڈرتے کیوں ہیں؟ اس جذبے کا تجزیہ اس لیے مشکل ہے کہ خوف کی ہزاروں شکلیں ہیں۔ خوف انسان کی اندرونی حقیقت ہے، یہ ذہن کی ایک کیفیت کا نام ہے جو اعصاب کو متاثر کرتی ہے اور بعض صورتوں میں اُسے معطل کر کے رکھ دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب آپ خوفزدہ ہوتے ہیں تو آپ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔ اور خوف کا جذبہ ان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ یوں تو خوف کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن ایک نارمل انسان کے لحاظ سے خوف کی کیفیت کا تجزیہ کیا جائے تو اسے ہم دو قسموں میں بیان کر سکتے ہیں۔

الف:۔ معلوم کا خوف ۔ ب:۔ نامعلوم کا خوف

معلوم کا خوف:۔

جب آپ کسی بلند عمارت مثلاً حبیب پلازہ یا بادشاہی مسجد کے مینار سے جھانکیں تو خوف کی لہر آپ کو اپنی ہڈیوں میں اُترتی محسوس ہوگی۔ کچھ ایسا لگے گا جیسے آپ کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑتے جا رہے ہیں۔ یہ کیفیت کیوں پیدا ہوتی ہے؟ بات یہ ہے کہ انتہائی بلندی سے نیچے دیکھنے سے، کسی لمبے چاقو کے چمکتے ہوئے پھل پر نظر ڈالنے سے یا کسی خونخوار کُتے کو اپنے سامنے پا کر اپنی ذات کے غیر محفوظ ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یہ احساس کہ آپ خطرے سے دوچار ہیں۔ لیکن یہ خوف وقتی ہوتا ہے کیونکہ آپ کی عقل تسلی دیتی ہے کہ آپ چھت سے نیچے نہیں گریں گے اس لیے کہ آپ کے گرد لوہے کی ریلنگ لگی ہوئی ہے۔ لمبا چاقو آپ کے بھائی کے ہاتھوں میں ہے اور وہ آپ پر ہرگز حملہ نہیں کرے گا۔ اور یہ خونخوار کُتا تو نقلی ہے اور کسی سنگ تراش کے فن کا شاہکار ہے۔ اور جو صورتحال اس کے بالکل اُلٹ ہو تو آپ کا ڈر اُس وقت تک برقرار رہے گا جب تک

کہ آپ خود کو محفوظ محسوس نہ کریں۔ معلوم کا خوف کسی صورتِ حال کے انجام یا اس کے نتیجے سے پہلے ہی آگاہ ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں بہادر وہ لوگ کہلاتے ہیں جو نتیجے کی پرواہ کیے بغیر اپنے اعصاب کو قابو میں رکھیں اور اپنی حفاظت کے لیے معقول قدم اُٹھائیں۔

نامعلوم کا خوف۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ فطرت کے لگے بندھے قوانین ہیں جس کی بنیاد پر دُنیا کا نظام چل رہا ہے، سائنسدانوں نے برسہا برس کی غور و فکر اور تحقیق و تفتیش کے بعد ان قوانینِ فطرت کو دریافت کیا ہے۔ مثلاً نیوٹن نے کشش ثقل کا قانون دریافت کیا اور ثابت کیا کہ زمین میں مقناطیسیت پائی جاتی ہے اور وہ ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ کر رکھتی ہے وغیرہ۔ ان قوانین سے لوگ واقف ہیں۔ لہٰذا ایسے واقعات جو قوانینِ فطرت کے خلاف ہوں ہمارے لیے انوکھے ہوتے ہیں۔ اور ہمارے اندر ڈر اور خوف کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب آپ اچانک یہ دیکھیں کہ آپ جس میز پر بیٹھے پڑھ رہے ہیں وہ خود بخود آہستہ آہستہ ہَوا میں بلند ہو کر معلق ہو گئی ہے تو چیخ پڑیں گے اور خوف کا جذبہ آپ کی رگ رگ میں سرایت کر جائے گا۔ کیوں؟ اس لیے کہ آپ کو پتہ ہے کہ دنیا میں علّت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کا نظام قائم ہے۔ یعنی ہر واقعہ جو پیش آتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی معقول سبب ہوتا ہے۔ میز اُس وقت تک نہیں اُٹھ سکتی جب تک کوئی اُسے اُٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ رکھ دے۔ لہٰذا ایسے تمام واقعات جو قوانینِ فطرت کی نفی کرتے ہوں اور جن کے پیش آنے کا کوئی سوال ہی نہ ہو۔ ... وہ واقعات آپ کے جذبۂ خوف کو جگا دیتے ہیں۔

لیکن جب ایسے واقعات کا معقول سبب آپ کے علم میں آجائے تو آپ کا خوف جاتا رہتا ہے۔ فرض کیجیے آپ رات کے وقت اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے ہیں یکایک سامنے کی دیوار پر ایک شخص کا سایہ پڑنے لگتا ہے۔ آپ کا دل خوف سے بیٹھ جائے گا، لیکن جب آپ مُڑ کر دیکھیں گے کہ یہ تو آپ کے کزن کا سایہ ہے جو دبے پاؤں پیچھے آکر کھڑا ہو گیا ہے تو آپ ہنس پڑیں گے یا ممکن ہے ناراض ہو جائیں کہ اُس نے ایک بُرا مذاق کیا۔

نامعلوم کا خوف ہمارے اندر بعض اعتقادات اور توہمات کی وجہ سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ عام عقیدہ یہی ہے کہ انسانوں، حیوانوں اور چرند پرند کے علاوہ بعض ایسی مخلوقات بھی پائی جاتی ہیں جو غیر مرئی یعنی نظر نہ آنے والی ہیں۔ اور ان مخلوقات کو قدرت نے اتنا اختیار بھی عطا کیا ہے کہ وہ انسانوں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ چونکہ عام طور پر ہمیں جنوں اور بدروحوں سے واسطہ نہیں پڑتا اور ہم ان کی اصلیت و حقیقت سے پورے طور پر آگاہ بھی نہیں ہیں اس لیے کسی مقام پر بھی ان کی موجودگی ہمارے لیے خوف کا باعث بن جاتی ہے۔ یہ خوف اکثر ذہنوں میں

اتنی شدت سے موجود ہوتا ہے کہ وہ توہم پرست ہوجاتے ہیں اور کسی بھی معمولی واقعے کو اپنی توہم پرستی سے غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔

اس توہم پرستی کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ کمزور اعصاب کے مالک ہوتے ہیں۔ چونکہ عورتوں کے اعصاب مردوں کے مقابلے میں کمزور ہوتے ہیں اس لیے وہ توہم پرست زیادہ ہوتی ہیں۔

پس پتہ یہ چلا کہ اگر اعصاب مضبوط ہوں اور ہر حالت میں ہم اپنے ہوش و حواس پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو ہم اس نامعلوم کے خوف پر باآسانی سے قابو پا سکتے ہیں جو اکثر اوقات ہمارے لیے پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔

آنکھ مچولی خوفناک نمبر کے لیے نیو کراچی کے اشتیاق احمد کا ایک خوفناک تحفہ...

کون کیا کھیل رہا ہے... بتائیے تو سہی!

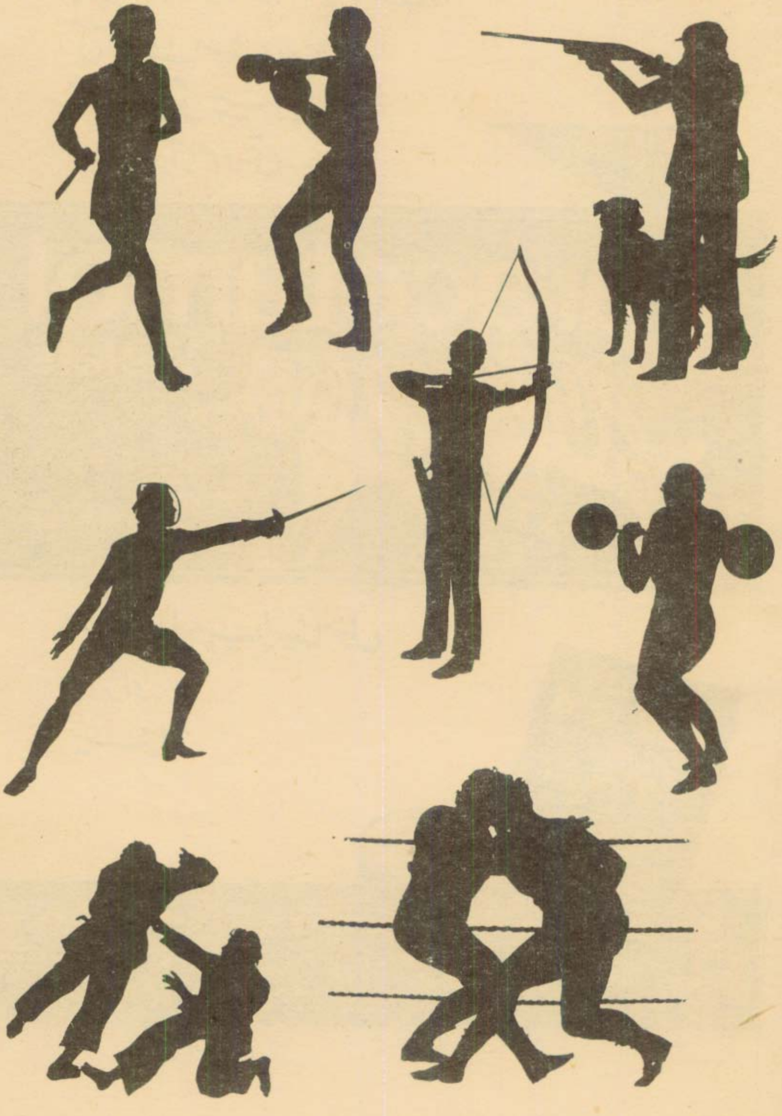

جب درد، نزلہ، زُکام یا بخُار
کی تکلیف شدید ہو تو
نکولس کی پیراسیٹامول
جلد آرام دیتی ہے۔
Nicholas
Paracetamol
Tablets
500 mg
شیر والی پیراسیٹامول
مؤثر اور
تیز اثر
Manufactured by
Aspro-Nicholas, SITE, Karachi
Paracetamol
Tablet
500 mg
For Pain & Fever
1-2 Tablets every 4 hours
Mfg. Lic No. 000027
Regn. No. 001657
Manufactured by
Aspro-Nicholas, SITE, Karachi
N
ہمیشہ نِکولس کی اصلی شیر والی پیراسیٹامول
لیجئے۔ نقلی گولی سے ہوشیار
پیراسیٹامول خالی پیٹ یا بد ہضمی میں نہ لیں۔ بچّوں سے دُور رکھیں۔
طبیعت زیادہ خراب ہو تو ڈاکٹر سے رجوع کریں۔
A-9-84
ASIATIC

ہمارا آسیبی گھر

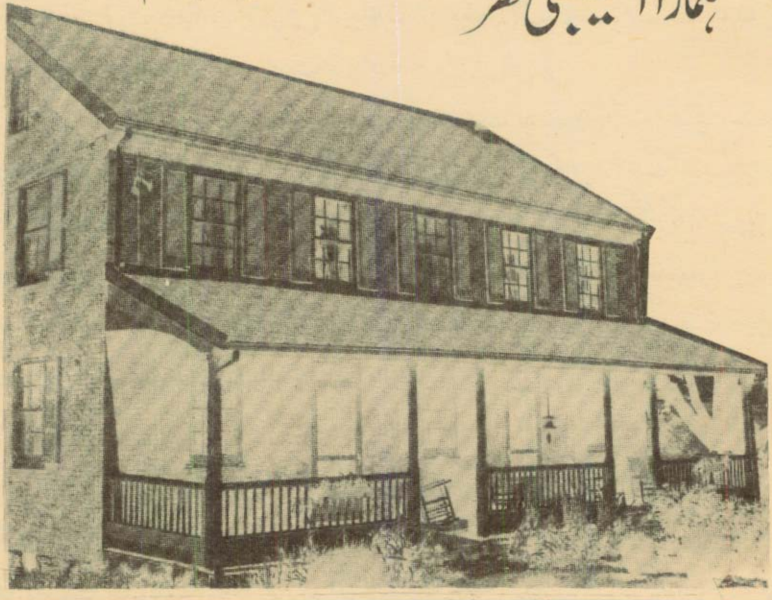

ایک امریکی ادیب کی سرگزشت، جو نادیدہ آسیب سے ڈر گیا

ھم لوگوں کو کیلی فورنیا کے نواح میں بیورلی ہلز میں نیا مکان لیے چند روز ہوئے تھے یہ بہت خوبصورت مگر پُرانے طرز کا بنا ہُوا مکان تھا۔ سرسبز درختوں سے ڈھکا ہُوا یہ مکان مجھے اور میری بیوی ایلک (ELKE) کو اتنا پسند آیا کہ ہم نے اُسے فوراً خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارا مکان آبادی سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ ایک دن ہم نے بیورلی ہلز کے ایک ڈاکٹر ایڈ مِتھ ڈالفیلڈ اور ان کی بیگم کو شام کی چائے پر مدعو کیا۔

چائے پیتے ہوئے اچانک مسز ڈالفیلڈ نے ہم سے پوچھا۔

"کیا وہ شخص یہاں سے چلا گیا؟"

"کون سا شخص؟" ایلک نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہی جو کبھی لان میں چہل قدمی کرتا تھا اور کبھی ڈائننگ روم میں" مسز ڈالفیلڈ نے جواب دیا۔

[illegible] سفید قمیص، سیاہ پتلون اور ٹائی میں ملبوس نظر آتا تھا۔ مگر [illegible] ہوتے ہوئے ہم دونوں میاں بیوی نے اس بات کو بالکل بھی اہمیت نہ دی اور اُسے مذاق میں ٹال دیا۔

مگر دو ہفتوں بعد ہی ایک عجیب واقعہ رونما ہُوا۔ میرا ایک دوست ہمارے ہاں ایک رات قیام کے لیے آیا۔ گیسٹ روم میں رات کو اچانک اس کی آنکھ کھُلی تو اُس نے ایک شخص کو اپنے بستر کے کنارے کھڑا ہُوا دیکھا۔ جو اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ غائب ہوگیا۔ میرے دوست نے اُس شخص کا جو حلیہ بیان کیا وہ بالکل مسز ڈالفیلڈ کے بیان کے مطابق تھا۔ میرا دوست خوف کے عالم میں بغیر ناشتہ کیے واپس چلا گیا۔ اگلی رات سے پُراسرار سرگرمیوں کا آغاز ہوگیا۔ ہم جب سونے کے لیے اُوپر کی منزل پر چلے جاتے تو نیچے سے کرسیوں کے کھسکانے اور کسی کے چلنے کی آہٹ سُنائی دینے لگتی۔ مگر ہم میاں بیوی نے ان تمام باتوں پر دھیان نہ دیا۔

ایک دن ٹیلی فون پر ہمیں یہ پیغام ملا کہ ایلک کی والدہ بیمار ہیں چنانچہ ایلک اُسی شام اپنی والدہ کے پاس دوسرے شہر چلی گئی۔ اب میں گھر میں اکیلا تھا۔ مگر تمام تر تنہائی کے باوجود میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میں گھر میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے آس پاس کوئی اور بھی ہے۔ رات کو اپنی خوابگاہ میں جانے سے پہلے میں نے تمام دروازے اور کھڑکیاں احتیاط سے بند کیں۔ مگر اگلی صبح یہ دیکھ کر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب میں نے تمام دروازے اور کھڑکیوں کو کھُلا ہوا پایا۔ اگلی رات پھر ڈائننگ روم میں کرسیوں کو کھسکانے اور چلنے کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ میں نے خاموشی سے میز کی دراز سے ریوالور نکالا اور دبے پاؤں سیڑھیاں اُترنے لگا۔ ڈائننگ ہال میں تاریکی تھی مگر کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دے رہی تھی۔ میں بڑی احتیاط سے اندر داخل ہُوا اور ایک جھٹکے سے بجلی کا سوئچ آن کر دیا۔ مگر کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہونے اور کپکپانے کا احساس ہُوا۔ میں نے اپنا دل مضبوط کر کے پورے گھر کی تلاشی لی مگر مجھے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ ایک انجانے خوف سے میرا سارا بدن کانپنے لگا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے اُوپر اپنے کمرے میں پہنچا اور بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ رات بھر مجھے ڈراؤنے خواب نظر آتے رہے۔ مگر اگلی تین راتوں میں نہ تو کوئی آواز سُنائی دی اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی پُراسرار سرگرمی نظر آئی۔ چوتھے دن ایلک واپس آگئی۔ میں نے اُسے تمام باتیں بتادیں۔ میرا خیال تھا کہ اتنی خوفناک باتیں سُننے کے بعد اُس کا رنگ پیلا پڑ جائے گا اور وہ خود پہلی فرصت میں مکان

...ری کی انتہا نہ رہی جب اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔
...م آسیب اور بھوت پریت پر یقین رکھتے ہو؟ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتی کہ اس ...سیب ہوگا۔ یہ سب تو توہم پرستی کی باتیں ہیں۔"

ایلک کی باتیں سُن کر مجھے احساس ہوا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے، لیکن اپنا شک دُور کرنے کے لیے میں نے ایک فیصلہ کیا اور اگلے دن اس خاندان سے ملا جس سے ہم نے یہ مکان خریدا تھا۔ باتوں باتوں میں مَیں نے یونہی آسیب، کا ذکر چھیڑ دیا۔ خاندان کے سربراہ مسٹر پیٹر نے بڑے زور سے قہقہہ مارا اور کہنے لگے

"ہم لوگ ڈھائی برس اس مکان میں رہے۔ مگر اس لمبے تڑنگے آسیب سے ملنے کی حسرت ہی رہی اور ملاقات تو چھوڑیے جی! ہمیں تو کسی قسم کی پُراسرار آواز بھی سُنائی نہیں دی۔"

"مگر آپ نے وہ مکان کیوں بیچ دیا" میں اپنے شُبے کو اُن پر ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میری بات سُن کر مسٹر پیٹر اُداس ہو گئے۔

"بھئی مکان تو ہم کبھی نہ بیچتے مگر کچھ معاشی مسائل کا سامنا تھا۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ مکان کو بیچ کر کوئی چھوٹا موٹا فلیٹ لے لیا جائے۔ اس مکان سے ہماری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ ہمیں بھی مکان کے

آسیب کے بارے میں ڈاکٹر ڈالفیلڈ نے ہی بتایا تھا۔"
اب مجھے خیال آیا کہ ہمیں بھی ڈاکٹر ڈالفیلڈ اور ان کی بیگم نے ہی آسیب کے بارے میں بتایا تھا۔ واپس گھر آتے ہوئے رات ہو چکی تھی۔ دُور سے گھر بہت ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آیا واقعی ہمارا گھر آسیب زدہ ہے یا محض لوگوں نے اس کے بارے میں داستانیں مشہور کر رکھی ہیں۔ گھر پہنچ کر میں نے ایلک کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے میری بات غور سے سُنی اور پھر عجیب پُراسرار لہجے میں بولی۔
"مسٹر پیپر جھوٹ بولتے ہیں۔ اس گھر میں آسیب موجود ہے۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے اُسے خود دیکھا ہے۔ اپنی آنکھوں سے۔"
ایلک کی یہ بات میرے لیے ایک دھماکے سے کم نہ تھی۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا مگر اُس نے میری طرف سے نگاہیں پھیر لیں اور ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔
"کھانا نکل چکا ہے۔ آکر کھا لو۔" اس نے کہا۔ مجھے خیال آیا، کہیں ایسا تو نہیں کہ آسیب کا اثر ایلک پر ہو چکا ہو۔ یہ خیال آتے ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ مجھے ایلک کا پُراسرار انداز اور اس کا مجھ سے بغیر نظر ملائے ڈائننگ روم کی طرف بڑھ جانا اب سمجھ میں آنے لگا تھا۔ میں اپنے خیالوں میں مگن تھا کہ اُس نے مجھے پھر کھانے کے لیے پکارا۔ ایلک نے کھانا بہت مزیدار بنایا تھا۔ مگر میں نے بڑی بے دِلی سے چند لقمے زہر مار کیے۔ برتن سمیٹنے کے بعد ایلک میرے پاس آئی اور بولی: "آسیب کے آنے کا وقت ہو چکا ہے اگر تم اُسے دیکھنا چاہتے ہو تو گھر کی ساری روشنیاں گل کر دو۔" یہ سُن کر جیسے مجھ پر کسی نے جادو کر دیا۔ میں نے بغیر کچھ کہے گھر کی تمام روشنیاں بجھانی شروع کر دیں۔ احتیاطاً میں نے اپنا ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں اور ایلک ڈائننگ روم سے متصل کمرے میں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔
"کسی قسم کی آہٹ ہوتے ہی مت کھڑے ہو جانا۔ وہ اندر آکر تھوڑی دیر ڈائننگ روم میں ہی رُکے گا۔"
ایلک کی اس بات سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ نیم تاریکی میں مجھے صرف ایلک کی چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک ڈائننگ روم میں کسی کے قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔ میں آنکھیں پھاڑے ایلک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈائننگ روم میں قدموں کی آواز صاف سُنائی دینے لگی تھی۔ اچانک ایلک نے میرا ہاتھ تھاما اور ڈائننگ روم کی طرف لے چلی۔ میرا دل چاہا کہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلوں۔ مگر میری قوتِ ارادی جواب دے چکی تھی۔ میں اس کے ساتھ سحر زدہ

انداز میں چلتا رہا۔ وہ ڈائننگ روم کے دروازے پر رُکی اور پھر ہاتھ بڑھا کر اُس نے بجلی کا سوئچ آن کر دیا۔

"مائی گاڈ!" میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ آٹھ دس خرگوش ڈائننگ روم کے فرش پر جمع تھے۔ روشنی اور ہماری آہٹ ہوتے ہی وہ اُچھل کر مشرق کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے باہر نکل گئے۔ میں بھی تیزی سے اُسی طرف لپکا۔ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ جس سے خرگوش نکل بھاگے تھے۔

"درختوں کی کھوہ میں رہنے والے یہ خرگوش ہی ہمارے گھر کا آسیب ہیں۔" ایلک نے کہا۔ اب سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اپنا پسینہ صاف کیا، مگر ایک اُلجھن مجھے پریشان کر رہی تھی۔ ہمارا دوست جو ایک رات قیام کے لیے آیا تھا اس نے تو کسی انسان کا سایہ دیکھا تھا تو پھر یہ سب کچھ کیا تھا! میں نے اپنی یہ اُلجھن ایلک کو بتائی تو وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی۔

"تم نے ہی اُسے گھر کے متعلق اور خصوصاً آسیب کے بارے میں بتایا تھا۔ رات کو کسی وجہ سے آنکھ کھُل جانے پر اُس کے لاشعور نے اُسے وہی کچھ دکھایا جو وہ تم سے سُن چکا تھا۔ یوں بھی پُرانے طرز کے مکانات قلعوں اور باغات کے بارے میں اس قسم کی افواہیں مشہور ہوتی ہیں۔ اور پھر اس موضوع پر بے شمار قصّے کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ بے شمار فلمیں بھی بَن چُکی ہیں۔ اُن کتابوں اور فلموں نے ہی لوگوں کے ذہنوں میں عجیب و غریب خیالات پیدا کر دیے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کا دنیا سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔"

ایلک کی لمبی چوڑی تقریر سُننے کے بعد میں اس بات کا قائل ہو چکا تھا کہ واقعی ہمارا گھر آسیب زدہ نہیں ہے۔ تاہم میں نے اس سے کہا۔

"اس کھڑکی میں شیشہ لگنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ جن آسیبوں کو ہم نے دیکھا ہے وہ روزانہ ہمیں یونہی تنگ کرتے رہیں گے۔" ایلک میری بات سُن کر ہنس پڑی۔ اس دِن کے بعد سے "آسیب" نے کبھی ہم لوگوں کو تنگ نہیں کیا۔ مگر مجھے آج بھی لوگوں کے توہمات پر حیرت ہوتی ہے۔ (بشکریہ، ریڈرز ڈائجسٹ۔ دسمبر ۱۹۶۶ء)

بے احتیاطی سے سڑک عبور کرتے والوں کو شرمندہ کرنے کے لیے یہ تصویر کافی ہے

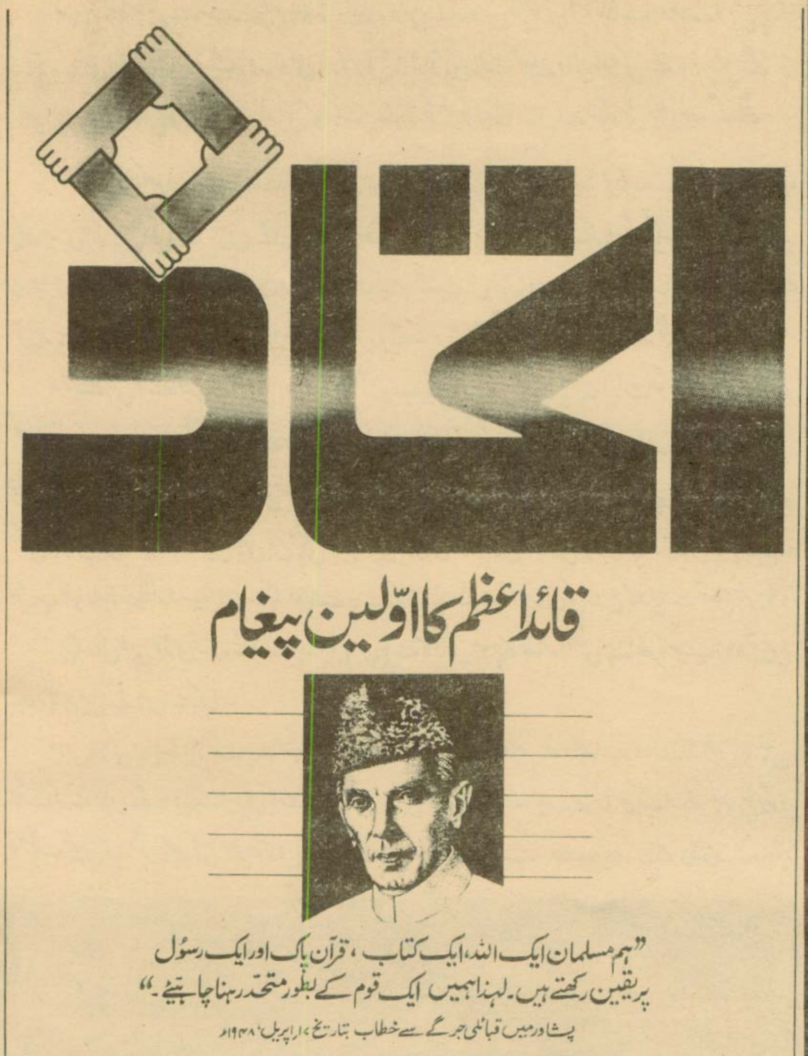

اتحاد
قائداعظم کا اوّلین پیغام
"ہم مسلمان ایک اللہ، ایک کتاب ، قرآن پاک اور ایک رسُول
پر یقین رکھتے ہیں۔ لہذا ہمیں ایک قوم کے بطور متحد رہنا چاہیئے۔"
پشاور میں قبائلی جرگے سے خطاب بتاریخ ۱۷ اپریل ۱۹۴۸ء
PSO پاکستان اسٹیٹ آئل
PID - Islamabad
PARAGON

جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے ۔

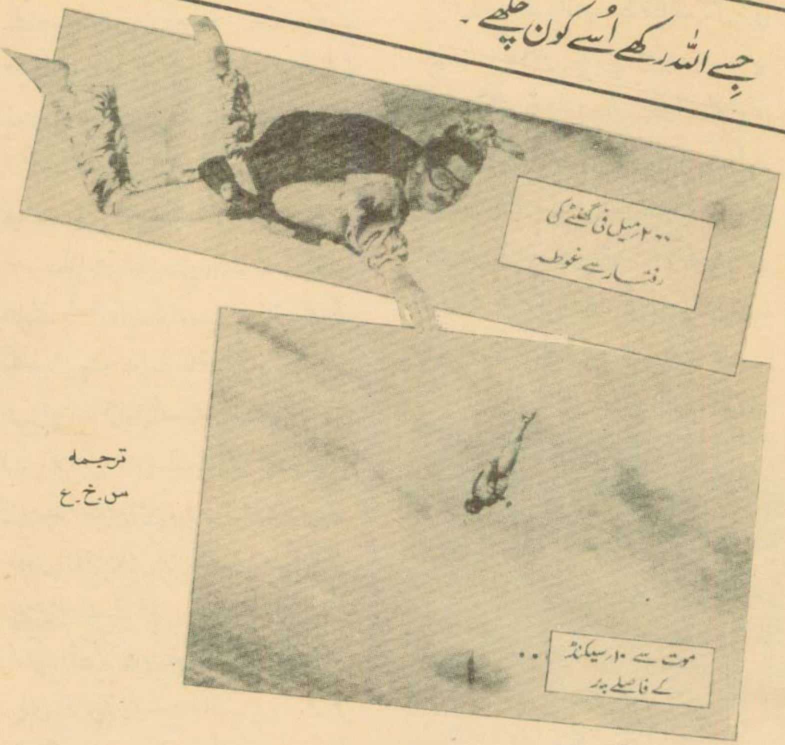

ترجمہ
س۔خ۔ع

فضا میں معجزہ...

ایڈی ٹرنر امریکہ کے ایک مشہور پیراشوٹ جمپر ہیں۔ وہ پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگانے کے کئی مقابلوں میں شریک بھی ہو چکے ہیں۔ ان کی عمر اس وقت ۳۳ برس ہے۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۸ء ایڈی کی زندگی کا ایک انتہائی یادگار مگر خوفناک دن تھا۔ اس دن کا آغاز بھی عام دنوں کی طرح ہوا۔ ایڈی کو اپنے گیارہ ساتھیوں کے ہمراہ فضا سے چھلانگ لگانے کی مشق کرنا تھی۔ کلیوسٹون ایئرپورٹ فلاڈیلفیا سے ان کا جہاز فضا میں بلند ہوا۔ جہاز جب تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر

پہنچا تو وہ چھلانگ لگانے کی پوزیشن میں تیار ہو چکے تھے۔ سب نے باری باری ایک دوسرے کے پیراشوٹ اور کِٹ کا جائزہ لیا۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ چھلانگ لگانے کے بعد وہ سب فضا میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ستارے کا فارمیشن بنائیں گے۔ سب سے پہلے جہاز سے ایڈی نے چھلانگ لگائی۔ پھر باری باری دوسرے افراد بھی جہاز سے چھلانگ لگاتے گئے۔

اسی لمحے بدقسمتی کا آغاز ہُوا۔ سب سے آخر میں چھلانگ لگانے والا اپنے دوسرے ساتھی فرینک سے ٹکرا گیا۔ اس کی اچانک ٹکر جو فرینک کے ہیلمٹ پر لگی اُس نے فرینک کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ وہ انتہائی تیزی سے سَر کے بَل زمین کی طرف آنے لگا۔ اس کے دونوں بازو تیز ہوا میں پرندے کے پروں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ ایڈی نے اُسی لمحے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ "اُسے کچھ کرنا چاہئے"۔ اگلے ہی سیکنڈ میں ایڈی نے بھی فرینک کے تعاقب میں سَر کے بَل غوطہ لگایا اور اپنے دونوں ہاتھ بالکل سیدھے کر کے اپنے جسم سے ملا لیے۔ وہ دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے نیچے آنے لگا تھا۔

اب وہ گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر آ چکا تھا۔ گویا جہاز سے دو ہزار فٹ نیچے۔ فرینک اس سے صرف پانچ فٹ نیچے تھا۔ گزرنے والے ہر پانچ سیکنڈ ان دونوں کو ایک ہزار فٹ نیچے لا رہا تھا۔ ایڈی کی پوری کوشش یہی تھی کہ وہ جلد سے جلد فرینک کے برابر آ جائے۔ وقت انتہائی تیزی سے دونوں کو نیچے پتھریلی زمین کی طرف لا رہا تھا۔ اگلے لمحے میں ایڈی فرینک کے برابر آ گیا۔ اسی دوران ایک اور پیراشوٹ جمپر، جو فرینک سے پہلے جہاز سے کُودا تھا بڑی تیزی سے فرینک کے بالکل نیچے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاکہ وہ اُسے تیز ہُوا کے دباؤ سے روک سکے۔ اُسی لمحے ایڈی فرینک کی بائیں ٹانگ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے بڑی مُشکل سے فرینک کے پیراشوٹ کی رسّی کھول دی۔ فرینک کا پیراشوٹ کُھل گیا اور اس کی رفتار نارمل ہو گئی۔ اگلے دو سیکنڈوں کے بعد ایڈی اپنا پیراشوٹ کھولنے میں کامیاب ہو چُکا تھا۔

اس دوران وہ زمین سے دو ہزار فٹ بلندی پر

فرینک فرنان جسے بچا لیا گیا

پہنچ چکے تھے۔ گویا گرنے کی رفتار سے موت سے صرف دس سیکنڈ پہلے ایڈی نے فرینک اور خود کو بھی موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا تھا۔ گویا بالکل آخری لمحات میں دونوں کے پیراشوٹ کُھلے تھے۔ ورنہ وہ زمین سے بُری طرح جا ٹکراتے۔ گویا دونوں کی موت یقینی تھی۔ بعد میں ایڈی نے بتایا۔۔۔۔

"میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے یہ کام کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔ یہ ایک معجزہ تھا۔"

a great new taste
mayfair
Fruta Chew
Chew it, you'll love it.
Fruta Chew
Fruta Chew
mayfair
– the sweet favourites

انوکھا انتقام

اندھیری رات میں قبرستان
کا تصوّر ھی بھیانک ھوتا ھے

عامر یونس

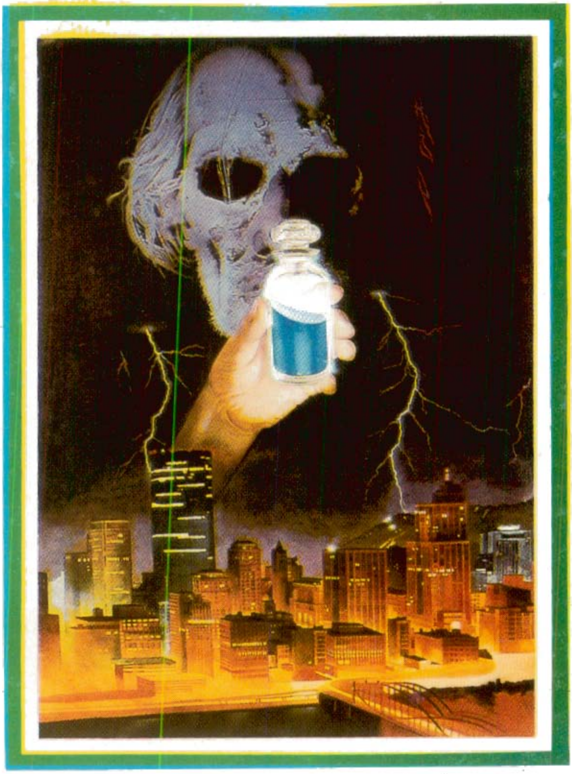

ٹرن، ٹرن، ٹرن ۔ فون کی گھنٹی مستقل بجے جا رہی تھی۔

"اوہ.... سات بج رہے ہیں"، مائیکل ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ فون کی گھنٹی ابھی تک بج رہی تھی۔

"ہیلو...." اُس نے پوچھا

"مائیکل.... تم آج پھر لیٹ ہو۔ اسکول لگنے میں صرف آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے۔ فوراً تیار ہو جاؤ۔"

"اوکے ممی...." مائیکل نے جماہی لی، فون کا ریسیور واپس رکھا اور غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

گھر سے نکلتے نکلتے سات بج کر پندرہ منٹ ہو چکے تھے جب کہ اُس نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ پھر وہ تیز تیز چلنے لگا۔ ویبسٹر ہائی اسکول تیسرے بلاک میں تھا اور اسکول کی بس ... نکل چکی تھی۔ پیدل چلنے

پر تقریباً بیس منٹ کا راستہ تھا۔ اس کو آج ہر حال میں وقت پر پہنچنا تھا۔ وہ پہلے ہی چار روز سے دیر سے جا رہا تھا اور سر رابرٹ اس سے بہت زیادہ تنگ تھے۔۔۔۔ اور ستم ظریفی یہ کہ آج پہلی کلاس سر رابرٹ کی ہی تھی۔

وہی ہُوا جس کا مائیکل کو ڈر تھا۔ جب وہ اسکول کی سیڑھیوں پر پہنچا تو گھڑی میں سات بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ کلاس روم کا دروازہ بند تھا اور اندر سر رابرٹ پڑھا رہے تھے۔ مائیکل نے دروازے میں لگے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ سر رابرٹ اپنی عادت کے مطابق کلاس کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چہل قدمی کرتے ہوئے پڑھا رہے تھے۔ اس وقت اُن کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ مائیکل نے دیکھا اس کی نشست دروازے سے ذرا آگے تھی۔۔۔۔ مگر سر رابرٹ واپس مُڑنے والے تھے۔ لہٰذا وہ ابھی اندر جانے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ جب سر رابرٹ کلاس کے ایک سرے تک جا کر دوبارہ مُڑ گئے تو مائیکل نے آہستگی سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور بغیر آواز پیدا کیے اس کو کھول لیا۔۔۔اس وقت سر رابرٹ دروازے سے آگے جا چکے تھے اب مائیکل کو جو کچھ کرنا تھا فوراً کرنا تھا۔ مائیکل نے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوا اور دروازہ واپس آہستگی سے بند کیا اور جُھک کر آہستہ آہستہ چلتا ہُوا اپنی سیٹ پر پہنچ گیا۔

"مائیکل۔۔۔" اور مائیکل کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ سر رابرٹ کی کرخت آواز نے اس کو اسی حالت میں روک دیا۔۔۔ وہ جُھکا ہُوا تھا جیسے بیٹھنا چاہ رہا ہو۔۔۔۔ پھر رابرٹ مڑے اور اُنہوں نے مائیکل کی طرف دیکھا

"تم آج پھر لیٹ ہو۔۔۔" مائیکل کچھ جواب نہ دے سکا۔

"آج پھر تم نے چپکے سے کلاس میں داخل ہونا چاہا۔۔۔"

مائیکل اس کا جواب بھی نہیں دے سکا البتہ وہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ آخر سر رابرٹ کو یہ کس طرح پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کلاس میں داخل ہوا ہے جبکہ اُن کی کمر میری طرف ہوتی ہے۔

"لہٰذا آج تم کو پھر سزا ملے گی۔۔۔۔"

اور سزا کا سُنتے ہی مائیکل دھپ سے اپنی کُرسی پہ گر پڑا۔ سَر رابرٹ کی سزا بہت سخت ہوتی تھی۔

"سر پلیز سر۔۔۔ آج معاف کر دیں۔۔۔۔ کل سے میں روزانہ وقت پر آجایا کروں گا۔۔۔ میں قسم کھاتا ہوں۔۔۔۔ وعدہ کرتا ہوں۔۔۔" مائیکل گھگھیانے لگا۔

"خاموش۔۔۔ تم کو سزا مل کر رہے گی۔۔۔ آجاؤ بلیک بورڈ کے سامنے۔۔۔ اپنی کتابوں سمیت۔۔۔"

چاروناچار مائیکل کو بات ماننا ہی پڑی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سر رابرٹ کی عجیب و غریب سزا کا شکار

بنا ہوا تھا۔ سزا کے طور پر مائیکل کو اُٹھک بیٹھک کے انداز میں گھٹنے موڑ کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اور اُس کی پیٹھ بھی موڑ دی گئی تھی۔ اب اس کی کمر پر پانچ کتابیں اور ہاتھوں پر دو دو کتابیں رکھ دی گئی تھیں۔ اس حالت میں اُس کو یوں گھنٹہ کھڑا رہنا تھا اور اگر کوئی کتاب گر جاتی تو پانچ عدد بید پڑتے اور ایک کتاب اور بڑھا دی جاتی۔

کلاس ختم ہوئی تو مائیکل سیدھا ہوا۔ اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی اور غصّے سے وہ کپکپا رہا تھا۔

"یار آج تو پھر لیٹ ہو گیا ..." اس کا دوست جیف مارکر قریب آکر بولا۔

"بس جیف اب اس موضوع پر بات نہیں کرنا ... میرا دماغ گھوما ہوا ہے ... ہنہ سر رابرٹ تو بالکل وحشی ہیں۔ کاش .... کاش میں بھی اُنہیں سزا دے سکتا ..." مائیکل مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔

"اچھا دفع کرو ... یہ بتاؤ آج رات فلم کا پروگرام ہے ...؟" جیف موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

"اوہ ... یہ تو میں بھول ہی گیا تھا ... آج رات تو ٹی وی پر زبردست فلم آرہی ہے، یہ بتاؤ تم میرے گھر آرہے ہو؟"

"تمہاری دعوت میں کیسے ٹھکرا سکتا ہوں" جیف نے کہا۔

"اوکے ... تم گھر سے دو تین کیسٹ لے آنا ... پہلے ہوم ورک مکمل کریں گے اور پھر فلم ..."

اسکول کا باقی وقت آرام سے کٹ گیا۔ واپسی پر مائیکل نے اپنی امّی کے لیے خریداری کی اور پھر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

"یار جیف ... کبھی تمہارا دل بھی انتقام لینے کے لیے تڑپتا ہے ..."

مائیکل نے چھت کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ وہ اور جیف رات کو فلم دیکھنے کے بعد اس کے کمرے کے فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔

"یہ انتقام کہاں سے آگیا ..." جیف نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ابھی ہم نے جو فلم دیکھی ... اس میں ہیرو کس طرح انتقام لیتا ہے ... میں سوچ رہا تھا کہ آخر ہم بھی تو انتقام لے سکتے ہیں ..."

"اوہ ... اب سمجھا ... سر رابرٹ کی سزا سے اب تک جلے بھنے ہو ..." جیف نے ہنستے ہوئے کہا۔

"شاید ... یہ کہاں کا انصاف ہے کہ پانچ دس منٹ لیٹ ہونے پر اس طرح کی سزا دی جائے ... میرا دل چاہتا ہے کہ سر رابرٹ کو بھی میں سزا دوں اور پھر اُن کو پتا چلے کہ ہمیں کس طرح محسوس ہوتا ہے" مائیکل

دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

"جیف ... اوئے جیف ... کیا سو گئے ...؟"

"نہیں یار ... پتا ہے میرے ذہن میں ایک بہت عجیب خیال آیا تھا ..." جیف نے کہا۔

"کیا خیال آیا ہے؟"

"بہت ہی عجیب خیال ہے ... تمہیں پتا ہے کہ ہم پہلے کرائے کے گھر میں رہتے تھے ... وہیں ایک بوڑھی جیسی عورت بھی رہتی تھی ... بہت پُراسراری عورت تھی - ہاتھ وغیرہ دیکھا کرتی تھی - مجھے اس سے ملنے کا بھی بہت شوق تھا۔ اور میں اس سے ڈرتا بھی بہت تھا۔ ایک روز جب وہ گھر میں نہیں تھی۔ میں اُس کے گھر میں چپکے سے کود گیا۔ وہاں عجیب و غریب چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ کھوپڑیاں .. نقشے... رنگ برنگی بوتلیں ... اور بہت ساری کتابیں - میں یوں ہی اُن کو دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک کتاب پر میری نظر پڑی۔ اس پر سیاہ غلاف چڑھا ہوا تھا - اور اس کے اُوپر تیرہ ستارے بنے ہوئے تھے - میں نے اس کو اُٹھایا ہی تھا کہ وہ بڑھیا آگئی - میں نے فوراً دیوار پر چڑھ کر چھلانگ لگا دی اور گھر آگیا - پتا ہے کیا... وہ کتاب میرے ہاتھ میں ہی تھی - میں نے اُس کو چھپا دیا - پھر کئی روز بعد میں نے اُس کو کھول کر دیکھا - پتا ہے وہ کس چیز کی تھی ...؟"

"ہاں ... کھانا پکانے کی ..." مائیکل نے کہا اور ہنسنے لگا -

"اُفوہ ... تم بھی مذاق بھونڈا کرتے ہو ... احمق ... اس کتاب میں جادو کے منتر لکھے ہوئے تھے ..."

"کیا ..." مائیکل اُچھل پڑا ...

"بیچ مچ ... عجیب عجیب منتر لکھے ہوئے تھے - میں کتاب پڑھ کر ڈر گیا - میں نے اُس کو واپس پھینکنے کا ارادہ کر لیا تھا - مگر پھر ہم یہاں آ گئے ..."

" اور وہ جادُو کی کتاب اب بھی تمہارے پاس ہے ؟"

" ہاں ... اور اس میں ایک منتر ہے . وہ منتر ہے انتقام کے بارے میں ..." جیف نے کہا مائیکل جس حالت میں تھا اُسی طرح بیٹھا رہ گیا - خوف کی ایک لہر اُس کی ہڈیوں میں سرایت کر گئی -

" تم نے کیا کہا جیف ... ؟"

" میں نے کہا ہے کہ اس کتاب میں ایک منتر انتقام لینے کے لیے بھی تھا ."

" اور اب تم چاہتے ہو کہ ..." مائیکل نے بات ادھوری چھوڑ دی -

" ہاں ... کیوں نہ ہم وہ منتر سر رابرٹ پر آزما کے دیکھیں ..."

جیف کے ان الفاظ نے مائیکل کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا دی -

" نہیں نہیں ... میں اتنا پاگل بھی نہیں ہُوا ... کہ ... کہ منتر پڑھ کر سر رابرٹ سے انتقام لوں ... اور ... اور پھر یہ جادو وادو سب بکواس ہے ... میں ... میں نہیں مانتا ."

مائیکل نے کہا - اس کے لہجے میں کپکپاہٹ نمایاں تھی -

" مانتا تو میں بھی نہیں ... اس لیے کہہ رہا ہوں ... کیوں نہ یہ کر کے دیکھیں ... آخر اس میں کیا حرج ہے "

اس رات جیف مائیکل کو قائل کر کے ہی سویا -

چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور کیوں نہ ہوتی - آج چودھویں کی شب جو تھی - پورا چاند نکلا ہوا تھا اور کتاب میں یہی لکھا ہُوا تھا کہ انتقام والا منتر پورے چاند کی آدھی رات کو پورا کیا جائے -

جیف اور مائیکل دونوں شہر کے قبرستان کی طرف جا رہے تھے اُنہوں نے جیکٹیں پہنی ہوئی تھیں کیونکہ سردیاں شروع ہو گئی تھیں اور رات ٹھنڈی ہو جاتی تھی - جیف نے ہاتھ میں ایک بیگ پکڑا ہُوا تھا - اس بیگ میں وہ سامان تھا جو انھوں نے پچھلے ہفتے کے دوران اس کتاب کے مطابق منتر پورا کرنے کے لیے جمع کیا تھا . ایک مُردہ کوّا ، مُردہ چمگادڑ ، سرخ موم بتی ، خون کی بوتل وغیرہ -

چلتے چلتے مائیکل کے قدم ڈگمگائے - اُسے اپنا حلق بالکل خشک محسوس ہو رہا تھا . اور وہ بار بار تھوک نگلنے کی کوشش کر رہا تھا -

جب دونوں قبرستان تک پہنچے ہیں تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ہُو کا عالم تھا اور ایسا گہرا سناٹا طاری تھا کہ دونوں کو اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بھی سُنائی دے رہی تھی۔

"جلدی کرو... ہمیں عین بارہ بجے منتر پورا کرنا ہے..." جیف نے مائیکل کو دھکا دیتے ہوئے کہا جو کہ قبرستان کے سامنے جم کر رہ گیا تھا۔

"یار... کیا خیال ہے... ہم یہ منتر آئندہ مہینے نہ کرلیں..؟" مائیکل نے کہا۔

"کیا... اگلے مہینے... فضول باتیں نہ کرو... ہمیں یہ منتر آج ہی پورا کرنا ہے..." جیف نے کہا اور مائیکل کو ہاتھ سے پکڑ کر قبرستان کے اندر گھسیٹ لیا۔

"آؤؤؤؤ... ہاہاہاہا..."

"آآآآآآآآہ..." دونوں کی چیخ نکل گئی۔ وہ آواز تھی ہی ایسی جو ایک دم سناٹے میں دونوں کا کلیجہ چیرتی ہوئی چلی گئی تھی۔

"یہ... یہ... یہ کیا تھا...؟" مائیکل نے کپکپاتے ہوئے کہا۔ وہ جیف کے پیچھے چھُپا ہوا تھا۔

"شاید... کوئی اُلّو ہوگا... اُسی کی آواز ایسی ہوتی ہے..." جیف نے دلاسا دیا۔

"تمہیں یقین ہے کہ اُلّو کی آواز ایسی ہی ہوتی ہے؟" مائیکل نے پوچھا۔

"ہاں ہاں ہاں... اب بچوں کی طرح ڈرنا چھوڑو اور چلو... ہمیں دیر ہو رہی ہے..." جیف نے جھلّا کر مائیکل کو کھڑا کیا اور گھسیٹنے لگا۔ دونوں قبروں کے درمیان سے ہوتے ہوئے چل رہے تھے۔

"ہمیں پُرانی قبر ڈھونڈنی ہے... اس کے اندر ہی مُردہ ہڈیوں کی حالت میں ہوگا..."

جیف نے کہا اور مائیکل نے سر ہلا دیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے ہاتھ اور بقیہ جسم بھی ہل رہا تھا... کپکپا رہا تھا... دونوں چلتے چلتے قبرستان کے اُس حصّے میں پہنچ گئے جہاں کہ قبروں کی بہت خستہ اور خراب حالت تھی۔ ظاہر تھا کہ یہ قبریں بہت پُرانی تھیں۔ اور اُن میں موجود مُردے یقیناً اب تک ہڈیوں کی شکل میں پہنچ گئے ہوں گے۔ چلتے چلتے جیف رُک گیا۔

"کیا ہُوا...؟" مائیکل کی لرزتی ہوئی آواز نکلی۔

"میرے خیال میں ہم ایک پُرانی قبر کے پاس پہنچ چکے ہیں... میں ٹارچ جلا رہا ہوں۔"

ٹارچ کی روشنی میں اُنہوں نے دیکھا۔ قبر آدھی اندر دھنس چکی تھی اور قبر پر لگا ہوا کتبہ بھی تھوڑا ٹوٹ گیا تھا۔ اور گرنے لگا تھا۔ جیف نے ٹارچ کی روشنی کتبے پر ڈالی۔

"مسٹر رالف کینیڈی مرحوم ... ۱۹۲۳ء سے ۱۹۸۵ء ..." جیف نے کتبہ پڑھا۔
"چلو مائیکل اندر کودنے کے لیے تیار ہو جاؤ ..."
"کیا ...؟ مائیکل چونک اُٹھا ..." قبر کے اندر کُودیں گے ..."
"اور کیا قبر کے ایک طرف سے دوسری طرف چھلانگیں لگائیں گے کیا ...؟"
"مگر ...؟"
"مگر وگر چھوڑو ... ہمارے پاس وقت کم ہے ... چلو کودو ..." اور جیف نے چھلانگ لگا دی۔ اُس نے مائیکل کا ہاتھ پکڑ رکھا لہٰذا وہ بھی اس کے پیچھے ہی کود گیا۔ دونوں تھوڑی دیر قبر میں بیٹھے رہے ... مائیکل کی حالت خراب تھی۔
"چلو اب بیگ سے کھودنے کے لیے اوزار نکالو ..." جیف نے کہا۔ مائیکل نے بیگ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا اور باہر نکال کر جیف کو سامان پکڑا دیا۔ جیف نے ٹارچ روشن کی اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیز سے قبر کی مٹی ہٹانی چاہی۔
"آآآآآآآآآآآآہ ..." جیف نے زوردار چیخ ماری۔
"آآآآآآآآآآہ ..." مائیکل نے بھی جواب میں چیخ ماری۔
"بے وقوف ... پاگل ... یہ سیاہ چمگادڑ کیوں پکڑا دی ..." جیف نے مائیکل کو ڈانٹا۔
"سیاہ چمگادڑ ... اللہ بچائے ... میں کیا کروں ... ٹارچ تمہارے پاس ہے ... مجھے کیا پتا تھا کہ ... کہ ... سیاہ چمگادڑ کو ہاتھ میں پکڑ لوں گا ..." مائیکل نے کہا اور پھر اپنے ہاتھوں کو زور زور سے اپنی جینز پر رگڑ کر صاف کرنے لگا۔
"تم تو بالکل بے وقوفوں جیسی حرکت کر رہے ہو ... لاؤ بیگ مجھے دو ..." جیف نے بیگ مائیکل سے لے لیا۔ پھر اس نے چمگادڑ واپس ڈالی اور مٹی ہٹانے کے لیے کھرپی نکال لی۔ پھر اُس نے ٹارچ مائیکل کو پکڑائی اور مٹی ہٹانے لگا۔
"مائیکل! ٹارچ کو ایک جگہ رکھو ..." جیف نے کہا۔
"کیا کروں یار یہ ہلتی بہت ہے ..." مائیکل نے کہا اور جیف مائیکل کو غصے سے گھور کر رہ گیا۔ مٹی ہٹاتے ہٹاتے اُس کی کھرپی کسی سخت چیز سے ٹکرائی۔ جیف اس سخت چیز کے اِردگرد کی مٹی ہٹانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ڈھانچہ ان کے سامنے تھا۔

"اب اس کی کھوپڑی الگ کرنی ہے... کیوں مائیکل... تم کرلوگے یہ کام..." جیف نے مذاقاً کہا اور ہنسنے لگا۔ اس نے ہاتھوں سے کھوپڑی کو بقیہ ڈھانچے سے علیحدہ کرنا چاہا... مگر ناکام رہا۔ پھر اُس نے کھُرپی سے تین چار وار کیے۔ اور ڈھانچے کا سر یعنی کھوپڑی علیحدہ ہوگئی۔ جیف نے وہ کھوپڑی جلدی سے بیگ میں ڈال لی۔

"اب ہمیں قبر کی مٹی چاہیے..." مائیکل نے کہا۔

"ہاں... چلو اس تھیلی میں مٹی بھرو..." جیف نے ایک تھیلی کھولتے ہوئے کہا اور دونوں مٹی بھر بھر کر اس تھیلی میں ڈالنے لگے۔

"کافی ہے... چلو مائیکل... اب منتر پورا کرنے کا وقت آن پہنچا..." جیف نے بیگ ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے کہا۔ اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ مائیکل اس سے پہلے ہی قبر سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"چلو اب تم دونوں جلدی سے بھاگ جاؤ... شاباش... مجھے اپنی ڈرنک پوری کرنی ہے..."

پیچھے سے آواز آئی اور دونوں نے چونک کر دیکھا اُنھیں بس اندھیرے میں ایک آدمی کا سایہ نظر آیا۔ اور ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ چیخیں مارتے ہوئے جو دونوں بھاگے ہیں تو انھوں نے قبرستان سے باہر سڑک پر آکر ہی دَم لیا۔

"یہ... یہ... کک... کون تھا..." مائیکل نے ٹکڑوں میں بولتے ہوئے پوچھا۔

"یہ... یہ ضرور... گورکن ہوگا..." جیف نے ممکنہ توجیہہ پیش کی۔

"اگر یہ مُردہ بھی ہوتا تب بھی اس کو کس نے مشورہ دیا ہے کہ اس طرح قبرستان میں چپکے سے کسی کے پیچھے جاکر اُس کو ڈرایا جائے... ہنہہ..." مائیکل نے غصّے میں آکر کہا۔

"خیر... چھوڑو... اب بارہ بجنے میں صرف دس منٹ ہیں... ہمیں فوراً سر رابرٹ کے مکان تک پہنچنا ہے..." جیف نے کہا اور دونوں سر رابرٹ کے گھر کی طرف دوڑنے لگے۔ ان کا قصبہ تھا ہی چھوٹا سا لہٰذا اُنھیں سر رابرٹ کے مکان تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔

"دیکھو مائیکل کوئی نہ کوئی کھڑکی کھُلی ہوگی... ہمیں یہ منتر ان کے کمرے میں پورا کرنا ہے۔"

مائیکل کھُلی ہوئی کھڑکی کی تلاش میں نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں باورچی خانے کی کھڑکی سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

"چلو اچھا ہے ہم باورچی خانے میں ہیں... یہاں ہم کتاب سے پڑھ کر دیکھ لیں کہ اب ہمیں کیا کیا کرنا ہے..." جیف نے بیگ سے وہ کتاب نکالی اور دونوں ٹارچ کی روشنی میں وہ منتر پڑھنے لگے۔

"ایک برتن میں ہڈیوں کا چُورا اور سیاہ چمگادڑ اور سیاہ کوّا ڈال دو... پھر ان کے اُوپر ہلکی ہلکی قبر کی مٹی ڈالو... اس کے بعد اس میں خون چھڑک دو اور مُردے کی کھوپڑی کے منہ میں سُرخ موم بتی ٹھونس کر اس کو روشن کردو۔ اس کے بعد یہ منتر پڑھو اور آخر میں برتن میں آگ لگا دو... تمہارا انتقام پُورا ہو جائے گا۔"

جیف نے تمام ہدایات پڑھ لیں پھر اُس نے برتن ڈھونڈا۔ اس میں تمام چیزیں ڈال دیں۔ کھوپڑی کے منہ میں موم بتی ٹھونس دی اور ماچس اور کتاب لے کر وہ سر رابرٹ کا کمرہ ڈھونڈنے لگے۔ بارہ بجنے میں صرف دو منٹ باقی تھے اور اُنھیں سَر رابرٹ کا کمرہ نہیں مل رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اُنہیں پہلی منزل پر ایک کمرے میں سر رابرٹ سوتے ہوئے مل گئے۔

مائیکل نے جلدی جلدی برتن زمین پر رکھا۔ جیف نے کھوپڑی اس کے ساتھ رکھی اور دھڑکتے دل کے ساتھ موم بتی روشن کر دی۔ سرخ موم بتی کے شعلے میں پورا کمرہ ہیبت ناک لگ رہا تھا' اُوپر سے سر رابرٹ کے خرّاٹے بھی خرخراہٹ سے کم نہیں تھے۔ ایسی خرخراہٹ جو کہ کسی کے گلا کٹتے وقت پیدا ہوتی ہے۔

"بارہ بج گئے مائیکل... چلو منتر پڑھو... اور دونوں آہستہ آہستہ منتر پڑھنے لگے۔

مائیکل اور جیف منتر پڑھنے کے بعد ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پھر جیف نے ماچس نکالی... اس کو جلایا مگر وہ بُجھ گئی... دُوسری ماچس نکالی... اس کو جلایا... اور برتن کے اندر ڈال دیا...

اُسی وقت آسمان پر بجلی زور سے کڑکی اور برتن میں سے آگ بھڑک اُٹھی اور گھبراہٹ میں کھوپڑی اور موم بتی بھی اُسی برتن میں مائیکل کے ہاتھ سے گر پڑی

"کھٹ" کی آواز آئی اور پھر سناٹا طاری ہو گیا۔ برتن کی آگ بُجھ گئی تھی۔ دونوں کے چہرے فق تھے۔ اور دل دھڑکنا بھُول گئے تھے۔ ان کی آنکھیں یک ٹک سر رابرٹ کو ہی گھورے جا رہی تھیں جو کہ ویسے ہی اپنے بستر پر سو رہے تھے۔ اسی طرح اُنہیں کئی منٹ گزر گئے۔

"دیکھا..." جیف نے تھوک نگل کر کہا... "میں نہ کہتا تھا یہ سب کچھ فضول ہے... کچھ بھی نہیں ہوا..."

"ہاں... کچھ بھی تو نہیں ہُوا..." مائیکل نے بھی کہا۔ جیف اُٹھ کر سر رابرٹ کی طرف بڑھ گیا۔ مائیکل بھی ڈرتے ڈرتے اُس کے پیچھے آگیا۔ دونوں سر رابرٹ کے بستر کے قریب پہنچ گئے۔

"یہ لو... یہ تو آرام سے لیٹے ہوئے ہیں... ہنہ..." جیف نے کہا۔ "واقعی..." مائیکل نے بھی کہا۔

اسی وقت سر رابرٹ نے آنکھیں کھول دیں... اور پھر "آآآآآآآآآآآآآآ ooooo..."

دونوں اس قدر زور سے چیخے کہ شاید اپنی زندگی میں کبھی نہ چیخے ہوں گے۔ سر رابرٹ کا دھڑ اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا... اور ان کا سر تکیے پر پڑا پلکیں جھپکا رہا تھا۔ منتر پڑھنے میں غلطی ہو گئی تھی۔

اسی لمحے سر رابرٹ کا بے سر کا دھڑ اُٹھ بیٹھا۔ ان کے ہاتھ نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا۔
"تم... تم دونوں نے مجھے قتل کرنا چاہا ہے... اب میں تم کو نہیں چھوڑوں گا..."
سر رابرٹ کے کٹے ہوئے سر میں سے آواز نکلی اور مائیکل اور جیف چیختے ہوئے پلٹ کر بھاگے...
سر رابرٹ کا دھڑ اپنی ہتھیلی پر اپنا سر رکھے ان کے پیچھے آرہا تھا۔

جیف اور مائیکل کا دہشت کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ سیڑھیوں پر سے لڑھکتے ہوئے نیچے اُترے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ بند تھا۔ دہشت کے مارے لاک بھی اُن سے بڑی مُشکل سے کھلا۔ اس وقت تک سر رابرٹ کا دھڑ بمعہ اپنے کٹے ہوئے سر کے ان کے قریب آچکا تھا۔ مائیکل نے دروازہ پوری طاقت سے کھولا اور جیف کو دھکا دیتا ہُوا باہر نکلا۔ دونوں سر رابرٹ کے گھر سے باہر نکلے اور بھاگنے لگے سر رابرٹ کا دھڑ اور سر ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

یہ عجیب و غریب دوڑ جاری رہی۔ مائیکل کا رُخ اپنے گھر کی طرف تھا اور جیف اس کے پیچھے... اور دونوں کے پیچھے پیچھے سر رابرٹ... کا دھڑ ہتھیلی پر اپنا سر رکھے دوڑا چلا آرہا تھا۔

مائیکل کا گھر آگیا۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی اور اندر چھلانگ لگادی۔ جیف نے بھی چھلانگ لگانی چاہی مگر جلدی میں اُس کی ٹانگ باہر پھنس گئی۔ اسی لمحے دُور سے آتے ہوئے سر رابرٹ کے دھڑ نے اپنا کٹا ہوا سر گھُما کر مائیکل کے کمرے کی کھڑکی کی طرف پھینکا اور وہ سیدھا جیف کی ٹانگ میں آکر لگا... اور سر رابرٹ کے سر نے جیف کی پتلون اپنے دانتوں سے پکڑ لی۔ جیف نے چیخ ماری اور دوسری ٹانگ سے سر کو مارنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد رابرٹ صاحب کا سر فٹبال کی مانند اُڑتا ہُوا دُور جا گرا... جیف جلدی سے کمرے کے اندر ہوا مگر اس عرصے میں رابرٹ کا دھڑ قریب آگیا تھا۔ جیف نے کھڑکی بند کردی اور لاک لگا دیا۔ مائیکل اور جیف دونوں کمرے سے گھر کے اندر کی طرف بھاگے مگر دروازہ چھوٹا تھا، لہٰذا ٹکرا کر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

"ٹرن... ٹرررن..." فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔
مائیکل کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ جیف بھی ساتھ ہی زمین پر سو رہا تھا۔ مائیکل نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ مگر کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اور... اور وہ دونوں بھی بالکل صحیح سلامت تھے۔ مائیکل کو یقین نہیں آرہا تھا۔ مائیکل نے فون اُٹھایا اور ڈرتے ڈرتے ریسیور کانوں سے لگایا۔
"مائیکل... تم کو کب سمجھ آئے گی... کیا آج پھر اسکول سے لیٹ ہونا ہے..." اس کی امّی کی آواز سُنائی دی۔
تو مائیکل کی جان میں جان آئی۔
"اوکے ممّی..." مائیکل نے کہا اور فون رکھ دیا۔ اتنے میں جیف بھی اُٹھ گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو

حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
"کیا ہوا..." جیف نے پوچھا۔
"رات جو ہم باتیں کر رہے تھے ...اسی پر بہت بُرا خواب دیکھا..." مائیکل نے کہا
"اچھا.. تم نے بھی..." جیف نے کہا۔
"کیا...؟ مائیکل بھی حیران ہوگیا۔" تو... تو... تم نے بھی خواب دیکھا..."
"ہاں..." جیف نے کہا۔ مائیکل تھوڑی دیر جیف کو دیکھتا رہا پھر دوڑ کر غسل خانے میں چلا گیا۔
کلاس کے سامنے جا کر ان کے قدم رُک گئے۔ دونوں کی نظریں آپس میں چار ہوئیں اور ہچکچانے لگے۔
"کیا خیال ہے..." مائیکل نے جیف سے پوچھا۔
"پہلے اندر دیکھ لیں... ویسے بھی ہم لیٹ ہو چکے ہیں..." جیف نے کہا اور دونوں دروازے میں لگے شیشے سے اندر جھانکنے لگے۔
اندر کلاس میں سر رابرٹ اُنکی طرف پیٹھ کیے بلیک بورڈ پر کچھ لکھ رہے تھے۔
"اچھا موقع ہے..." جیف نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے اور چپکے چپکے اپنی سیٹوں پر جا بیٹھے۔
"مائیکل اور جیف..." سر رابرٹ کی آواز نے دونوں کے دلوں کو اُچھال کر حلق میں پہنچا دیا۔ پھر سر رابرٹ مُڑے اور اُن کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کی آنکھیں بند تھیں۔ اور وہ کپکپا رہے تھے۔
"مائیکل اور جیف ...تم دونوں لیٹ ہو۔ رات بھر کیا کرتے رہے..."
اور چونک کر دونوں نے آنکھیں کھول دیں پھر ڈرتے ڈرتے سر رابرٹ کو دیکھا۔
"آآآآآ ہ ہ ہ ہ..." دونوں چلا اُٹھے۔
"کیا ہُوا... کیا ہُوا..." پوری کلاس سمیت سر رابرٹ بھی اُن کی چیخ سے گھبرا اُٹھے۔ اور مائیکل اور جیف دونوں آنکھیں پھاڑے لرزتے ہوئے سر رابرٹ کی گردن میں زخم کے نشان کو دیکھے جا رہے تھے۔
"کیا ہُوا تم دونوں کو...؟" سر رابرٹ نے پوچھا۔
"سر... سر... یہ... یہ..." جیف نے کانپتی انگلیوں سے ان کی گردن کے زخم کی طرف اشارہ کیا۔
"اوہ... یہ... یہ تو میں صبح شیو کر رہا تھا تو بلیڈ سے زخم لگ گیا تھا... تم دونوں کیا سمجھے...؟" سر رابرٹ نے ہنستے ہوئے کہا اور مائیکل اور جیف نے ایک دوسرے کی طرف شدید حیرت سے دیکھا... اور پھر بے ہوش ہو گئے....

ترسیلِ زر اپنے بینک کے ذریعے کیجئے۔

محفوظ بھی اور
باکفایت بھی

فوری ترسیل کے لئے
نیشنل بینک آف پاکستان

کی شاخیں ملک کے قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں میں موجود ہیں۔
کراچی اور لاہور میں ٹیلی فیکس کی سہولت بھی۔

Overseas Branches

United Kingdom	:	i) 18, Finsbury Circus, EC2M, 7BJ LONDON ii) 30, Sloane Street, Knightsbridge Branch London SWIX 9 NJ Also at Manchester, Sheffield, Birmingham, Bradford, Edinburgh, Glasgow.
United States	:	i) 100, Wall Street, P.O. Box 500, New York. N.Y. 10005, ii) I.U.N. Plaza, 1st Avenue, 44, East Street, New York N.Y. 10017, iii) 1825, Connecticut Avenue, N.W. Washington DC 20009 Also at Chicago.
Hongkong	:	324, Central Building, Queen's Road, G.P.O. Box 3920, Central Hong Kong Also at Kowloon.
West Germany	:	6000, Frankfurt Main Schwindstrasse-3, P.O. Box 101-643, Frankfurt.
France	:	90, Avenue Des Champs Elysees, 75008 Paris.
Japan	:	Mori Building No. 20, 7-4, 2, Chome, Nishi Shimbashi, Minato-Ku, P.O. Box Shiba 272, Tokyo 105-91.
Bahrain	:	9/10, Manama Centre, P.O. Box No. 775, Manama, State of BAHRAIN
Egypt	:	64, Gameat Al-Dawal, Al-Arabia Street, Mohandessin, Giza, P.O. Box No. 168 (Mohd Farid) Cairo.
Republic of Korea	:	Kyobo Building, 12th Floor 1-Chongro, 1-KA, Chongro-Ku KPO Box 1663, Seoul.
People's Republic of China	:	435, Kunlun Hotel, 21, Liangmaqiao, Chaoyang District Beijing.
Affiliate	:	Bank Al-Jazira, Saudi Arabia with 26 branches at all important cities of the Kingdom.

نیشنل بینک آف پاکستان — قومی ترقی قومی بینک

United

PID-1-27/88

بے چارہ بے قصور

ایک خوبصورت نظم جسے تین نامور شخصیات نے مل کر لکھا

ابّا سے لڑ کر
خوب آج مارا
امّی نے مجھ کو
غصّہ اُتارا

ابّا سے لڑ کر
امّی نے مجھ پر
غصّہ اُتارا

میں مار کھا کر
گھر سے چلا اور
بستہ اُٹھا کر
اسکول پہنچا
اُستاد صاحب
بپھرے ہوئے تھے
لڑکوں کے غُل سے
مجھ کو جو دیکھا

بس پچیتیا یا
لڑکوں کا غصّہ
مجھ پر اُتارا !!

چھٹی ہوئی تو
میں گھر کو لوٹا
دکان پر سے
بنئے سے پٹ کر
دُم کو اُٹھائے
اِک گائے دوڑی
سینگوں کے اُوپر
مجھ کو اُٹھا کر

ڈاکٹر دین محمّد تاثیر
شمس عارف
پنڈت ہری چند اختر

دھرتی پہ پٹخا
بِنّے کا غصّہ
مجھ پر اتارا !!

الحمدُ لِلّٰہ ! میں گھر میں پہنچا
اتنے میں بھیّا سیڑھی سے پھسلے
اور پھٹ اُڑادھوں آنگن میں آئے !
میں سامنے تھا ، جھنجلا کے اُٹھے
اور مجھ کو مارا !
گِرنے کا غصّہ
مجھ پر اُتارا !

میں روتا روتا ! کمرے میں پہنچا
ابّا سے امّی ! پھر لڑ رہی تھیں
ابّا نے مجھ کو روتے جو دیکھا
کانوں سے پکڑا اور خوب پیٹا
اور خوب پیٹا
امّی کا غصّہ
مجھ پر اُتارا !

خلا میں بھوت (ماخوذ) ○ شانی ایوب

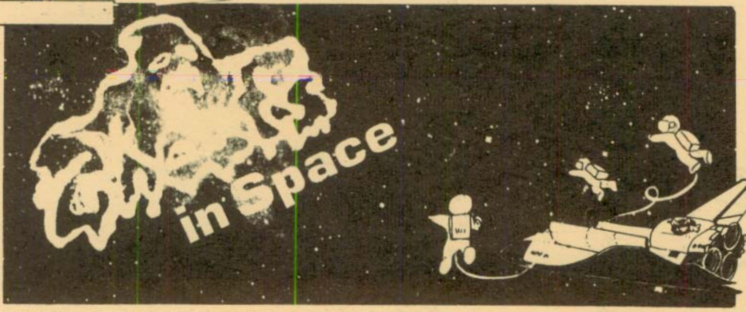

جب رُوسی اور امریکی خلانوردوں نے آسمانی مخلوق کو دیکھا . . . !!

پُرانے زمانے میں جب بچے رات کو دیر تک جاگتے رہتے تھے تو اکثر والدین اُنہیں ڈرا کر سُلانے کے لیے چاند کی طرف اشارہ کرکے کہا کرتے تھے: "دیکھو وہ چاند پر ایک بُڑھیا بیٹھی چرخہ چلا رہی ہے اگر تم فوراً نہ سوئے تو وہ چاند سے اُتر کر تمہارے پاس آجائے گی اور تمہیں پکڑ کر چاند پر لے جائے گی۔ پھر تم وہاں اکیلے رہنا۔" بچے چاند کی بُڑھیا سے ڈر جاتے اور آنکھیں بند کرکے سو جاتے تھے۔ افسوس اب بچے جان چکے ہیں کہ چاند پر پہاڑوں غاروں، صحراؤں اور خوفناک سناٹے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ چاند کی بُڑھیا کی موت سے دُنیا بھر کے والدین کو بڑا نقصان ہُوا ہے کیونکہ انہیں بچّوں کو ڈرانے کے لیے اب دوسرے طریقے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔

ممکن ہے کچھ دنوں بعد جب دنیا اور ترقی کر جائے تو والدین بچّوں کو مریخ کی زمین پر بنی ہوئی انسانی شکل سے ڈرانے لگیں۔ جی ہاں، مریخ پر بھی چاند کی طرح کی ایک انسانی شکل پائی جاتی ہے۔ روسی خلائی جہاز وِل کِنگ اب سے کچھ برس قبل جب مریخ پر اُترا تو اُس نے وہاں کی ہزاروں تصاویر اُتاری تھیں۔ ان تصاویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریخ پر بڑے بڑے آتش فشاں پہاڑ، گہرے غار اور مختلف طرح کی وادیاں موجود ہیں اس کے علاوہ مریخ کی زمین پر بہت سی شبیہیں بھی بنی ہوئی ہیں جن میں ایک انسانی شبیہ بھی ہے۔ یہ شبیہ تقریباً ایک کلومیٹر چوڑی ہے۔ یہ شبیہ مریخ کے سنڈونیا نام کی جگہ پر موجود ہے ایسے دیکھنے سے لگتا ہے جیسے وہ خلا میں گھور رہی ہے۔

خیر یہ تو محض شبیہوں کا معاملہ ہے۔ مختلف خلائی جہازوں کے خلانوردوں نے خلا میں شبیہوں کے علاوہ بہت سے عجیب وعزیب اجسام بھی دیکھے ہیں۔ اُنہیں آپ بھُوت کہیے یا کچھ اور۔

امریکہ سے نکلنے والے سائنسی رسالے ورلڈ ویکلی نیوز میں شائع ہونے والی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق چھ روسی خلانورد جب خلا میں موجود خلائی اسٹیشن سیلوٹ سات کے آس پاس موجود تھے تو اُنہوں نے ایک عجیب وعزیب نظارہ دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ سات فرشتوں جیسے دیو ہیکل اجسام خلا میں پرواز کرتے رہے ہیں۔ خلانوردوں کے بقول ان اجسام کے بڑے بڑے پَر تھے بالکل جمبو جیٹ کی طرح کے۔ ان اجسام کی جسمانی ساخت اگرچہ انسانوں کی طرح تھی، مگر اُن کا جسم بہت بڑا تھا۔ اُن کے چہرے گول تھے اور وہ مسلسل فرشتوں کی طرح مُسکراتے جارہے تھے۔ اُن کے سروں پر دُھند کا ایک روشن انگوٹھی نُما ہالہ بنا ہُوا تھا۔ یہ منظر صرف تین خلانوردوں نے دیکھا تھا۔ انہوں نے جب اپنے باقی تین ساتھیوں کو ان عجیب وعزیب فرشتوں جیسے اجسام کے بارے میں بتایا تو اُنہیں یقین نہ آیا لیکن اس دن کے ٹھیک بارہ روز بعد یہ اجسام ایک مرتبہ پھر اُن کے اسٹیشن کے قریب سے گزرے اور اس بار اُن باقی تین خلانوردوں نے جن میں خلا میں جانے والی پہلی خاتون خلانورد سوتیلانہ بھی شامل تھی اُنہیں آنکھیں پھاڑے دیکھا۔

۱۹۸۵ء میں امریکی خلائی شٹل ڈسکوری کے خلانوردوں نے بھی خلا میں ایک ایسا ہی عجیب وعزیب جسم دیکھا تھا۔ ڈسکوری کے خلانورد جیف ہوف مین اور ریا سیڈن خلا میں چہل قدمی کے بعد ڈسکوری میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ انہوں نے ڈسکوری کے چھت میں بنی ہوئی کھڑکی کے اوپر سُرخ رنگ کے سنگترے نُما ایک بہت بڑے جسم کو حرکت کرتے دیکھا۔ اس مخلوق کا سر مشروم کی طرح تھا اور اُس کے منہ کے درمیان میں یعنی ناک کی جگہ سے چمک دار سفید روشنی پھُوٹ رہی تھی۔ دونوں خلانورد بہت دیر تک ششدر سے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ پھر کچھ دیر بعد ریا سیڈن نے مذاقاً ہاف مین سے کہا "کیا ہم ان کی موجودگی کو تسلیم کرلیں یا نہیں؟" تھوڑی دیر بعد وہ جسم لہراتا ہوا خلا میں غائب ہوگیا۔

اب سوال یہ ہے کہ مریخ پر بنی شبیہہ اور خلانوردوں کو خلا میں نظر آنے والے یہ اجسام حقیقی ہیں یا نہیں؟ کیا سائنس دان اس کی کوئی منطقی توجیہہ پیش کرتے ہیں؟

جی ہاں! مشہور خلانورد کارل سیگن جس کی مشہور زمانہ فلم سیریل "کوسموس" آپ نے یقیناً پچھلے برس ٹی وی پر دیکھی ہوگی، ان عجیب وعزیب شبیہوں اور اجسام کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

اُن کا کہنا ہے کہ انسان چاہے کہیں ہو وہ ہمیشہ اپنے آپ کو انسانوں کے درمیان دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر انسان دوسری مخلوقات کے ساتھ رہنے کے خواب بھی دیکھتا ہے۔ سیگن کے بقول ہم سب

چہرے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب ہم بچے ہوتے ہیں، تب بھی خیالی چہرے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔

یہ دراصل ہمارے تخیل کی کرشمہ سازیاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے بعض دفعہ ہم تخیل میں اُن چہروں کو حقیقت سمجھ کر دیکھ لیتے ہیں جو دراصل موجود ہی نہیں ہوتے۔

اسی طرح بادلوں، پھولوں اور پتّیوں میں بھی ہمیں بہت سی عجیب و غریب شبیہیں نظر آجاتی ہیں۔ سیگن کے مطابق اسی طرح ان خلانوردوں کو بھی خلا میں کچھ اجسام نظر آگئے ہیں۔

مغرب کے لوگوں کی سب سے بڑی خامی ہی یہ ہے کہ جو چیز سائنسی طور پر ثابت نہیں ہوسکتی وہ اُسے نہیں مانتے۔ حالانکہ دنیا میں بے شمار ایسی چیزیں اور واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ جن کو اگرچہ سائنسی طور پر ثابت نہیں کیا جاسکتا لیکن وہ واقعتاً ہوتے ہیں۔ مغرب کے لوگوں کو نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ اپنی بزرگی کا اظہار ان گنت طریقوں سے کرسکتا ہے۔ مغرب کے مذہب بے زار اذہان اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں، مگر ہم تو نہیں۔!

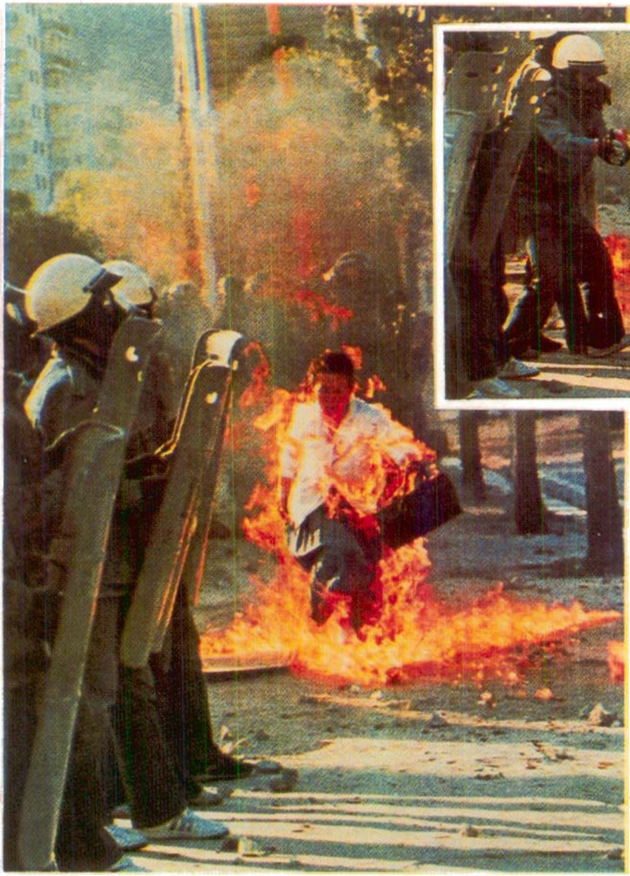

ایک خوفناک لمحہ

یہ تصویر کسی شعبدہ گر کی نہیں، بلکہ ایک ضعیف خاتون کی ہے۔ جو مظاہرین کے ہاتھوں شعلوں کے لپیٹ میں آگئیں۔
پولیس کی مدد سے اُنھیں بچالیا گیا۔ اس لمحے کو تصویر میں قید کر لینا یقیناً فوتوگرافر کا کمال ہے۔

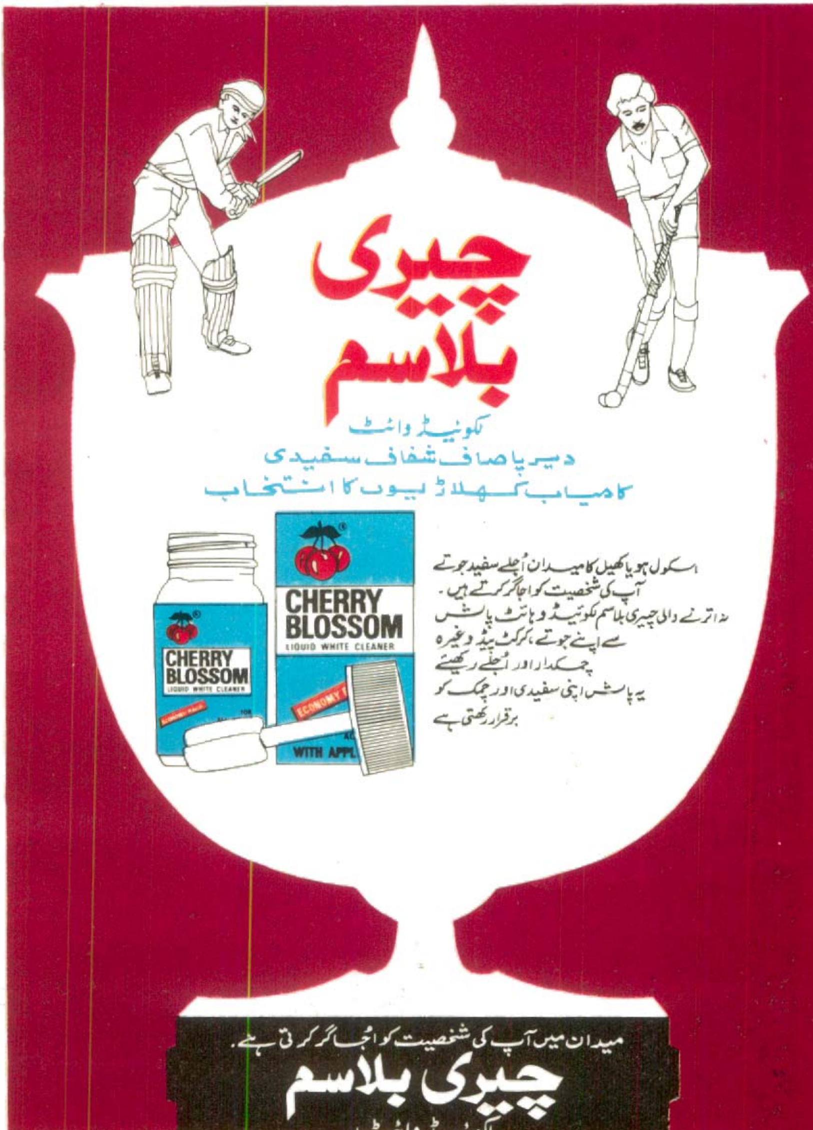
چیری
بلاسم
لکوئیڈ وائٹ
دیرپا صاف شفاف سفیدی
کامیاب کھلاڑیوں کا انتخاب
اسکول ہو یا کھیل کا میدان اُجلے سفید جوتے
آپ کی شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں۔
نہ اترنے والی چیری بلاسم لکوئیڈ وہائٹ پالش
سے اپنے جوتے، کرکٹ پیڈ وغیرہ
چمکدار اور اُجلے رکھیے
یہ پالش اپنی سفیدی اور چمک کو
برقرار رکھتی ہے
CHERRY BLOSSOM
LIQUID WHITE CLEANER
CHERRY BLOSSOM
LIQUID WHITE CLEANER
WITH APPL
میدان میں آپ کی شخصیت کو اجاگر کرتی ہے۔
چیری بلاسم
لکوئیڈ وائٹ

وہ ایک رات

بالآخر پراسرار چیخوں کی حقیقت معلوم ہوگئی

سیّد عبدالودود شاہ

ٹرین کی رفتار آہستہ ہورہی تھی، اور بارش شدت اختیار کرتی جارہی تھی، ٹرین کے تقریباً تمام مسافر اُونگھ رہے تھے اور باہر گھپ اندھیرا تھا، ایک تو سردی کا موسم اوپر سے بارش کا زور و شور اور پھر ویران علاقہ۔ بارش بھی یوں برس رہی تھی کہ گویا پھر نہیں برسے گی، بجلی رہ رہ کر کڑکتی اور دور تک ایک لمبا سا شرارہ لپکتا، اس کی روشنی میں جہاں تک نظر جاتی جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اگر نوید اور عبید ساتھ نہ ہوتے تو شاید میں اس نامعقول سفر پر تیار بھی نہ ہوتا، لیکن اب تو آہی پھنسے تھے ـــــ دراصل سارا کیا دھرا نوید کا تھا، موصوف کو بیٹھے بٹھائے سر جو کھجایا تو اعلیٰ حضرت نے تجویز پیش کی کہ اس بار چھٹیاں عرفان چچا کے ہاں گاؤں میں گزاری جائیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، سہانا سماں، کنوئیں پر رہٹ کی روں روں اور ہر طرف ایک عجیب سی خاموشی "بہتر ہے کہ ہم لوگ قبرستان چلیں، وہاں بھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہے، پراسرار سا سماں اور ہر طرف ایک عجیب سی خاموشی"! میں نے بے حد جل کر کہا تھا ـــــ لیکن دونوں نے میری ایک نہیں سنی تھی، تو اب اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم تینوں اس وقت اس ٹرین کے ڈبے میں نظر آرہے تھے اور گاڑی چاندپور کے اسٹیشن پر رکنے ہی والی تھی۔ لیکن

بارش رکنے کے آثار دور اور نزدیک کہیں نہیں تھے۔

"چاندپور" —— ٹرین جیسے ہی پلیٹ فارم پر آئی۔ سامنے لگے ہوئے بورڈ پر مدّھم مدّھم سے نظر آنے والے الفاظ نے بتایا کہ ہم منزل پر پہنچ چکے ہیں، بورڈ کے سامنے لگے ہوئے کھمبے پر ایک فاقہ زدہ بلب تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گویا اس گاؤں میں بجلی بھی ہے۔ مجھے تھوڑا سا اطمینان ہوا۔

نوید اور عبید اپنے اپنے بیگ سنبھال چکے تھے اور میں نے سوٹ کیس قریب ہی رکھ لیا تھا۔ گاڑی رکتے ہی ہم اتر گئے۔ چند لمحوں بعد گاڑی سرکتی ہوئی اندھیرے میں گم ہو گئی —— ہم بارش کی تیز بوچھاڑ سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے تقریباً بھاگتے ہوئے شیڈ میں جا گھسے۔ لیکن یہاں پہنچ کر حیران رہ گئے۔ ہمارے استقبال کے لیے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ لوگ بارش میں کہیں پھنس گئے ہیں"۔ —— نوید نے خیال ظاہر کیا —— میں نے صرف اپنے کپڑوں سے پانی جھٹکنے پر اکتفا کی، عبید سامان رکھ کر ادھر ادھر جھانکنے لگا۔ پھر اندھیرے اُجالے میں کھڑی ہوئی ایک بگھی نظر آ ہی گئی "چاندپور" نوید نے بالکل بس کنڈکٹروں کی طرح ہانک لگائی۔ تھوڑی دیر بعد ہم برستی بارش میں بگھی میں بیٹھے چاندپور کی طرف جا رہے تھے۔

ہم گاؤں سے نصف فاصلے پر ہوں گے کہ ایک اور بگھی سڑک کے کنارے الٹی پڑی نظر آئی، اور دو تین سائے وہیں ہاتھ لہرا رہے تھے —— ! کوچوان نے بگھی روک دی۔ ظاہر ہے یہ عرفان چچا اینڈ سنز تھے۔ ہمارا اندازہ درست ثابت ہوا۔ راستے میں بارش اور کیچڑ میں پھنس کر بگھی الٹ گئی تھی۔ اور وہ سب بارش اور کیچڑ میں لت پت بھوت بنے ہوئے تھے۔ الٹی ہوئی گاڑی کو اس کے حال پر چھوڑ ہم سب حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ عرفان چچا اور ان کے بیٹوں سے میرا غائبانہ تعارف چونکہ پہلے ہی تھا لہٰذا جلد ہی ہم پرانے دوستوں کی طرح باتیں کرنے لگے —— حویلی پہنچ کر تینوں باپ بیٹے سیدھے غسل خانے کی طرف بھاگے اور نوید اور عبید مجھے ایک وسیع وعریض کمرے میں لے آئے۔ یہ اتنا بڑا کمرہ تھا کہ اس میں کم از کم دس افراد آسانی سے سو سکتے تھے لیکن اس وقت تو ہم تینوں ہی تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم عرفان چچا ان کے لڑکوں عمران اور کامران سے گپیں مارتے ہوئے گرم گرم کافی پی رہے تھے۔ اپنے شہر سے سینکڑوں میل دور ایک اجنبی گاؤں کی حویلی میں سردی اور بارش کے سفر کے بعد اس گرم کافی کا مزہ کچھ اور ہی تھا —— رات گئے تک ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ عرفان چچا کی بیگم اور دونوں لڑکیاں صباحت اور نزاکت بھی ہمارے ساتھ گفتگو میں شامل ہو گئی تھیں۔ رات کا اچھا خاصا حصّہ بیت چکا تھا، لیکن محفل اتنی دلچسپ تھی اور ماحول اتنا خوشگوار تھا کہ کسی کا بھی دل یہاں سے اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ بالآخر عرفان چچا ایک طویل جماہی لے کر اٹھ کھڑے

ہوئے۔ اب چلو بچو! سو جاؤ۔ رات کافی گذر چکی ہے ـــ بیگم عرفان نے بھی میاں کی تائید کی ــ اور تھوڑی دیر بعد کمرے میں ہم تینوں ہی رہ گئے تھے۔

"اچھا دوستو ـــ شب بخیر ـــ اب میں بھی سوؤں گا" اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر تقریباً گرتے ہوئے میں نے اعلان کیا اور پھر یہ دیکھنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کی کہ نوید اور عبید کیا کرتے رہے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں گہری نیند سو گیا۔ لمبے سفر کی تھکن اور دیر تک جاگنے کی وجہ سے میری نیند کچھ زیادہ ہی گہری ہو چکی تھی

رات کے کسی پہر بارش بھی تھم چکی تھی۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد ہم سب اکٹھے باہر نکلے ... "دیکھو بیٹے۔ جہاں جی چاہے جاؤ، لیکن جہاں سے جنگل شروع ہوتا ہے ـــ وہاں نہ جانا ـــ ادھر دلدلیں بھی ہیں" چچا جان نے جاتے وقت ہدایت کی۔ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چاروں بچے ہمارے ساتھ تھے جو ہماری مکمل رہنمائی کر سکتے تھے، پھر انہوں نے یہ ہدایت کیوں دی تھی؟ کیا محض ازراہ شفقت یا کچھ اور؟ اسی لمحے میں نے چاروں بہن بھائیوں کے چہروں پر سنجیدگی بھی محسوس کی۔ دوسرے ہی لمحے وہ پھر مسکرانے لگے تھے۔ نوید اور عبید نے شاید دھیان نہیں دیا وہ تو ارد گرد کے مناظر میں گم تھے۔ عرفان چچا اپنی جیپ میں بیٹھ کر کہیں چل دیئے ہم لوگ بھی باہر نکل کر یونہی آوارہ گردی کرتے پھرے۔ پہلا دن یونہی گزر گیا۔ لیکن میری نظریں بار بار دلدلی علاقے کی طرف اٹھتی رہیں۔ آخر رات کو جب سونے کے لیئے لیٹے تو میں نے پہلا سوال اسی بارے میں کیا۔ نوید اور عبید نے پہلے تو چونک کر میری طرف دیکھا ـــ "اوہ" ـــ مگر میں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔

چچا نے ہمیں بھی منع کر رکھا ہے۔

"مگر کیوں؟"

بھئی دلدلیں ہیں وہاں پر اور کیا ملے گا" "کیا جنگل کے جانور آپ کو گارڈ آف آنر پیش کرنے آئیں گے؟" میں مطمئن نہیں ہوا... میں نے محسوس کیا تھا کہ چاروں بہن بھائی اس بات پر خاموش سے ہو گئے تھے دونوں خاموش سے ہو کر کچھ سوچنے لگے۔ میں نے کروٹ لے لی، لیکن نیند غائب تھی۔ پھر نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

تیسری رات تھی۔ اور ہم سب تھک کر بالکل چور ہو چکے تھے میں نے تو کپڑے بھی نہیں بدلے۔ بس جوتے موزے اتار کر پھینکے اور غین ہو گیا۔

جانے رات کا کونسا پہر تھا۔ کہ میری آنکھ یکایک کھل گئی، جیسے کوئی خوفناک خواب دیکھتے دیکھتے آنکھ کھل جائے ـــــ لیکن وہ خواب نہیں تھا۔

ایک بھیانک چیخ ہواؤں کے دوش پر لہراتی ہوئی آئی اور فضا میں گم ہوگئی۔ میں نے برابر کے بستروں کی طرف دیکھا۔ نوید اور عبید جو ابھی تک سو رہے تھے، اب کے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اسی لمحے وہی چیخ دوبارہ فضا میں گونجی، اور اس کے ساتھ ہی ایسا شور اٹھا جیسے بہت سے لوگ مل کر زور زور سے چلّا رہے ہوں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے دونوں کو پھر دیکھا ان کے چہرے خوف سے سفید ہو رہے تھے۔ چونکہ بتی جل رہی تھی اس لیئے ان کے تاثرات کا اندازہ مشکل نہ تھا۔

ایک بار پھر وہی چیخ ابھری اور اس کے ساتھ ہی بھیانک سناٹا چھا گیا۔ پے در پے چیخوں اور یک لخت سناٹے نے ہم تینوں کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا۔ ابھی ہم اپنے بستروں پر ہی تھے کہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ میں ہمّت کر کے اترا اور دروازہ کھولا۔ سامنے عرفان چچا اور پیچھے پورا لاؤ لشکر تھا۔

"بچّو گھبراؤ نہیں۔ آرام سے سو جاؤ۔"! میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی عرفان چچا بولے۔ "یہ آوازیں آتی رہتی ہیں کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوتا، بے فکر رہو۔ عرفان اور کامران تمہارے ساتھ رہیں گے۔"! عرفان چچا نے جلدی جلدی بات کی۔ لیکن میں جو پہلے ہی کھٹک چکا تھا، مطمئن نہیں ہو سکا۔ "آپ نے پہلے نہیں بتایا تھا۔"

"بھئی اوّل تو تمہیں آتے ہی ڈرا دینا کوئی اچھی بات تھی؟ دوسرے جب ان آوازوں سے آج تک کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تو خواہ مخواہ ان کے پیچھے اپنی نیند کیوں حرام کی جائے۔ ہم صرف تمہیں تسلّی دینے آئے ہیں"۔!

"یہ سلسلہ کب سے ہے"؟ نوید نے پوچھا۔

"چند ماہ ہوئے ہیں"۔! عرفان چچا نے فرمایا "اچھا لو بھئی عرفی اور کامی، تم اپنے بھائیوں کے پاس سو رہو، تاکہ وہ پریشان نہ ہوں تم بھی آرام سے سو جاؤ"!

کچھ دیر بعد عمران اور کامران کے بستر بھی ہمارے کمرے میں لگ چکے تھے۔ ـــ ہم کچھ دیر تو ان آوازوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ سبھی سو گئے۔ لیکن میں ان آوازوں کے بارے میں سوچتا رہا، پھر یک لخت مجھ پر ایک بات واضح ہوئی، پہلی چیخ جو میں نے سنی وہ جنگل کی طرف سے آتی محسوس ہوئی، دوسری بھی اسی طرف، لیکن تیسری چیخ کہیں آس پاس سے ابھرتی محسوس ہوئی تھی۔ یہ وہ بات تھی جس پر شاید کسی نے غور نہیں کیا تھا، لیکن میں نے محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اس کی تہہ تک پہنچنے کی ٹھان لی تھی ـــ!

اور ادھر وہ چاروں میرے ارادے سے بے خبر گہری نیند سو چکے تھے۔

جب مجھے یقین ہوگیا کہ تینوں گہری نیند سو چکے ہیں تو دبے پاؤں باہر نکل آیا۔ جوتے ہاتھوں میں لیے ہوئے تھے اگرچہ ربر کے جوتوں سے شور کا امکان نہیں تھا لیکن احتیاطاً میں نے انہیں ہاتھوں میں ہی رکھا۔ حویلی کے صدر دروازے پر پہرے دار سے آنکھ بچا کر نکلنا آسان نہ تھا، لیکن مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ پہرے دار بھی اس سردی اور بارش میں بھنگ چڑھا کر سو رہا ہے، تھوڑی سی کوشش کے بعد میں باہر آچکا تھا۔ لیکن باہر آکر سوچ میں پڑ گیا کہ کدھر کو جانا ہے۔ جنگل کے بارے میں عرفان چچا نے بتایا تھا کہ ادھر دلدلیں ہیں ممکن ہے کہ جنگل سے پہلے ہی کوئی دلدل پڑ جائے تو اس اندھیری رات میں میرا سراغ بھی نہیں لگے گا لیکن کچھ سوچ کر ادھر جانے کے بجائے حویلی ہی کا ایک چکر لگانے کی ٹھانی۔ میرا چکر بالکل بے کار ہی ثابت ہوتا، اگر مجھے اپنے پاس پاس کسی کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا، پہلے تو سوچا کہ للکاروں کہ کون ہے؟ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جو بھی تھا۔ غائب ہو جاتا۔ اس لیے اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پراسرار وجود بھی ایک جگہ ٹھہر چکا تھا، قدرے انتظار کے بعد میں نے قدم آگے بڑھائے یہاں سے تھوڑا ہی آگے صدر دروازہ تھا۔ جہاں سے میں گل نواز کو آواز بھی دے سکتا تھا، میں نے گھوم کر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ہڈیوں کے ایک ڈھانچے نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اندھیری رات اور اجنبی ماحول میں کسی ڈھانچے کی گرفت میں آجانے کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پاکر ڈھانچے کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی، مگر وہ تو سر سے پاؤں تک سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا تھا، چہرے کی جگہ گوشت پوست سے بے نیاز ایک بھیانک کھوپڑی تھی، جس سے لال انگارہ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں، میں نے بڑی کوشش کے بعد اپنے حلق سے نکلنے والی چیخ کو روکا۔ اب تک جن بھوت کی جتنی کہانیاں پڑھی تھیں وہ بالکل سچ نظر آرہی تھیں۔ اکثر کہانیوں میں پڑھا تھا کہ اندھیری راتوں میں جن بھوت نکل کر لوگوں کو دبوچ لیتے ہیں، پرانی قبروں سے ڈھانچے نکل کر قبرستان میں رقص کرنے لگتے ہیں۔ بدروحیں راہ چلتے لوگ کو گھیر کر ان کا خون چوس لیتی ہیں پھر ان کی لاشوں کا بھی پتہ نہیں چلتا ——— ایک لمحے میں سارے بھیانک خیالات آئے اور گذر گئے۔ لیکن پھر میں نے سر جھٹک دیا۔ یہ کیا حماقت ہے۔ پڑھے لکھے ہوکر ان کہانیوں پر یقین کر لیا؟ بھلا جنوں نے آج تک کسی کا کیا بگاڑا ہے ——— ؟ لیکن اس پراسرار ڈھانچے کی گرفت بھی تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ہاتھ کیسے تھے کچھ پتہ نہ چلتا تھا کیونکہ بالکل اندھیرے میں کوئی شئے

واضح نظر نہیں آ رہی تھی۔

پھر میں نے ایک زور کا جھٹکا دیا لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا اگلے ہی لمحے میرا سر زور سے چکرایا اور پھر میرا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

ادھر نوید اور عبید کی سنیئے، رات کو کسی وقت نوید کی آنکھ کھلی تو اس نے کسی خیال کے تحت اٹھ کر سب کا جائزہ لیا۔ میرا بستر خالی پاکر پہلے تو وہ سمجھا کہ میں باتھ روم گیا ہوں، ــــ لیکن جب خاصی دیر ہو گئی تو اس نے ادھر ادھر جھانکنا شروع کیا، لیکن میں وہاں ہوتا تو ملتا۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں حویلی میں زلزلہ آ گیا، عرفان چچا گل نواز پر بری طرح برس رہے تھے، ۔ کیونکہ صدر دروازہ بھی کھلا ہوا ملا تھا۔ یقیناً میں باہر جا چکا تھا، پھر آنٹی نے سمجھایا کہ چوکیدار کو ڈانٹنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے انجم کو تلاش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک گروپ جس میں نوید اور کامران تھے سیدھا جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوسرے گروپ نے جو عبید اور عمران کا تھا۔ ارد گرد کے علاقے میں تلاش شروع کی۔ دونوں لڑکیاں باپ کے ساتھ حویلی کے ارد گرد چکر لگانے لگیں، لیکن انجم کا یعنی میرا کوئی سراغ نہیں ملا۔ بیگم عرفان رونے لگیں۔ نزاکت اور صباحت پریشان سی ہو کر کرسیوں پر ڈھیر ہو گئیں۔ عرفان چچا اچانک ہی کسی ارادے کے ساتھ رائفل اور ریوالوروں سے مسلح ہوئے اور جیپ میں جا بیٹھے۔ راستے میں انہوں نے چاروں لڑکوں کو بٹھا لیا، اب ان کا رخ جنگل کی طرف تھا۔ دلدلوں سے بچا کر چلاتے ہوئے وہ جیپ کو جنگل کے اندر لیئے چلے گئے ------ ۔ پھر ایک فائر ہوا اور جیپ کا اگلا دایاں ٹائر برسٹ ہو گیا۔ اور سب نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی۔ چند لمحوں میں جنگل میدان جنگ بن چکا تھا۔ ہزاروں پرندے چیختے چلاتے ہوئے اڑ رہے تھے اور جنگل کے جانوروں نے الگ قیامت برپا کر رکھی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد جنگل پر ہیلی کاپٹر پرواز کر رہے تھے اور ان سے مسلح چھاتہ بردار کود رہے تھے۔ عرفان چچا چاروں لڑکوں کو لے کر ایک محفوظ جگہ پہنچ چکے تھے۔

آگے آگے عرفان چچا اور پیچھے وہ چاروں تھے۔ جب وہ ایک ساتھ مجھ سے آ کر لپٹے تو میرے لیئے بھی خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ چھاپہ مار دستے کا کمانڈر مسکرا رہا تھا۔ لیکن مجھے فوجیوں کی آمد پر حیرت تھی۔ "سر میں اب جا سکتا ہوں"؟ اس نے عرفان چچا کو سلیوٹ مار کر پوچھا تو ہم سب کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ عرفان چچا نے نہایت گرم جوشی سے اس سے مصافحہ کر کے اسے رخصت کیا۔! اور جب ہم جنگل میں واقع اس غار میں سے باہر نکل آئے جہاں مجھے

تلاش کر لیا گیا تھا تو عرفان چچا نے تمام راز سے پردہ اٹھایا۔

"بیٹے۔! یہ راز، راز ہی رہنا چاہیئے۔ اس لیئے سوائے کمانڈر کے کسی کو اصل معاملے کا علم نہیں ہے۔ بہر حال تمہیں بتا رہا ہوں، میری حویلی کے تہہ خانے میں فوج کا خفیہ اڈّہ موجود ہے، چونکہ ہمارا گاؤں سرحد کے نزدیک ہے اس لیئے ایسے مرکز کی شدید ضرورت تھی، میں خود فوج کا ریٹائرڈ کرنل ہوں،"۔! وہ رُکے تو ہم نے حیرت سے انہیں دیکھا مگر عمران اور کامران مسکرا رہے تھے گویا وہ بھی اس راز سے آگاہ تھے۔" بہر حال یہ مرکز کام اچھی طرح کر رہا تھا۔ بدقسمتی سے دشمن ملک کے جاسوسوں کو اس کی موجودگی کا شبہ ہو گیا اور شبہ بھی میرے ہی اوپر ہوا،۔ ادھر جنگل جیسا کہ تم نے دیکھا ہو گا کچھ اس طرح ہے کہ جہاں دونوں ملکوں کے درمیان ایک قدرتی سرحد ہے وہاں یہ دونوں کے درمیان آمدورفت کا ذریعہ بھی ہے۔ اسی جنگل میں دشمن ملک کے تخریب کاروں نے اپنا مرکز قائم کر رکھا تھا۔ اب آگے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ ایسے جنگل میں داخل ہونا اور سراغ لگا کر مرکز ختم کرنا کتنا مشکل تھا۔ جبکہ خود میری حویلی دشمنوں کی نظر میں آ چکی تھی"۔!

"تو آپ بھی موقع کی تلاش میں تھے۔ اور وہ یوں آپ کو مل گیا" نوید نے کہا

"ہاں اس کا سہرا تم انجم کے سر باندھ سکتے ہو کیونکہ اس کی جرأت کی وجہ سے یہ سب ممکن ہوا"۔۔۔ "لیکن آپ نے پہلے کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟"۔ نوید نے پوچھا۔

"بیٹے اس جنگل کی جغرافیائی صورت حال ایسی ہے جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ اور یہ اتنے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے کہ پوری ایک بریگیڈ بھی کافی نہیں ہوتی۔ اس لیئے ہم براہ راست حملے کے بجائے کسی موقع کی تلاش میں تھے کہ دوسری طرف سے کوئی ایسی کارروائی ہو جس سے ہمیں ٹھیک نشانہ لگانے میں مدد مل سکے۔ انجم نے جو اقدام کیا اس نے مجھے کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ایک اندازے کے تحت پیش قدمی کی، تو دشمن یہ سمجھا کہ ہم نے سراغ پا لیا ہے۔ چنانچہ بد حواسی میں فائرنگ شروع کر کے اگرچہ ہمیں ختم کرنے کی کوشش کی لیکن دراصل اپنی نشاندھی کر دی، لیکن میں روانگی سے پہلے ہی فوج کو اطلاع دے چکا تھا۔ چنانچہ فوجیوں نے بالکل ٹھیک وقت پر کارروائی کی، اور وہ ملک دشمن مرکز تباہ کر دیا گیا۔ وہاں چند تخریب کار ایجنٹ بھی پکڑے گئے ہیں، باقی مارے گئے۔ لیکن ہمارے لیئے یہی کافی ہے۔ اب دشمن آئندہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا"۔

اچھا صرف ایک بات اور بتا دیجئے۔ وہ ڈھانچہ کیسا تھا اور چیخیں کاہے کی آئی تھیں؟ — میں نے پوچھا۔

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے"! کرنل عرفان مسکرائے۔ دیہاتی عام طور پر توہم پرست ہوتے ہیں انہیں ڈرانے اور جنگل سے دور رکھنے کے لیئے یہ شور کیا جاتا تھا۔ پہلے پہل میرا خیال تھا کہ معمولی جرائم پیشہ ہوں گے جو اپنی کاروائیوں پر پردہ ڈالنے اور دیہاتیوں کو جنگل کی طرف سے روکنے کے لیئے یہ ڈھونگ رچاتے ہیں۔ لیکن بعد میں فوج کے انٹیلی جنس کے شعبے نے اطلاع دی کہ یہاں دشمن ملک نے اپنا اڈہ قائم کر لیا ہے۔ اور چند جرائم پیشہ افراد کو بھی ساتھ ملا لیا ہے۔ وہ ڈھانچے صاحب ان میں سے ایک تھے۔ تمہیں ان سے ملا دیا جائے گا، اور ان کی بھیانک کھوپڑی۔ محض پلاسٹک کا خول تھی۔ انجم اگر ذرا دیر اور ہوش میں رہتا تو وہ یقیناً ڈھانچے صاحب کی اصلیت سے واقف ہو جاتا مگر اس شخص نے اسے بے ہوش کر دیا تھا"!

"بھوت"! عبید نے اچانک زور سے کہا۔ عمران اور کامران اچھل پڑے اور نوید اور میں نے قہقہہ لگایا۔ عمران اور کامران کے ساتھ عبید نے بھی قہقہے میں شرکت کی۔ لیکن ان کے قہقہے میں کھسیاہٹ ظاہر تھی۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کا مقبول ترین سلسلۂ تحریر

اخلاق احمد کی مُہماتی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ

- بُرائیوں سے برسرِپیکار ۴، کمسن مجاہدوں کے کارنامے
- ذہانت اور شجاعت سے بھرپور حیرت انگیز واقعات
- خوبصورت اسکیچز — بہترین تصاویر — اعلیٰ طباعت

حسین سرورق اور ۱۰۰ سے زائد صفحات

"حق اسکواڈ" حاصل کرنے کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ بھجوا دیں

امتحان کا خوف

علی ذوالقرنین جگنو

سالانہ امتحاں پھر نزدیک آرہا ہے
غم کا سیاہ بادل پھر دل پہ چھا رہا ہے

یاد آرہے ہیں وہ دن، تھے جب کہ وارے نیارے
آپس میں کھیلتے تھے لڑکے گلی کے سارے

آتا نہیں پر اب تو باہر کوئی بھی گھر سے
پڑھنے میں جُت گئے ہیں سب امتحاں کے ڈر سے

اب دیکھ کر کتابیں بے حال ہو رہا ہوں
مُشکل کا سامنا ہے قسمت کو رو رہا ہوں

پڑھنے میں گر میں اپنا تھوڑا سا دل لگاتا
پھر امتحاں سے مجھ کو کیوں اتنا خوف آتا؟

اِس امتحاں سے ممکن پیچھا نہیں چھُڑانا
دنیا میں اب کہاں ہے میرے لیے ٹھکانا

نزدیک آرہا ہے گو امتحان میرا
پر کھیل میں لگا ہے کمبخت دھیان میرا

اب بھی کروں جو محنت تو پاس ہو ہی جاؤں
کھیلوں سے دھیان لیکن میں کس طرح ہٹاؤں؟

نکلے گا جب نتیجہ کیا ہوگا حال میرا
میں جانتا ہوں ہوگا پھر ضائع سال میرا

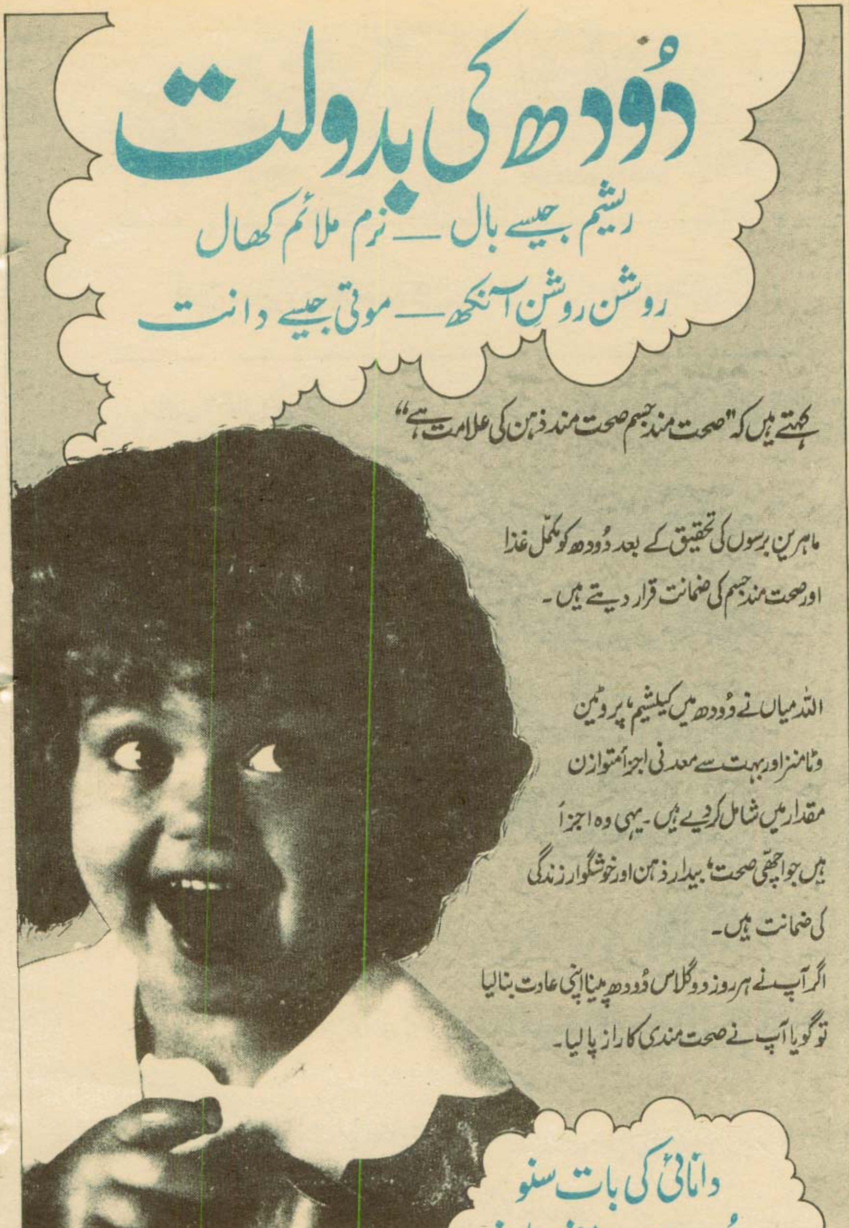
دُودھ کی بدولت
ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال
روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت
کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"
ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔
اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کردیے ہیں۔ یہی وہ اجزا ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔
اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنالیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پالیا۔
دانائی کی بات سنو
دُودھ پیو — مضبوط بنو
اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

کھیلوں میں خوف کے لمحے

ضیاالرحمٰن ضیا

تفریح کے لمحوں میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے۔

کھیل .... شائقین کے لیے بڑی کشش رکھتے ہیں۔ اک دنیا ان کے طلسم میں گرفتار ہے۔ کھیلوں کی تاریخ میں ایسے واقعات بھی محفوظ ہیں جنہیں پڑھ کر جھرجھری سی آجاتی ہے اور یہ یقین نہیں آتا کہ کھیل اتنے خوفناک بھی ہوسکتے ہیں۔

کرکٹ میں تیز رفتار بالروں کے ہاتھوں، کھلاڑیوں کے زخمی ہونے کے واقعات عام ہیں لیکن درجِ ذیل واقعہ منفرد اہمیت کا حامل ہے۔

کراچی کے، کے پی آئی گراؤنڈ پر ۱۷، جنوری ۱۹۵۹ء کو قائدِ اعظم ٹرافی کا فائنل کراچی اور کمبائنڈ سروسز الیون کے درمیان کھیلا جا رہا تھا۔ میچ کا دوسرا دن تھا۔ کراچی کی ٹیم ۲۷۰ رن سات کھلاڑی آؤٹ پر بیٹنگ کر رہی تھی۔ کریز پر نوجوان بیٹسمین عبدالعزیز اور مشتاق محمد تھے۔ سروسز کے آف اسپنر دلدار اعوان بالنگ کرا رہے تھے۔ اُن کی ایک گیند پچ پر پڑنے کے بعد اچانک اُٹھی اور سیدھی بیٹسمین عبدالعزیز کے بائیں سینے پر لگی۔ وہ پچ پر گر پڑے اور اُن کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ اُنہیں فوراً ہی اسپتال لے جایا گیا۔ ایسے مواقع پر کھیل جاری رہتا ہے۔ اس دن بھی کھیل دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ کراچی کے نویں کھلاڑی ۲۸۵ کے اسکور پر آؤٹ ہوئے۔ عبدالعزیز کی غیر موجودگی کے سبب اسی اسکور پر کراچی کی اننگ کا خاتمہ ہوگیا۔ ابھی

سروسز کے کھلاڑی بیٹنگ کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ اسپتال سے یہ خبر آئی کہ عبدالعزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس دن کا کھیل منسوخ کر دیا گیا۔ کچھ دیر قبل عبدالعزیز کو اپنے درمیان کھیلتا دیکھنے والے اپنے ساتھی کو کاندھا دیتے اُس کے گھر روانہ ہوئے۔ بعد میں عبدالعزیز کے ساتھیوں نے بتایا کہ وہ بیمار رہتے تھے اور ڈاکٹر نے اُنھیں کرکٹ کھیلنے سے منع کیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ کرکٹ کھیلتے رہے۔ اپنی موت کے دن میچ شروع ہونے سے پہلے انہوں نے اپنے سینے میں تکلیف کی شکایت کی تھی۔ ان کی جیب میں ہمیشہ درد دُور کرنے کی گولیاں موجود ہوتی تھیں۔ لیکن اس روز وہ گولی کھانا بھُول گئے تھے۔ نوجوان عبدالعزیز کی موت کا واقعہ جون ۱۸۷۰ء میں انگلینڈ کی کاؤنٹی ناٹنگھم شائر کے کھلاڑی جی۔ سمرز کے انتقال کے بعد فرسٹ کلاس کرکٹ میں اپنی نوعیت کا دوسرا واقعہ تھا۔

کھیلوں کے دوران سب سے زیادہ افراد کی ہلاکت کا حادثہ دوسری صدی عیسوی میں رومن شہنشاہ انتونی نس پیئس کے دور میں پیش آیا۔ روم میں تلوار بازی کا ایک مقابلہ ہو رہا تھا جسے دیکھنے کے لیے ہزاروں افراد جمع تھے۔ لکڑی کی چھت گرنے سے ایک ہزار ایک سو بارہ افراد ہلاک ہو گئے۔

اسکواش کے عظیم کھلاڑی جہانگیر خان کے بڑے بھائی طورسم خان نے بھی ایک حادثے کے نتیجے میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ نومبر ۱۹۷۹ء میں طورسم خان آسٹریلین اوپن اسکواش چیمپئن شپ میں حصّہ لینے کے لیے ایڈیلیڈ گئے۔ پہلے راؤنڈ میں اُن کا مقابلہ نیوزی لینڈ کے کھلاڑی ھسکو سے ہو رہا تھا کہ اچانک وہ اسکواش کورٹ میں گر گئے۔ اتفاق سے دو ڈاکٹر بھی میچ دیکھ رہے تھے۔ وہ کورٹ میں آئے۔ ایک ڈاکٹر نے اُنہیں سیدھا کیا۔ اُن کے جُوتے اتارے طورسم خان کے دوست اور اسکواش کے مشہور کھلاڑی ہدی جہاں اس موقع پر موجود تھے۔ طورسم نے نحیف آواز میں کہا "کیا ہُوا؟" "کیا ہُوا؟" ہدی جہاں نے اُنہیں حوصلہ دیا۔ فوراً ہی طورسم پر شدید درد کا ایک اور حملہ ہوا اور وہ بے ہوش گئے۔ ڈاکٹروں نے مصنوعی تنفس اور دل کی مالش کر کے سانس بحال کرنے کی کوشش کی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ شائقین اپنی نشستوں پر جمے ہوئے یہ ہولناک منظر دیکھ رہے تھے۔ اُنھیں اسپتال لے جایا گیا۔ اور مشینوں کے سہارے زندہ رکھنے کی کوشش کی گئی۔ طورسم کے والد اور اسکواش کے سابق عالمی چیمپئن روشن خان کو کراچی ٹیلی فون کر کے بتایا گیا کہ طورسم کا دماغ مُردہ ہو چکا ہے۔ اور جسم کو صرف مشینوں سے منسلک ہونے کی وجہ سے زندہ کہا جاسکتا ہے۔ جیسے ہی مشین ہٹائی جائے گی زندگی کی آخری رمق بھی ختم ہو جائے گی اور اب طورسم خان کو بچایا نہیں جاسکتا۔ روشن خان نے بڑے عزم و حوصلے سے یہ خبر سُنی اور ڈاکٹروں کو مشین ہٹانے کی اجازت

دے دی۔ طورسم خان بیمار تھے۔ ڈاکٹروں نے اُنھیں اسکواش کھیلنے سے منع کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی بیماری کی خبر سب سے چھُپائے رکھی اور محض شوق کی خاطر، جان دے دی۔

نیوزی لینڈ کے مشہورِ زمانہ ٹیسٹ کرکٹر ایون جان چیٹ فیلڈ کو بھی ایک بڑے حادثے سے گزرنا پڑا۔ ۷۵-۱۹۷۴ء کے سیزن میں انگلینڈ کی کرکٹ ٹیم نے اُن کے وطن کا دورہ کیا۔ آک لینڈ ٹیسٹ میں اُنھیں بھی میدان میں اُتارا گیا۔ وہ اُن کی زندگی کا پہلا ٹیسٹ تھا۔ وہ گیارہویں نمبر پر بیٹنگ کرنے گئے۔ انگلینڈ کے تیز رفتار بالر پیٹر لیور کی ایک گیند اُن کی پیشانی پر لگی۔ وہ پچ پر گر گئے۔ اُن کے دِل کی دھڑکن بند ہوگئی اور زبان باہر نکل آئی۔ انگلینڈ کی ٹیم کے ساتھ فزیوتھراپسٹ برنارڈ ٹامس بھی آئے تھے۔ وہ میدان میں دوڑتے ہوئے آئے اور انھوں نے چیٹ فیلڈ کو مصنوعی تنفّس دیا تب جاکر اُن کی دھڑکنیں بحال ہوئیں۔ انھیں اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں اُنہیں تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوش آیا۔ چیٹ فیلڈ اب بھی ٹیسٹ کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ لیکن آک لینڈ ٹیسٹ کا وہ لمحہ وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے جہاں فزیوتھراپسٹ کے مصنوعی تنفّس نے اُن کو دوسری زندگی عطا کی۔

فٹ بال... دُنیا کا مقبول ترین کھیل ہے۔ جتنے زیادہ شائقین اس کھیل کو دیکھنے اسٹیڈیم آتے ہیں، اتنے کسی اور کھیل کو نصیب نہیں ہوتے۔ برِّاعظم امریکہ میں بسنے والے افراد تو فٹ بال سے دیوانگی کی حد تک محبّت کرتے ہیں اور اُن کے نزدیک میچ، جنگوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے کھیل کو محض کھیل سمجھ کر نہیں کھیلا جاتا بلکہ اسے عزّت و وقار کا مسئلہ بنا لیا جاتا ہے۔ کئی برس پہلے کا ذکر ہے۔ شمالی امریکہ کے دو ممالک ایل سالوے ڈور (EL SALVADOR) اور ہونڈوراس (HONDURAS) کے درمیان ایک فٹبال میچ کھیلا جارہا تھا۔ میچ میں کسی بات پر کھلاڑی آپس میں اُلجھ پڑے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس واقعے نے اتنی شدّت اختیار کرلی کہ دونوں ممالک کے تعلقات، نہ صرف خطرے میں پڑ گئے بلکہ جنگ کی نوبت آگئی۔ جب دوست ممالک کو اس کا علم ہُوا تو اُنہوں نے دونوں فریقین کو سمجھایا۔ اس طرح دونوں ممالک کے درمیان جنگ ٹل گئی۔

ایک بار فٹ بال کا کھیل امن کا سبب بھی بنا۔ افریقی ملک نائیجیریا میں حکومت، انتہا پسند تنظیم بیافرا کے ہاتھوں مشکلات کا شکار تھی۔ دونوں فریقین حالتِ جنگ میں تھے۔ جب وہاں کے لوگوں کو یہ خبر ملی کہ فٹ بال کے ساحر اور برازیل کے عظیم کھلاڑی پیلے بھی ایک میچ میں اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ تو فریقین کے درمیان دو روز کے لیے امن کا معاہدہ ہُوا اور اس دوران کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔

true loveliness
begins with healthy skin!
Give your skin the soft and delicate touch of Dettol Soap. Its thick, creamy lather gently caresses your skin, cleaning it deep down to give you the glowing complexion that is the secret of true loveliness.
for healthy skin use Dettol Soap
Dettol
Regd.
Soap
Dettol Soap Regd.
manhattan PAKISTAN

دنیا میرے آگے

دلچسپ خبریں ــ حیرت انگیز اطلاعات

پُرشور شہر :-

ہانگ کانگ سے ملنے والی ایک اطلاع کے مطابق ہانگ کانگ دُنیا کا سب سے زیادہ پُرشور شہر ہے۔ یونیورسٹی آف ہانگ کانگ کے مکینیکل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کے ایک سینئر لیکچرار نارمن کو نے اس سلسلے میں ایک سروے کیا۔ سروے کے مطابق ہانگ کانگ کی آبادی ۴۵ لاکھ سے زائد افراد پر مشتمل ہے۔ شہر میں دو لاکھ سے زائد گاڑیاں ہیں جو شہر کی ۶۷۸ میل لمبی سڑکوں پر صبح سے لے کر آدھی رات تک رواں دواں رہتی ہیں۔ اس طرح اوسطاً فی میل ۲۹۵ گاڑیوں کا اوسط ہُوا۔ نارمن کو نے جب ساؤنڈ میٹر پر آواز کی لہروں کا مشاہدہ کیا تو وہ حیران رہ گیا۔ اُس کا کہنا ہے کہ اگر یہ ساری گاڑیاں چل رہی ہوں، ان کے بریکوں کی چرچراہٹ بھی گونج رہی ہو اور اطراف کے لوگوں کی آوازیں بھی اس میں شامل ہوں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فضا کتنی پُرشور ہو جائے گی۔

کمپیوٹر کا کمال :-

کمپیوٹر کی ایجاد نے انسان کا کام بہت آسان کر دیا ہے۔ مغربی جرمنی کے علاقے بویریا کے ایک کسان میتھیئس ہیوبر نے ڈیری فارمنگ کے لیے کمپیوٹر کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کی گائے "شان ہائٹ" کئی روز سے بھوک کی کمی کا شکار تھی۔ جس کی وجہ سے وہ دودھ بھی کم دے رہی تھی۔ چنانچہ ہیوبر نے جب اس زرعی کمپیوٹر سے مدد لی تو کمپیوٹر نے چند لمحوں میں شان ہائٹ کی خوراک سے متعلق مشورہ فراہم کر دیا۔ اس

زرعی کمپیوٹر میں مویشیوں کی مکمل تفصیلات فیڈ کردی جاتی ہیں۔ مثلاً جانوروں کی خوراک، اُن کا وزن اور قد، بھُوسے اور چارے کا استعمال، دُودھ کی یومیہ مقدار اور بیماری کی نوعیت وغیرہ۔ معلوم ہُوا ہے کہ وفاقی جمہوریہ جرمنی میں اس قسم کے دو ہزار سے زائد ذاتی کمپیوٹر بھرپور طریقے سے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف ڈیری فارموں پر چھ ہزار سے زائد ذیلی کمپیوٹر بھی اپنا کام کر رہے ہیں۔ اس کمپیوٹر سسٹم کو میونخ کے انسٹیٹیوٹ آف ایگریکلچرل انجینئرنگ نے ملک کے بین الاقوامی شہرت کے حامل ادارے سیمنس کے تعاون سے متعارف کروایا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ کمپیوٹر موسم کی صورتِ حال سے بھی کسانوں اور ڈیری فارموں کے مالکان کو آگاہ کر سکتا ہے۔

کروڑوں ننھّے مزدور:

انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن نے حال ہی میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کے مطابق پانچ کروڑ بچّے جن کی عمریں دس اور چودہ سال کے درمیان ہیں اس بات پر مجبور کیے جاتے ہیں کہ وہ زندگی گزارنے کے لیے بڑوں کی طرح کام کریں۔ رپورٹ کے مطابق دُنیا بھر کے اس عمر والے بچّوں کا تناسب گیارہ فیصد ہے۔ ایک اور سنگین بات جس کا انکشاف رپورٹ میں کیا گیا ہے کہ چھ سات برس سے پندرہ برس کی عمر کے درمیان کام کرنے والے بچّوں کی مجموعی تعداد دس کروڑ روپے ہے۔ یہ بچّے صرف غیر ترقّی یافتہ ممالک ہی سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ترقی یافتہ ممالک کے بچّے بھی اس میں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ، برطانیہ، فرانس، مغربی جرمنی، اٹلی اسپین، پرتگال وغیرہ۔ صرف امریکہ میں ۵۰ لاکھ بچّے مزدوری کر کے پیٹ پالنے پر مجبور ہیں۔ دُکھ کی بات یہ ہے کہ اُن کو اُن کی مزدوری انتہائی کم ملتی ہے۔

☆

راہنما
۱۰۴ صفحات پر مشتمل
سچّی قرآنی کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ
قرآن کی یہ سچّی کہانیاں بچّوں کی تربیت میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں

اس کے حصول کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجیے

اپنے دانتوں کو مزے سے صاف کیجئے

کرسٹل کے تین ذائقے تینوں مزے دار
کرسٹل ریڈ جیل میں چیری، گرین جیل میں
منٹ اور کرسٹل وہائٹ میں منٹ فریش۔

کرسٹل سے برش کیجئے، ٹوتھ پیسٹ کا مزا
لیجئے دانت ہمیشہ صاف، چمکدار اور کیڑا
لگنے سے محفوظ۔

Crystal
سانس خوشگوار، دانت چمکدار

خوف کے خول

مصنوعی اور خوفناک چہروں کی تیاری کے تصویری مناظر

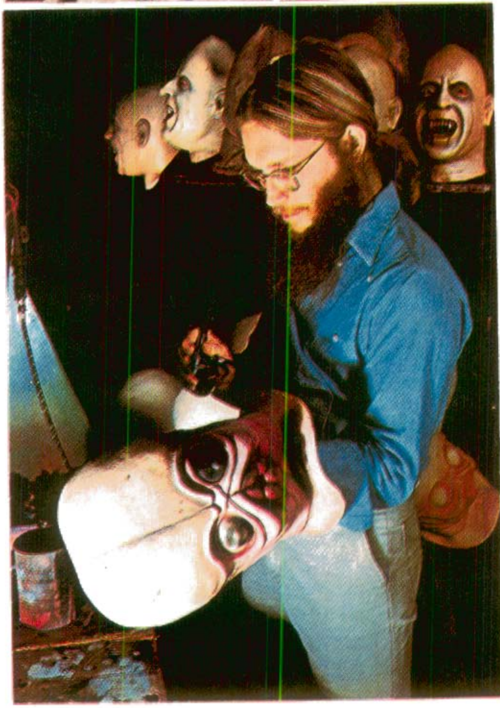

۵

۱۔ ماسک کی تیاری سے پہلے سانچے کی تیاری کا مرحلہ

۲۔ سانچے کی تیاری کا دوسرا مرحلہ

۳۔ ڈریے نہیں اس خول کے اندر ایک نرم دل انسان چھپا ہوا ہے۔

۴۔ ماسک بنانے والوں نے سابق امریکی صدر ریگن کو بھی نہیں بخشا۔

۵۔ خوبصورت چہرے کے ہاتھوں خوفناک چہرے کی تیاری کا ایک منظر

بھوت فیکٹری

انسان مزید خوفناک کیوں بننا چاہتا ہے

ترجمہ: مشہود شہزاد

آپ نے ایسے کئی مکانوں، درختوں اور جگہوں کے بارے میں سُنا ہوگا۔ جہاں جن، بھوت بسیرا کرتے ہیں۔ شہر بلکہ گاؤں میں تو کوئی نہ کوئی گھر یا جگہ ایسی ضرور ہوتی ہے۔ جس کے متعلق گاؤں کے لوگوں میں مشہور ہوتا ہے کہ وہاں آسیب رہتے ہیں۔ پھر بہت بعد میں پتا چلتا ہے کہ سب کچھ جھوٹ تھا، وہم تھا اور افواہیں تھیں۔ مگر ہم آپ کو آج ایک ایسی جگہ کی سیر کروا رہے ہیں۔ جہاں واقعتاً جن، بھوت اور چڑیلیں پائی جاتی ہیں۔

یہ جگہ ہے امریکی فلم انڈسٹری ہالی ووڈ کا ڈان پوسٹ اسٹوڈیو جو دُنیا بھر میں جن، بھوت اور چڑیلیں بنانے کے حوالے سے مشہور ہے۔ اس اسٹوڈیو کا ہر کمرہ

اور ہر کمرے کا ہر کونا بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن ہے۔ اس اسٹوڈیو میں بڑے بڑے دانتوں اور لمبے لمبے ناخنوں والی چڑیلیں خوفناک چہرے والے بھوت اور روحیں چھت سے لٹکی ہوئی اور زمین پر رکھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مگر یہ اصلی نہیں بلکہ نقلی بھوت پریت ہیں۔ پلاسٹک سے بنائے ہوئے، ہالی ووڈ اور دُنیا کے دیگر ممالک میں جتنی بھی خوفناک فلمیں HORROR MOVIES بنائی جاتی ہیں۔ اُن میں سے اکثر فلموں میں اس اسٹوڈیو کے بنائے ہوئے چہرے یعنی ماسک استعمال ہوتے ہیں۔ فلموں کے علاوہ عام پارٹیوں میں استعمال ہونے والے ہبّو جیسے ماسک بھی ان اسٹوڈیو میں تیار ہوتے ہیں۔

یہ اسٹوڈیو ہر سال سینکڑوں اقسام کے ہزاروں ماسک تیار کرتا ہے یہ ماسک LATEX نام کی ہلکی پھلکی ربر سے بنائے جاتے ہیں۔ ماسک کی

تیاری کے لیے جوتوں کی طرح کے فرمے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ربر کو پگھلا کر ان فرموں میں ڈال دیا جاتا ہے اور پھر جب یہ ربر سوکھ کر سخت ہو جاتی ہے تو اُسے فرمے سے نکال لیا جاتا ہے۔

ڈان پوسٹ اسٹوڈیو میں ماسک بنانے کے کام کا آغاز اسٹوڈیو کے موجودہ مالک ڈان پوسٹ کے والد نے تقریباً بیالیس سال قبل کیا تھا۔ والد کی وفات کے بعد خود ڈان پوسٹ نے کالج میں میک اپ کی تربیت حاصل کی اور ماسک بنانے لگا۔ ڈان اسٹوڈیو میں ماسک بنانے والے مختلف فلموں اور ٹیلی وژن پروگراموں کے کرداروں کو دیکھ کر ماسک تیار کرتے ہیں۔ مثلاً مشہور فلموں اسٹار وار، ایلین اور مقبول ٹی وی پروگرام اسٹار ٹریک کے کئی خوفناک کردار ایسے ہیں جن سے اس اسٹوڈیو میں کام کرنے والے افراد نے ماسک بنانے کے سلسلے میں استفادہ کیا ہے۔ تاہم اسٹوڈیو میں ایسے ماسک بھی تیار کیے جاتے ہیں جو اسٹوڈیو میں کام کرنے والے افراد کے اپنے تخیل کی پیداوار ہوتے ہیں۔

ماسک ہزاروں سال سے انسانوں میں مقبول

تین مصنوعی اور ایک اصلی چہرہ --- فرق صاف ظاہر ہے

ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ قدیم زمانے میں جب انسان شکار پر گزر اوقات کرتا تھا۔ تو لوگ ہر شکار پر جانے سے قبل جو خصوصی تقریب منعقد کیا کرتے تھے۔ اُس تقریب میں عجیب و غریب قسم کے ماسک پہنا کرتے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اُن کا عقیدہ تھا کہ اس طرح کے ماسک پہننے سے اُنہیں شِکار میں کامیابی حاصل ہوگی۔

پُرانے زمانے میں لوگ جنگلوں میں دشمنوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے بھی اس طرح کے ماسک پہن کر جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں لوگوں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ خوفناک ماسک پہن کر وہ تمام شیطانی قوتوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔

اُس دور میں جب کہ پلاسٹک موجود نہیں تھی، تو لوگ لکڑی، فر اور سونے سے ماسک تیار کیا کرتے کرتے تھے۔

آج بھی ماسک لوگوں میں پہلے زمانے کی طرح مقبول ہیں۔ ماہرین اس کی نفسیاتی توجیہہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ ماسک پہن کر انسان کچھ دیر کے لیے اپنے اصل وجود سے مختلف محسوس کرتا ہے۔ اس لیے وہ آج بھی ذوق و شوق سے ماسک پہننا پسند کرتا ہے۔ آپ نے بھی کبھی نہ کبھی کاغذ وغیرہ کے بنے ہوئے خوفناک چہرے ضرور پہنے ہوں گے۔ اور اپنے سے چھوٹی عمر کے بچوں کو ڈرایا ہوگا۔ شرمائیے مت، ہم کسی سے کہہ تھوڑی رہے ہیں۔

مسکن ۔ رہنے کی جگہ ۔ گھر

ماسک ۔ مصنوعی چہرہ

بغداد

پی آئی اے کے فضائی نقشے پر دوبارہ

منگل کے روز

پی آئی اے نہایت مسرت سے بغداد کے لئے اپنی پرواز کے دوبارہ آغاز کا اعلان کرتی ہے۔
ہماری بوئنگ ۷۰۷ پرواز ہر منگل کو شام کے پرسہولت اوقات میں بغداد کے لئے روانہ ہوا کرے گی۔
پی آئی اے بڑے فخر سے قومی پرچم کو بین الاقوامی فضاؤں میں لے کر جاتی ہے اور زیادہ سے زیادہ مسافروں کو چار براعظموں میں پرسہولت فضائی رابطہ فراہم کرتی ہے۔

منگل	دن	بدھ
۲۶۱	پرواز نمبر - پی کے	۲۶۲
بوئنگ ۷۰۷	طیارہ	بوئنگ ۷۰۷
سوپنی/اکانومی	درجہ	سوپنی/اکانومی
۱۸۰۰	روانگی کراچی آمد	۰۳۰۰
۲۰۰۰	آمد بغداد روانگی	۲۱۳۰ منگل

تمام اوقات مقامی ہیں۔

مزید معلومات کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا پی آئی اے کے قریب ترین بکنگ آفس سے رابطہ قائم کیجئے۔

PIA پی آئی اے
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز

PID(ISLAMABAD)

IAL PIA-28-88

وہ رات اور کالا باغ

شین فاروقی

پہلے اڑتی ہوئی ہنڈیا آئی پھر کفن پوش مردے نے تعاقب کیا۔

یہ خوفناک کہانی قیامِ پاکستان سے ایک سال قبل کی ہے، ان دنوں ہم ہندوستان کے ایک قصبے بگھرہ میں رہتے تھے۔ یہ قصبہ یوپی کے ضلع مظفر نگر سے آٹھ کلو میٹر دُور آج بھی واقع ہے۔

اُن دنوں میں ایک بچّہ تھا۔ چودہ برس کی عمر کو آپ لڑکپن کہیں گے یا نوجوانی؟ کم از کم میں تو لڑکپن ہی کہوں گا۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ شہر کے برعکس گاؤں اور قصبوں میں لڑکپن قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتا پھر میری عمر تو اُس وقت صرف چودہ برس تھی۔ اُن دنوں میں قصبے کے ماڈل اسکول میں ساتویں کلاس کا نصابی پڑھائی سے بیزار طالب علم تھا۔ اماں کے بقول میرے اندر اس کے سوا اور کوئی بُرائی نہیں تھی۔

میرے بابا کسان تھے۔ ہم اگرچہ بہت امیر نہیں تھے لیکن پھر بھی قصبے بھر میں ہمارے گھر کا شمار خوشحال گھرانوں میں ہوتا تھا۔ میرے بابا سخت مذہبی، محنتی اور شریف انسان تھے۔ اماں کے بارے میں مَیں صرف

اتنا ہی کہوں گا کہ وہ ایک ماں تھیں ایک اچھی ماں - میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا -

ہمارا قصبہ گنّے اور چاول کی کاشت کے حوالے سے پورے ضلع میں مشہور تھا. یہ قصبہ ایک اور حوالے سے بھی دُور دُور تک شہرت رکھتا تھا " کالے باغ" کے حوالے سے - کالا باغ ہمارے گھر سے تقریبًا ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا - یہ باغ ہمارے قصبے کے ایک بڑے حصّے کو جنگل سے جُدا کرتا تھا. قصبے کے اکثر کسانوں کو اپنے کھیتوں پر جانے کے لیے روزانہ اس باغ سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا -

اُس باغ کا نام اس لیے کالا باغ نہیں تھا کہ خدانخواستہ اس میں کالے درخت لگے ہوئے تھے - بلکہ اس کی وجہ اُس کا انتہائی گنجان ہونا تھا - یہ باغ اس قدر گنجان تھا کہ دن میں بھی اس کے بیشتر حصّے میں اندھیرا چھایا رہتا تھا - کالے باغ میں شیشم، آم، اِملی، گولر اور نہ جانے کِس کِس چیز کے درخت تھے -

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اس باغ کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں سُن رہا تھا - مثلاً یہ کہ کالے باغ کے کونے میں جو مزار ہے اس پر ہر چودھویں کی رات کو بھیڑیے اپنی زبانوں سے جھاڑ و دینے آتے ہیں - کالے باغ میں گولر کا جو درخت ہے اُس پر ہر سال جو ایک پھُول کھِلتا ہے اُسے کوہِ قاف کی پریاں توڑ کر لے جاتی ہیں - کالے باغ میں ایک ہزار برس کی عمر کا ایک سیاہ ناگ رہتا ہے - جس کے سر پر ایسا روشن تاج ہے جسے اگر لوہے سے چھُو دو تو لوہا سونا بن جائے - یہ ناگ کالی راتوں میں اپنے بِل سے نکلتا ہے اور اُس تاج کو زمین پر رکھ کر اُس کی روشنی میں گھاس پر موجود شبنم پیتا ہے - اگرچہ قصبے کے کسی شخص کو اِن واقعات کا تجربہ نہیں تھا مگر سب کو یقین تھا کہ یہ سب چیزیں باغ میں موجود ہیں - قصبے میں میرے بابا شاید واحد آدمی تھے جو ان پُراسرار قصّوں پر رتّی برابر بھی یقین نہیں رکھتے تھے - وہ ہمیشہ ان قصّوں کا مذاق اُڑایا کرتے تھے -

کالے باغ کی خوفناکی میں دو اور چیزوں کا ہاتھ تھا - باغ میں ہر طرف بے شمار ٹوٹی پھوٹی زمین میں دھنسی ہوئی قبریں تھیں اور مشہور تھا کہ باغ میں ایک ایسا بجّو بھی رہتا ہے جو رات گئے ان قبروں کو اُکھاڑ کر مُردوں کو کھا جاتا ہے - باغ میں موجود قبروں کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ یہ قبریں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شہید ہونے والوں کی ہیں - - بجّو کو کئی بار میں نے خود دیکھا تھا - میں ہر روز دوپہر کو بابا کا کھانا لے کر اسی باغ کے راستے جنگل جایا کرتا تھا - میں اپنی عمر کے بچّوں میں شاید واحد بچّہ تھا جو دن میں بغیر کسی کو ساتھ لیے اس باغ سے گزرتا تھا - بڑے لوگ دن میں تو اس باغ سے گزر جاتے تھے مگر رات کو کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ باغ سے گزرے قصبے کے لوگوں میں مدّتوں سے ایک شرط لگتی تھی - آدھی رات کو کالے باغ کے گولر پر چاقو سے نشان

لگاکر آنے کی ۔ کئی لوگوں نے شرط قبول کی اور ہار گئے ۔ کہتے ہیں برسوں پہلے ایک آدمی نے شرط جیت لی تھی لیکن وہ شرط جیتنے کے چار روز بعد بخار میں مُبتلا ہوکر مَر گیا تھا ۔

ایک بار سردیوں کے دن تھے کہ بابا کو ہلکا بخار آگیا ۔ اُس رات طے شدہ طریقۂ کار کے مطابق کھیتوں میں پانی دینے کی ہماری باری تھی ۔ اور ہمیں رات ایک بجے علاقے کے دوسرے کسان سے پانی لے کر اپنے کھیتوں کو دینا تھا ۔ اُس رات ہندوؤں کا تہوار ہولی تھا ۔ ہمارے تینوں ہندو نوکر ہولی منانے میں مصروف تھے ۔ چنانچہ بابا کو خود ہی پانی دینے کھیتوں پر جانا تھا ۔ ماں نے اس خیال سے کہ میں بابا کی کچھ مدد کر دوں گا مجھے بابا کے ساتھ جنگل جانے کی ہدایت کی ۔ پہلے تو میں ڈرا ، کیونکہ میں کبھی رات کے وقت جنگل نہیں گیا تھا ۔ پھر خیال آیا ۔ بابا بخار کی حالت میں اکیلے پریشان ہوں گے سو میں نے ہامی بھر لی ۔

اُس رات ہم بارہ بجے گھر سے روانہ ہونے لگے تو امّی نے کالے جادو سے بچاؤ کا وہ تعویز جو انھوں نے قصبے کے مولانا سے بنوا کر رکھا ہوا تھا ۔ میرے بازو پر باندھ دیا ۔ بابا امّاں کی طرف دیکھ کر مُسکرائے ۔

"آپ کیوں مُسکرا رہے ہیں جی ۔ ... آج ہولی کی رات ہے مُوئے کالا جادو سیکھنے والے آج کی رات اپنے جادو کو آزمانے کے لیے جادو کی ہنڈیا چھوڑتے ہیں ۔" امّاں نے بُرا مان کر گردن ہلاتے ہوئے کہا ۔ امّاں بابا کے مُسکرانے کا مطلب نہیں سمجھی تھیں ۔ بابا شاید اس بات پر مُسکرائے تھے کہ آج سے پہلے امّاں یہ تعویز ہمیشہ اُن کے بازو پر باندھا کرتی تھیں ۔

امّی نے جادو کی ہنڈیا کا نام لیا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے ۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی لوگوں سے سُنا تھا کہ ہولی کی رات کو کالا جادو سیکھنے والے مٹّی کی ہانڈیوں پر اپنے مخصوص منتر پھونک کر اُنہیں ہوا میں اُڑا دیتے ہیں ۔ یہ ہانڈیاں رات کے بارہ بجے کے بعد اُڑتی ہیں اور گھر سے باہر موجود کسی بھی شخص کے سر پر جا گرتی ہیں ۔ اگر وہ آدمی مَر جائے تو جادوگر کو پتا چل جاتا ہے کہ اب وہ کالے جادو کا ماہر ہوگیا ہے ۔ لیکن اُس وقت یہ بات میرے ذہن میں بالکل نہیں تھی ۔ امّاں نے اسے یاد دِلا کر مجھے خوفزدہ کر دیا ۔ بابا نے میرے منہ پر ہوائیاں اُڑتے دیکھیں تو بولے ۔

"ارے سب بکواس ہے ۔ گاؤں کے جاہل لوگوں کے ذہن کی پیداوار ۔ ان لوگوں کو اس طرح کی کہانیاں گھڑنے کے سوا کام ہی کیا ہے ۔" بابا نے یہ کہا اور کاندھے پر پھاوڑا رکھ اور لالٹین اُٹھا روانہ ہوگئے ۔ امّاں نے چلتے چلتے میرے کوٹ کی جیب میں ڈھیر ساری مونگ پھلیاں ڈال دیں ۔ میں مونگ پھلیاں کھاتا ہوا بابا کے پیچھے پیچھے چلنے لگا ۔

باباقرآن مجید کی تلاوت کرتے چل رہے تھے۔ بابادن میں بھی چلتے پھرتے تلاوت کرتے رہتے تھے۔ اور میں ہر روز اُن کو ایسا کرتے دیکھتا تھا مگر اس وقت مدھم مدھم آواز میں تلاوت کرتے بابا مجھے یکایک پُراسرار معلوم ہونے لگے تھے۔ ہندو لوگ ہولی کی خوشی میں پٹاخے چھوڑ رہے تھے اور اُن کی آوازیں ماحول کو اور خوفناک بنا رہی تھیں۔

گھر سے تھوڑی دُور آکر بابا نے کالے باغ کے راستے پر چلنا شروع کیا تو خوف سے میری روح فنا ہوگئی۔

"باباکیا اس راستے سے جائیں گے؟" میں نے باباکا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

"ہاں بیٹے....." بابا نے تلاوت کرتے کرتے جواب دیا۔

"نہیں بابا دوسرے راستے سے چلیئے" میں نے باباکا ہاتھ اور مضبوطی سے پکڑ کر اُنہیں اس راستے سے چلنے کے لیے کہا جو سڑک والا راستہ کھلا تھا اور بہت طویل تھا۔

"نہیں بیٹے دیر ہوجائے گی.... ہمیں وقت پر پہنچنا ہے.... ڈرو نہیں میں جو ہوں تمہارے ساتھ"

"مارے گئے" میں نے اپنے دل میں کہا اور باباکا ہاتھ پکڑ کر اُن سے تقریباً چپک کر چلنے لگا۔

"تم تو کہتے تھے میں بہادر ہوں" بابا نے مجھے اپنے ساتھ چپک کر چلتے دیکھا تو کہا۔ میں شرمندہ ہوگیا اور پھر اُن کا ہاتھ چھوڑ کر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس وقت میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور کالے باغ اور ہولی کے حوالے سے سُنی ہوئی تمام باتیں ایک کے بعد ایک میرے ذہن میں آرہی تھیں۔ ہم لمحہ لمحہ کالے باغ کے قریب ہوتے جارہے تھے۔

ابھی کالا باغ ہم سے دوسو گز دُور تھا کہ قصبے میں کسی نے قندیل آسمان میں چھوڑی۔ روشنی ہوئی تو میں نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی اور کانپ کر رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ جادو کی ایک ہنڈیا تیزی سے ہماری جانب اُڑتی چلی آرہی ہے۔

"بابا ہنڈیا" میں زور سے چیخا اور بابا سے لپٹ گیا۔ بابا نے گھوم کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اتنے میں ہنڈیا "سائیں" کرتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزر کر سامنے شیشم کے درخت پر جاگری۔ خوف کے عالم میں میرے کان بہت تیز ہوگئے تھے۔

"دھت تیرے کی.... یہ تو بگلا تھا" بابا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اُف میرے خدا" میں نے لمبا سانس کھینچا اور پھر بابا کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میرا دل اب بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم کالے باغ میں داخل ہوچکے تھے۔ میں ایک بار پھر بابا سے چپک کر

چلنے لگا۔ باغ کے پتلے سے راستے پر سوکھے پتّوں کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ پتّوں پر ہمارے چلنے سے چرچر کی آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ جو باغ میں بولنے والے جھینگروں کی آوازوں کے ساتھ مل کر نہایت پُراسرار ہوگئیں۔ میں تقریباً آنکھیں بند کیے چل رہا تھا۔ بابا کی تلاوت مسلسل جاری تھی۔

"کاش میں نے مولوی صاحب سے درود شریف پڑھ لیا ہوتا؟ یکایک مجھے خیال آیا۔ خیر **قل ھو اللہ** سہی" اور میں دھیرے دھیرے **قل ھو اللہ** پڑھنے لگا۔ اس وقت مجھے ہر لمحہ کسی حادثے کا انتظار تھا۔ بھیڑیے، پریاں، ناگ، بچّو.... باغ کا راستہ کوئی پانچ منٹ کا تھا لیکن اُس وقت لگ رہا تھا جیسے یہ صدیوں میں ختم ہوگا۔ جب ہم باغ سے صحیح سلامت نکل آئے تو میری جان میں جان آئی۔ اگرچہ مجھے باغ سے صحیح سلامت نکل آنے پر خوشی تھی مگر تعجّب بھی تھا کہ ایسا کیسے ہوگیا؟ ہمارے کھیت ابھی تقریباً ایک میل دُور تھے۔

وہ چاند کی چھٹی یا ساتویں رات ہوگی۔ ہر طرف ہلکا ہلکا نور پھیلا ہُوا تھا۔ جنگل کے کسی کونے سے ٹیوب ویل کے انجن کی ٹُھک ٹُھک اور قصبے میں واقع گنّا مِل کی کھٹ کھٹ کی آوازیں آرہی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے یہ آوازیں جنگل کے کھُلے ماحول میں آکر اوپر کہیں فضا میں گلے مِل کر رقص کر رہی ہیں۔ اِن آوازوں کے سوا جنگل میں ہر طرف گہرے سنّاٹے کا راج تھا۔ دن کے جنگل سے رات کا جنگل بالکل مختلف تھا۔ خوبصورت اور پُراسرار۔ چونکہ میں جادو کی ہنڈیا سے خوفزدہ ہوچکا تھا اس لیے مجھے اب ہر جھاڑی بھیڑیا اور راستے میں پڑی ہوئی لکڑی بھی سانپ نظر آرہی تھی۔ میں قدم قدم پر چونک رہا تھا۔ اوسان تھوڑے سے درست ہوئے تو میں پھر مونگ پھلیاں کھانے لگا۔ بیس منٹ بعد ہم اپنے کھیت پر تھے۔ بابا نے برابر والے کسان سے رات ٹھیک ایک بجے پانی لے کر اپنے کھیت کو دینا شروع کردیا۔ ہمارا کھیت چونکہ خاصا بڑا تھا۔ اس لیے اُس کے صبح نو دس بجے تک بھرنے کا امکان تھا۔ چنانچہ بابا نے ایک مرتبہ نہر سے کھیتوں تک پانی لانے والی دو فٹ چوڑی نالی کے ایک فٹ چوڑے اور دو فٹ اونچے پُشتوں کا جائزہ لینے کے بعد گھر کا رُخ کیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر بابا سے کہنا چاہا کہ دوسرے راستے سے چلیں لیکن چونکہ آتے ہوئے کالا باغ میں کوئی واقعہ نہیں ہُوا تھا۔ اس لیے میرا دل اب کچھ مضبوط ہوگیا تھا۔ جنگل میں اس وقت ہر طرف گہری دُھند پھیلی ہوئی تھی جس کے باعث دو قدم کے فاصلے پر موجود چیز بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہم دونوں لالٹین کی روشنی میں گھر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک مرتبہ پھر کالا باغ کسی خوفناک دیو کی طرح ہمارے سامنے تھا۔

ہم کالے باغ میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ لالٹین کی لَو اچانک تیزی سے بھڑکنے لگی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور میری ناک کو تیز ٹھنڈ کا احساس ہُوا۔

"لگتا ہے لالٹین کی بتّی پر میل آگیا ہے۔ میں نے تمہاری ماں سے کہا تھا کہ نئی بتّی ڈال دینا مگر اُس نے ڈالی ہی نہیں۔" بابا نے لالٹین کی لَو کے بھڑکنے پر تبصرہ کیا۔

ہم کالے باغ میں داخل ہوئے تو یکایک میری نظر باغ کے اُس کونے کی طرف اُٹھ گئی جہاں مزار واقع تھا۔ وہاں ایک مدھم سی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔

"بابا ناگ!" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں بٹیا وہ دیا جل رہا ہے۔" بابا نے توجہ دیے بغیر کہا۔

جب ہم باغ میں موجود قبروں کے درمیان سے گزر رہے تھے تو نہ جانے کیوں میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔

"کاش بابا قبر کے مُردوں کو سلام نہ کریں۔" میں نے سُن رکھا تھا کہ کبھی کبھی مُردے سلام کا جواب بھی دے دیتے ہیں۔

"اگر بابا نے سلام کیا اور کسی مُردے نے جواب دے دیا تو ...."

میرے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ ابھی یہ خیال میرے ذہن سے نکلا بھی نہیں تھا کہ بابا نے تلاوت روک کر کہا۔

"السلام علیکم یا اہل القبور"

"وعلیکم السلام" ، ہمارے پیچھے سے ایک مدھم سی آواز آئی۔ میں دہشت زدہ ہو کر پیچھے کی طرف گھوما تو دیکھا کہ ایک مُردہ کفن پہنے ہمارے پیچھے چلا آرہا ہے۔ اندھیرے میں اُس کا سفید بُراق کفن صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسی لمحے لالٹین کی لَو آخری بار بھڑک کر بُجھ گئی۔ میں نے ایک زوردار چیخ ماری۔ میری چیخ کے ساتھ ہی بابا نے گھوم کر پیچھے کی جانب دیکھا اور پھر "یا اللہ خیر" کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوگیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ ابھی ہم چند ہی قدم دوڑے ہوں گے کہ بابا درخت کی ایک شاخ سے ٹکرائے اور اُن کے ہاتھ سے میرا ہاتھ چھوٹ گیا۔ مجھے بابا اور لالٹین کے گرنے کی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔ میں اندھیرے میں اندازاً بابا کی طرف جھپٹا تو ایک گڑھے میں منہ کے بل جا گرا۔

گڑھے میں گرنے کے چند لمحوں بعد مجھے احساس ہوا کہ میرا گال سیدھی رکھی ہوئی کسی چھوٹی سی کٹوری پر

جا ٹکا ہے۔ یکایک میرے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال کوندا۔

"کہیں میں گڑھے کی بجائے کسی دھنسی ہوئی قبر میں تو نہیں پڑا ہُوا..... اور میرا گال کسی انسانی کھوپڑی .....!" اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا۔ مجھے لگا کہ میں پیروں کی جانب سے پتھر کی مورتی میں تبدیل ہوتا جا رہا ہوں۔۔ اگلے ہی لمحے اپنی جگہ سے ایک اِنچ کھسکے بغیر میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں اپنے گھر میں بستر پہ لیٹا ہوا ہوں۔ اماں نے مجھے تھوڑی دیر بعد بتایا کہ میں پچھلے آٹھ دن سے بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ بابا کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ بابا بے ہوشی کی حالت میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد "مُردہ..... مُردہ" کہہ کر چیخ رہے تھے۔

اماں سے معلوم ہُوا کہ اُس رات کے بعد آنے والی صبح کو جب ہمارے قصبے کے دو کسان اپنے کھیتوں پر جا رہے تھے تو انہوں نے ہم دونوں کو کالے باغ میں بے ہوش پڑا پایا تھا۔ میں زمین میں دھنسی ہوئی ایک قبر میں اور بابا درخت کے پاس بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ پورے قصبے میں ہماری پُراسرار بے ہوشی موضوعِ گفتگو بنی ہوئی تھی۔ اور اب تک ہمارے بارے میں طرح طرح کے قصّے دُور دُور تک مشہور ہو چکے تھے۔

کئی مولوی اور پنڈت اب تک اماں سے بھُوت اُتارنے کی مد میں ہزاروں روپے اینٹھ چکے تھے۔ میرے ہوش میں آتے ہی میرے اِرد گرد موجود محلّے داروں اور رشتے داروں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے اُنھیں لڑکھڑاتی زبان سے اُس رات جو کچھ ہم پر گزری تھی کہہ سُنائی۔ وہ لوگ میری ہمت بندھانے کی بجائے دیر تک کالے باغ سے متعلق کہانیوں پر آپس میں بحث کرتے رہے۔

میرے ہوش میں آنے کے تین روز بعد بابا بھی ہوش میں آ گئے۔ پھر بابا آہستہ آہستہ نارمل ہو کر اپنے روز مرّہ کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ اگرچہ بابا پہلے بھی بہت کم بولتے تھے لیکن اب تو وہ سوائے کام کی بات کے اور کوئی بات ہی نہیں کرتے تھے۔ بابا نے اب رات کو جنگل جانا چھوڑ دیا تھا۔ دن میں بھی اب وہ کسی دوسرے شخص کو ساتھ لے کر دوسرے راستے سے ہی جنگل جاتے تھے۔ اس واقعے کے بعد کالے باغ کی دہشت اور ہولناکی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اور لوگوں نے دن میں بھی کالے باغ سے گزرنا چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں بعد پاکستان بن گیا، اور ہم ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔

پاکستان آنے کے بعد اگرچہ بابا مکمل طور پر صحت مند ہو گئے تھے۔ لیکن اب اُن کو ہر چیز سے خوف آنے لگا تھا۔ خاص طور پر سفر سے۔ وہ سفر کرنے سے بڑی حد تک پرہیز کرتے اور اگر کہیں مجبوراً جانا پڑ جاتا تو سفر کے دوران مسلسل دُعاؤں کا وِرد کرتے رہتے۔ بابا کا یقین ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ ظاہر ہے اگر کسی کے ساتھ ایسی بات

ہوجائے جس کے ہونے کا اُسے گمان تک نہ ہو تو ایسی حالت کا ہوجانا فطری بات ہے۔

پاکستان آنے کے چار سال بعد ایک دن ہمیں اپنے سابق محلّے دار کلیم حسین کے بیٹے صغیر کا خط ملا۔ خط بابا کے نام تھا لکھا تھا کہ اُس کے والد کا چند ماہ قبل انتقال ہوگیا ہے۔ مرنے سے پہلے انہوں نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی تھی کہ وہ میرے بابا کو خط لکھ کر بتا دے کہ اُس رات کلیے باغ میں بابا اور میں نے کوئی مُردہ نہیں دیکھا تھا بلکہ وہ صغیر کے والد یعنی کلیم حسین خود تھے۔ جو ہماری طرح رات کو اپنے کھیتوں میں پانی دے کر واپس لوٹ رہے تھے۔ ہمارے بے ہوش ہوجانے نے کلیم حسین کو بدحواس کر دیا تھا اور وہ ہمیں اُٹھانے کے بجائے گھر بھاگ آئے تھے۔ پھر ہماری طویل بے ہوشی نے اُنہیں اتنا شرمندہ کر دیا کہ وہ ہمارے پاس آکر کبھی ہمیں یہ بات نہ بتا سکے۔ خط میں بابا سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کلیم حسین کو معاف کر دیں۔ میرا خیال تھا کہ بابا خط کو درست سمجھتے ہوئے کلیم حسین کو معاف کر دیں گے۔ مگر بابا نے خط ختم کرتے ہی اُسے ایک مذاق قرار دے کر پھاڑ پھینکا۔

بابا آج برسوں بعد بھی اس خط کو مذاق ہی سمجھتے ہیں۔ میں ابھی پچھلے برس دوبارہ ہندوستان گیا تو اپنے قصبے میں بھی گیا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ کالے باغ سے آج بھی قصبے کے لوگ اُسی طرح خوف کھاتے ہیں۔ اور اس سے پُراسرار اور دہشتناک قسم کے واقعات منسوب کرنے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ معلوم نہیں سچ کیا ہے، آپ ہی بتایئے؟

عاقبت بینی

ایک شخص ایک سُنار کے پاس سونا تولنے کے لیے ترازو مانگنے گیا۔ سنار نے کہا: "بھائی جاؤ میرے پاس چھلنی نہیں" وہ بولا "مذاق نہ کرو، مجھے چھلنی نہیں ترازو چاہیے۔" سُنار نے کہا "میاں وقت ضائع نہ کرو۔ میرے پاس جھاڑو بھی نہیں ہے۔" سائل نے کہا "مسخرہ پن چھوڑو۔ ترازو دے دو۔ اِدھر اُدھر کی باتوں سے ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔" سُنار کہنے لگا۔ "میں پاگل نہیں ہوں، میں نے تمہاری بات سُن لی تھی۔ میرا جواب بھی مہمل نہیں۔ تم بوڑھے آدمی ہو، تمہارے ہاتھ میں رعشہ ہے، تمہارا سونا بھی چُورے کی شکل میں ہے۔ اُسے تولوگے تو ہاتھ کانپے گا۔ اور سونا گر جائے گا۔ تب تم کہوگے کہ بھائی جھاڑو دو تاکہ میں سونا اکٹھا کروں۔ پھر تم اس سے مٹی الگ کرنے کے لیے چھلنی طلب کروگے۔ میں نے پہلے ہی تمہارے کام کا انجام دیکھ لیا ہے اس لیے کہیں اور جاؤ۔" جو صرف آغاز کو دیکھتا ہے وہ اندھا ہے، جو انجام پر نظر رکھتے وہ عقل مند ہے۔ جو شخص پہلے ہی سے آئندہ ہونے والی بات سوچ لے وہ انجام کار کبھی شرمسار نہیں ہوتا۔

(ماخوذ از مثنوی مولانا رومؒ)

(محمد انجم مبین، ڈیرہ اسماعیل خان)

خوف + ناک = خوفناک

محمد جاوید خالد کی شگفتہ تحریر

"امی جان!! میری ناک کیسی ہے؟

"بہت اچھی ہے" انہوں نے پیار سے کہا، "کھڑی کھڑی، تیکھی سی"۔

قارئین حیران ہوں گے کہ یہ بیٹھے بیٹھے ہمیں ناک کی کیا سوجھی، مگر ہم یہ بھی تسلیم کیئے لیتے ہیں کہ ایک عرصہ تک ہم "خوف ناک" سے مراد ایسی ناک سمجھتے رہے جس کو دیکھ کر خوف آتا ہو۔ پڑھتے ہوئے ہم نے کئی اقسام کی ناکوں کے بارے میں پڑھا تھا، جیسے ستواں ناک، کھڑی ناک، اونچی ناک، طوطے جیسی ناک، کٹ جانے والی ناک وغیرہ۔

تو پیارے ساتھیو! اس دن ہم خوشی کے ساتھ ساتھ الجھن میں، اس "خوف ناک" والی الجھن میں گرفتار رہے۔ موقع موقع سے آئینہ کے سامنے جاکر کھڑے ہوتے رہے، اور بطور خاص اپنی ناک کا جائزہ لیتے رہے وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے اردو کے ماسٹر صاحب کا جنہوں نے اسکول چھوڑتے وقت ہمیں نصیحت کی تھی کہ۔۔۔ "کسی لفظ کو زیادہ تنگ کرنے کا موقع نہ دو، فوراً لغت (Dictionary) استعمال کرو"۔ لغت اٹھائی کہ لاؤ دیکھو تو سہی اس خوفناک کے بارے

میں لغت والے کیا کہتے ہیں، اور پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم "خوفناک" کے معنیٰ فرض کیئے بیٹھے تھے کسی اور کو نہیں بتائے، ورنہ کسی اور کا کیا ذکر ہمارے بھائی جان ہی وہ ریکارڈ لگاتے کہ خدا کی پناہ۔

ہائے! ہماری زبان، پیاری زبان، میٹھی زبان، اردو زبان، ذہن کے گوشوں اور دل کی گہرائیوں میں جگہ بنا لینے والی اور بہت سے لوگوں کے بقول آسان اور عام فہم زبان ہمیں کئی دفعہ مشکلوں میں ڈال گئی۔ ہم ایک عرصہ تک "بے کار" صرف اس شخص کو سمجھتے رہے جس کے پاس کار نہ ہو، کسی کی "بے بسی" پر ہمارا دل بہت کڑھتا رہا کہ افسوس کس قدر غریب شخص ہے بس کا کرایہ تک نہیں رکھتا۔ اور تو اور ایک دفعہ جب ہم نے ماسٹر صاحب سے "آمد" کے معنی پوچھے تو کچھ دیر تو وہ ہمیں مسکرا کر دیکھتے رہے پھر دوسرے ماسٹر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا "دیکھتے ہو اب ہمارے شاگرد فارسی الفاظ کے معنی بھی جاننے کی کوشش کر رہے ہیں"۔ پھر ہمیں شاباش دی، پھر آمد کے معنی بتائے۔ "آیا، آئی"۔ ہم اس شاباش پر خوش تو بہت ہوئے مگر جملے میں جب یہ معنی لگائے تو دیر تک سر میں درد ہوتا رہا۔ جملہ جو ہم نے پڑھا تھا یہ تھا کہ "گائے بہت کارآمد جانور ہے" کئی دنوں تک حیرانی بلکہ پریشانی رہی، بہرحال ان تمام "سانحات" کے باوجود اس بات پر ہم آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ اردو بہت میٹھی اور جلد سمجھ میں آجانے والی زبان ہے، مگر اس جلد کو بہت جلد بھی نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بغیر محنت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، چاہے وہ اردو زبان مادری زبان ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ بعض اوقات بہت زیادہ محنت کے بعد بھی بہت کم حاصل ہوتا ہے، اب جیسے یہ دیکھ لیں کہ ہم نے "خوفناک" کے معنی بہت اچھی طرح جان لیئے اور اب ہم سے کوئی پوچھے تو الفاظ کی مدد سے، شکلوں کی مدد سے یقیناً اسے اچھی طرح سمجھا بھی لیں گے مگر ہزار کوشش کے باوجود یہ بات ہم پر آج تک نہیں کھلی کہ آخر ڈر کا یا خوف کا اس قدر گہرا تعلق "ناک" ہی سے کیوں ہے، آپ یقیناً ڈر اور خوف والی کیفیات سے کبھی نہ کبھی گذرے ہوں گے، یا آپ نے ان کیفیتوں کے بارے میں پڑھا ہوگا، ممکن ہے آپ نے ڈرا ہوا یا سہما ہوا کوئی شخص دیکھا بھی ہو۔ ہمارے مشاہدات کے مطابق خوف کے مندرجہ ذیل نتیجے سامنے آتے ہیں۔

چہرہ پیلا پڑ گیا، رنگ زرد ہو گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہونٹ لرزنے لگے۔ حلق خشک

ہوگیا۔ بدن کانپنے لگا۔ ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ پاؤں سُن ہوگئے۔ پاؤں من من کے ہوگئے۔ مساموں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ بہہ نکلا۔

ہوسکتا ہے دوستوں کے پاس اس سے زیادہ مشاہدات ہوں مگر عام طور پر انہیں سے واسطہ پڑتا دیکھا، سنا اور پڑھا گیا ہے، اب آپ اس فہرست کو ایک دفعہ اور پڑھیئے اور بتایئے کہ خوف کے ان نتائج میں کہیں "ناک" کا ذکر ہے؟ کبھی آپ نے سنا کہ خوف کے مارے ناک پیلی پڑگئی، ناک کے آگے اندھیرا چھا گیا، ناک پھٹی کی پھٹی رہ گئی، ناک کھڑی ہوگئی، ناک لرزنے لگی، ناک خشک ہوگئی، ناک کانپنے لگی، ناک کپکپانے لگی، ناک سُن ہوگئی یا مَن مَن کی ہوگئی، یا خوف کے مارے ناک سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ بہہ نکلا۔ ٹھنڈا پسینہ تو دور کی بات ہے ہم نے خوف کے مارے کسی کی ناک بہتے بھی نہیں سنا، نزلہ تک نہیں ہوتا اس خوف سے۔ پھر یہ "خوف ناک"؟؟

افسوس کہ ہم ماہر لسانیات نہیں ہیں اور پھر ہمارا فرمایا ہوا مستند بھی نہیں ہے، ورنہ ناک ایسی قیمتی چیز کو اس بری طرح رسوا کرنے پر ہم ضرور کوئی تحریک چلاتے کہ اے زبان والو کچھ "خدا کا خوف" کرو، کوئی چیز یا منظر محض "خوف ناک" ہی کیوں بناتے ہو، خوف آنکھ، خوف منہ، خوف حلق، خوف ٹانگ وغیرہ وغیرہ کیوں نہیں بناتے۔ ہائے!! آدمی کچھ کرنا چاہے اور نہ کرسکتا ہو کس قدر "الم ناک" کیفیت ہوتی ہے۔ ارے ہاں یہ "الم ناک" بھی تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر رہنے دیجئے بات لمبی ہوجائے گی پھر "خطرناک" بھی یاد آئے گا اور اگر خدانخواستہ کہیں ایڈیٹر صاحب "خوفناک" طور پر "غضب ناک" ہوگئے تو مضمون دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ اس لیئے اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

تعلیم الاسلام ۴ حصے

اسلام کی بنیادی معلومات
جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کار ثواب ہے

تالیف: مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب

تعلیم الاسلام کے چاروں حصے مُفت منگوانے کے لیے
صرف ۲/ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کردیجئے۔

یہ پنجے مختلف پرندوں کے ہیں. کیا آپ ان کے نام بتا سکتے ہیں

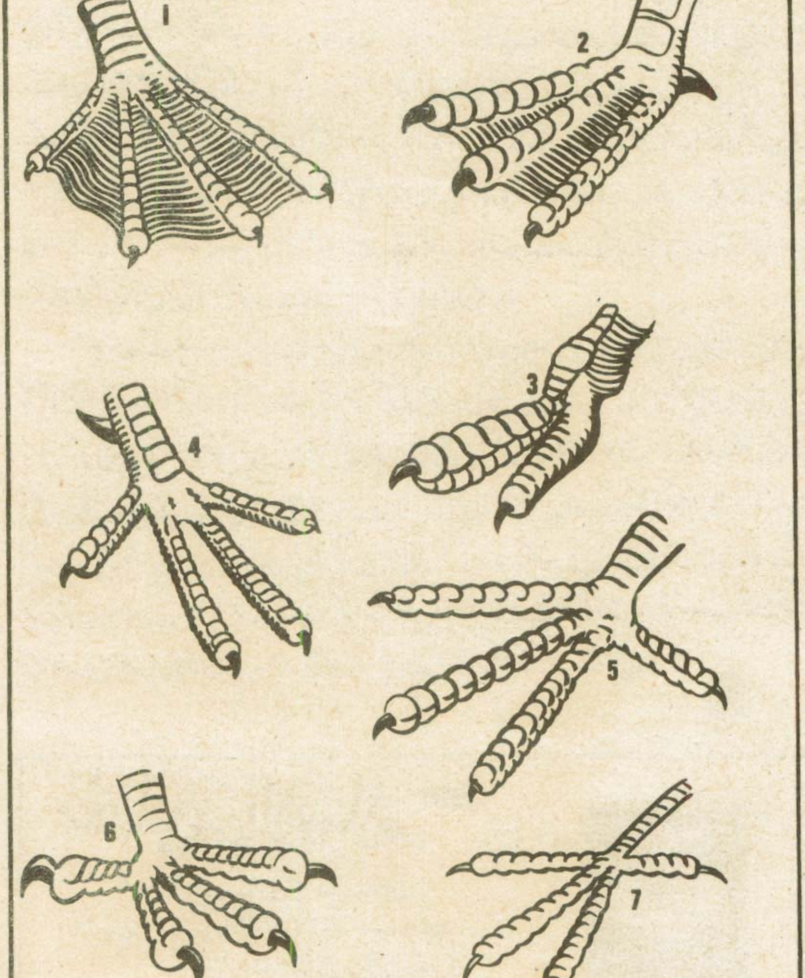

(۱) مور (۲) راج ہنس، قاز (۳) شتر مرغ (۴) تیتر (۵) بگلا (۶) باز (۷) تنبرہ

بلند حوصلہ بچّی

پیاری پیاری دس سالہ بریجٹ ایلس امریکہ کی تنہا جہاز اُڑانے والی کم عمر ترین پائلٹ ہے۔ ایلس نے حال ہی میں نہایت کامیابی کے ساتھ پرواز کرکے دُنیا بھر کے بچوں کے لیے جرأت و بے باکی کی ایک مثال قائم کی ہے

دو بے مثال بچّے

ابوّ کا مددگار

ٹرک کے کور کو درست کرتا ہوا یہ بچّہ نو سالہ بریٹ ہارکی ہے۔ بریٹ چھٹیوں کے دنوں میں اپنے ٹرک ڈرائیور ابّو کے ساتھ دُور دراز کا سفر کرتا ہے اور وقت پڑنے پر ابّو کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ بریٹ کو ابّو کا ہاتھ بٹاکر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ آپ بھی بریٹ کی طرح ابّو کا ہاتھ بٹاتے ہیں نا!

Montgomery
tea time
Montgomery
Montgomery
Montgomery
The Height of Delight!

منتخب لطائف
اور مزے دار کارٹونز کے

کھٹے میٹھے

انعامی لطیفہ

میاں بیوی شام ڈھلے شاپنگ کرکے گھر لوٹ رہے تھے۔ آسمان پر چاند ابھی نکلا ہی تھا۔ چلتے چلتے بیوی نے آسمان کی جانب دیکھا اور شوہر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی
"اللہ۔ دیکھیے کتنا اچھا چاند ہے۔"
شوہر جو من ہی من میں شاپنگ کا حساب کتاب کرنے میں مصروف تھا، بڑبڑا کر بولا۔
"بیگم اِسے اگلی تنخواہ میں خرید لیں گے۔"

محمود محمد اشرف۔ باتھ آئی لینڈ کراچی

گاہک (بیرے سے) "دیکھو شوربے میں مکھی تیر رہی ہے۔"
بیرا "مگر جناب یہ بھی تو دیکھئے کس خوبصورتی سے تیر رہی ہے۔"

شہزاد افضال، پشاور

جدید دور کی ایک بچی اسکول سے گھر آکر اپنی امی سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ یوں مخاطب ہوئی۔
"میرا خیال ہے میں اسکول میں اپنا وقت برباد کر رہی ہوں، کیونکہ پڑھنا لکھنا تو مجھے آتا نہیں اور اسکول والے مجھے کھیلنے سے روکتے ہیں۔"
امی نے بچی کی تقریر سُنی تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

استاد (شاگرد) سے "بتاؤ جہانگیر نے کہاں سے کہاں تک حکومت کی؟"
شاگرد "جناب صفحہ ۱۲۵ سے صفحہ ۱۳۵ تک"

خرم ھارون۔ کراچی

ایک صاحب پر اپنے باپ کو قتل کرنے کا الزام تھا

ان کا مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت تھا۔ ایک مرحلے پر اُن صاحب نے اپنے جُرم کا اعتراف کرتے ہوئے عدالت سے رحم کرنے کی درخواست کی انھوں نے کہا کہ۔

"ان پر رحم کیا جائے کیوں کہ وہ یتیم ہیں۔"

نوشاد مہمند، حیدرآباد

ایک دوست (دوسرے دوست سے) بھئی سُنا ہے کہ تمھارا وہ طوطا جو بہت بولتا تھا انتقال کر گیا؟

دوسرا دوست "ہاں یار... میری شادی کے بعد وہ بہت دل شکستہ ہو گیا اور مر گیا۔"

پہلا دوست "کیا مطلب؟"

دوسرا دوست "دراصل وہ بولنے میں بیگم کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اس لیے احساسِ کمتری کا شکار ہو کر مر گیا۔"

شکیل بدر، کراچی

"تم سے بڑا جھوٹا میں نے آج تک نہیں دیکھا" مقدمے کی کارروائی کے دوران ایک وکیل نے دوسرے وکیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم سے زیادہ فریبی اور مکّار روئے زمین پر نہیں ہو گا۔" دوسرے وکیل نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"آرڈر! آرڈر! آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں بھی یہاں پر موجود ہوں۔" جج نے ان دونوں کو خاموش کراتے ہوئے کہا

شمیمہ اختر لیدی، وہاڑی

ایک دیہاتی کسی کیس کے سلسلے میں تھانے گیا تو تھانیدار نے اُس سے پوچھا۔

"آپ کا اسمِ گرامی؟"

دیہاتی چُپ رہا تو تھانیدار نے گرج کر کہا "میں آپ کا اسمِ گرامی پوچھ رہا ہوں"

دیہاتی نے کانپتے ہوئے کہا "جناب اسمِ گرامی تو نہیں آتا۔ البتہ آپ درود شریف سُن لیں۔"

ناصر خان کورائی (اوکاڑہ)

جج (چور سے) "تمہیں پانچ افراد نے چوری کرتے دیکھا ہے۔ مگر تم پھر بھی چوری سے انکار کر رہے ہو"

چور "جناب میں آپ کے سامنے ایسے پانچ سو افراد پیش کر سکتا ہوں۔ جنھوں نے مجھے چوری کرتے نہیں دیکھا"

شاھد ابوبکر، کراچی

ایک یہودی تاجر کو پولیس نے اس الزام میں گرفتار کر لیا کہ اُس نے ایک ڈاکو کو فرار ہونے میں مدد دی۔ یہودی سے ایک پولیس افسر اُس پر لگائے گئے الزام کے حوالے سے یوں ہمکلام ہوا۔

پولیس والا: "تمھارے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ نہتّا تھا"

یہودی: "جی جناب"

پولیس والا: "تمھیں معلوم تھا کہ اُسے پکڑ کر لانے والے کو سو ڈالر انعام دیا جائے گا"

یہودی: "جی حضورِ والا"

پولیس والا: "تو تم نے اُسے پکڑا کیوں نہیں؟"

یہودی: "جناب عالی! جب میں نے اُس پر پستول تان کر اُس سے تھانے چلنے کو کہا تو اُس نے میرے پستول کو ایک سو تین ڈالر میں خریدنے کی پیش کش کردی۔ جناب! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم لوگ کاروبار میں کسی بھی طرح زیادہ منافع کے قائل ہیں"

احمد اشرف ۔ اسلام آباد

"فٹ بال کے برابر انڈا دیکھیے۔ فٹ بال کے برابر انڈا دیکھیے" ایک آدمی کمرے نمائینٹ کے پاس کھڑا زور زور سے چلّا کر ٹکٹ فروخت کر رہا تھا۔ جب اُس آدمی نے ٹکٹ فروخت کر لیے تو وہ لوگوں کو لے کر کمرے نمائینٹ میں داخل ہُوا۔ ٹینٹ کے درمیان میں ایک میز پر گول سی چیز پر کپڑا پڑا ہُوا تھا۔ لوگ اُسے دلچسپی کے ساتھ دیکھنے لگے۔ لمحہ بھر بعد اُس آدمی نے آگے بڑھ کر میز پر رکھی ہوئی چیز سے کپڑا ہٹایا تو لوگ ہکّا بکّا رہ گئے۔

"میز پر فٹبال کے برابر میں ایک انڈا رکھا ہوا تھا"

سلیم احمد خان ۔ النور سوسائٹی کراچی

ایک دکان دار نے بورڈ آویزاں کر رکھا تھا جس پر تحریر تھا "قیمتوں میں حیرت انگیز کمی" ایک خاتون نے اس دُکان سے سامان خریدا اور دکاندار سے بل چکاتے وقت پوچھا۔

"آپ نے قیمتوں میں کتنی کمی کی ہے؟"

"ایک فیصد" دکاندار نے جواب دیا۔

"مگر آپ نے تو حیرت انگیز کمی لکھ رکھا ہے" عورت نے حیرت سے منہ کھول کر کہا۔

"جی ہاں! تو کیا آپ کو ایک فیصد کمی کا سُن کر حیرت نہیں ہوئی" دکاندار نے جواب دیا۔

حسن مہدی خراسانی ۔ کراچی

اُستاد ۔ (شاگرد سے) "تم کاہلی کے بین الاقوامی مقابلے میں اوّل انعام حاصل کر سکتے ہو۔"
شاگرد ۔ (سنجیدگی سے) "آپ درست کہتے ہیں سر! مگر مقابلے میں حصّہ کون لے۔"

فاطمہ زہرہ، نصیر آباد، کراچی

جنگ کے دوران جرمن جہاز بمباری کرتے ہوئے لندن کے اوپر سے پرواز کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک میاں بیوی گھر سے نکل کر خندق کی طرف دوڑے یکایک بیوی دوڑتے دوڑتے رُک گئی اور بولی۔
"میں اپنے دانت تو گھر ہی میں بھول آئی!"
"جلدی واپس جاؤ اور دانت لے آؤ جرمن جہاز تمھارے لیے ڈبل روٹیاں پھینک رہے ہیں۔" شوہر نے جل بھن کر جواب دیا۔

سیّد وجاہت علی، گولارچی، سندھ

ایک دوست (دوسرے دوست سے) "تمہیں معلوم ہے سگریٹ پینے والے کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔"
دوسرا ۔ "کیوں؟"
پہلا دوست ۔ اس لیے کہ وہ جوانی میں ہی مر جاتے ہیں۔

دولت رعنا، راولپنڈی

ایک دوست (دوسرے سے) "مجھ سے اُدھار لی ہوئی رقم واپس کر دو ورنہ میں قیامت کے روز تمھارے سینہ پر سوار ہو جاؤں گا۔"
دوسرا دوست ۔ "مجھ پر تم جیسے بیسیوں افراد کا ادھار ہے، اگر تمھیں میرے سینے پر جگہ ملے تو تم بھی سوار ہو جانا۔"

شائستہ عبدالستار، حیدرآباد

ڈائریکٹر ۔ (فلم کے ہیرو سے) "اگلے سین میں تمھیں دریا میں کودنا ہوگا۔"
ہیرو ۔ (گھبرا کر) "مگر مجھے تیرنا نہیں آتا۔"
ڈائریکٹر۔ "کوئی بات نہیں یہ فلم کا آخری سین ہوگا۔"

وقاص اکرم، منجو وال، اٹک

ایک اخبار کے ادبی صفحہ کے نگران نے پچھلے سال مرنے والوں ادیبوں کی فہرست تیار کر کے کاتب کو دی۔ فہرست چھپی تو اُس میں صفحہ کے نگران کا نام بھی شامل تھا۔ نگران نے کاتب سے اس غلطی کی وجہ پوچھی تو جواب ملا: "جناب صفحے پر چھپنے والی رپورٹوں میں آپ ہمیشہ اپنے نام کا اضافہ کرتے تھے اِس فہرست پر آپ کا نام نہ لکھا دیکھا تو میں نے سمجھا شاید آپ نام لکھنا بھول گئے۔ لہٰذا یہ کام میں نے کر دیا۔"

شاہد فاروق، نامعلوم

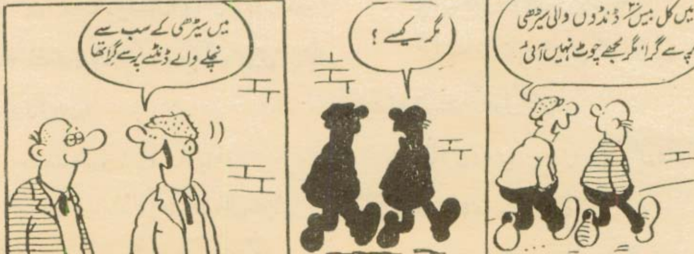

ایک مچھیرا دریا کے کنارے ایک آئینہ لیے کھڑا تھا ایک دراز قد شخص اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"مچھلیاں پکڑ رہا ہوں"۔ مچھیرے نے جواب دیا۔

"کیا آپ آئینے سے مچھلیاں پکڑ رہے ہیں"؟ دراز قد شخص نے پوچھا۔

"جی ہاں، یہ نئی ایجاد ہے۔ میں اس آئینے کے ذریعے خوب دولت کماؤں گا"۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ آئینہ کس طرح کام کرتا ہے"؟

"ضرور بتا سکتا ہوں مگر اس کے لیے آپ کو سو روپے دینے پڑیں گے"۔ دراز قد شخص نے جذبۂ تجسس سے مجبور ہو کر سو کا نوٹ مچھیرے کو تھما دیا اور بولا۔

"اب مجھے بتاؤ تم اس آئینے سے مچھلیاں کس طرح پکڑتے ہو؟"

"میں آئینے کا رُخ پانی کی طرف کر دیتا ہوں"۔ مچھیرے نے کہا۔ "کوئی مچھلی قریب سے گزرتی ہے تو آئینے سے منعکس ہونے والی شعاعوں سے پریشان ہو جاتی ہے۔ اور میں اُسے دبوچ لیتا ہوں"۔

دراز قد شخص چند لمحے سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہا پھر سنبھل کر بولا۔

"یعنی تم واقعی اس طریقے سے مچھلیاں پکڑتے ہو؟ یہ تو قطعی احمقانہ بات ہے! آج تم نے کتنی مچھلیاں پکڑی ہیں...؟"

"تم پانچویں مچھلی ہو!" مچھیرے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

محمد رضوان، اورنگی ٹاؤن، کراچی

ایک عورت اپنی پڑوسنوں کے یہاں جا کر ان سے باتیں کرنے کی بہت شوقین تھی۔ ایک مرتبہ وہ بیمار ہو گئی اس نے اپنے شوہر سے کہا ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ شوہر ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا لیکن آدھے راستے سے واپس آ گیا اور کہنے لگا: "میں ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہوں لیکن تم بتا دو کہ تم محلے کے کس گھر میں ہو گی تاکہ میں ڈاکٹر کو وہیں لے آؤں"۔

ضیاء شرمین، ناظم آباد، کراچی

ماہر نفسیات (مریض سے) "آپ تو بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ آپ پاگل ہیں۔ براہِ مہربانی آپ مجھے اپنی کہانی بالکل آغاز سے سنائیے"۔

مریض (مسکراتے ہوئے) "آغاز اس طرح ہوا کہ میں نے سب سے پہلے آسمان بنایا پھر زمین بنائی اور پھر..."

صائمہ ضمیر احمد، (شہر نامعلوم)

ایک اُستاد نے کلاس کے بچّوں سے ایک سوال پوچھا۔ "ایک باڑے میں بارہ بھیڑیں ہیں اُن میں سے ایک بھیڑ باڑے سے باہر نکل گئی اب باڑے میں کتنی بھیڑیں

نہیں ...؟"

"ایک بھی نہیں" ایک بچے نے فوراً جواب دیا۔

"اس سوال کا صحیح جواب گیارہ بھیڑیں ہے۔ لگتا ہے تم حساب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے" اُستاد نے کہا۔

"اور لگتا ہے آپ بھیڑوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے" بچے نے جواب دیا۔

حامد علی شاھد۔ لاوہ۔ چکوال

ایک روسی بیوی اپنے شوہر سے بولی "کامریڈ اگر کسی دن حکومت تمام سرحدیں کھول دے تاکہ جو روس سے نکلنا چاہے وہ نکل جائے تو تم کیا کرو گے؟"

"میں فوراً درخت پر چڑھ جاؤں گا" شوہر نے جواب دیا

"وہ کیوں؟" بیوی نے پوچھا۔

"تاکہ ہجوم میں کچلا نہ جاؤں" شوہر بولا۔

ایک صاحب کہیں تعزیت کے لیے گئے۔ وہاں انہوں نے مرحوم کے بیٹے سے پوچھا "مرحوم کو کیا بیماری تھی؟"

"بیٹے نے جواب دیا" بیماری کیا تھی، بڑھاپا بذاتِ خود ایک بیماری ہے"

اُن صاحب نے بے خیالی میں کہا "ہاں بھئی بہت خطرناک مرض ہے، ہمارے محلے میں بھی دو تین بچے اسی بیماری سے مر چکے ہیں" محمد شاھد رسول۔ حیدرآباد

اس کو رساوں کے ایڈیٹروں کے خطوط آتے ہیں"

دوسرا "ان خطوط میں کیا لکھا ہوتا ہے؟"

پہلا "یہی کہ آپ کی کہانیاں ناقابلِ اشاعت ہیں"

صائمہ محمود ۔ لاہور

ایک انگریز اپنے پاکستانی دوست کو اپنے ملک کے وسیع رقبے کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ وہ بڑے فخر سے بولا۔ "لندن میں اگر آپ صبح کو گاڑی میں سوار ہوں تو چوبیس گھنٹے کے بعد بھی آپ لندن ہی میں ہوں گے"

"اچھا میرا خیال تھا کہ سُست رفتار گاڑیاں صرف ہمارے ملک میں ہی چلتی ہیں" پاکستانی نے جواب دیا۔

صائمہ حبیب ۔ بوریوالا

اعلان آئندہ ماہ سے انعامی لطیفہ ارسال کرنے والے کو تین ماہ تک آنکھ مچولی بھیجنے کے بجائے حق اسکواڈ اور اس ماہ کا آنکھ مچولی ارسال کیا جائے گا۔ جس قاری کا لطیفہ انعامی قرار پائے وہ فوراً ہمیں اپنا مکمل پتہ روانہ کر دے تاکہ اُسے جلد از جلد انعام روانہ کیا جا سکے ۔۔۔ (ادارہ)

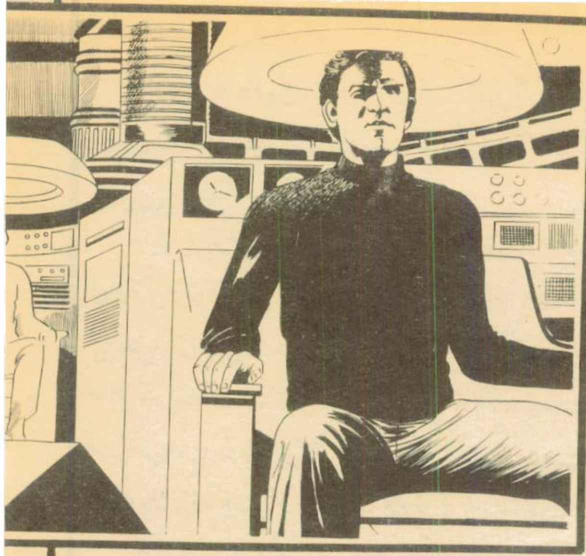

سلسلے وار سائنسی ناول

قسط نمبر ۲

عکس

شاہنواز فاروقی

۴۰۰۰ ۶۲ کا زمانہ ۔ سرمد ایک میوزیم میں منتظم کے عہدے پر فائز ہے ۔ سرمد کے بچپن کا دوست حارث پاکستان کرکٹ ٹیم کا کھلاڑی ہے ۔ ایک دن سرمد حارث کے بلاوے پر کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے اسٹیڈیم گیا ۔ حارث نے اس میچ میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ بائیں ہاتھ سے بولنگ کر کے انگلستان کی ٹیم کو دونوں اننگز میں انتہائی کم اسکور پر آؤٹ کر دیا۔ حارث کی ناقابلِ یقین حیرت انگیز بولنگ پر ہر شخص حیران رہ گیا ۔ میچ کے اختتام کے بعد حارث ایک نامعلوم کار میں بیٹھ کر کہیں چلا گیا ۔ ایک ہفتہ تک کسی کو پتا نہ چلا کہ حارث کہاں ہے ... پھر حارث کی طرف سے ایک اخبار کو اطلاع ملی کہ وہ جب تک خود منظرِ عام نہ آجائے اُسے تلاش نہ کیا جائے۔ حارث کی اس پُراسرار گمشدگی نے پوری دنیا کو حیران کر دیا تھا ۔ کچھ دنوں بعد حارث خود منظرِ عام پر آگیا ۔ ایک دن سرمد کو اپنے ایک اور بچپن کے دوست فراز کا ٹیلی فون موصول ہُوا ۔ فراز سرمد سے فوراً ملنا چاہتا تھا ۔ فراز نے فون پر سرمد کو بتایا کہ وہ اس سے حارث کے متعلق کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے ۔ سرمد نے فراز کو رات کے کھانے پر اپنے گھر مدعو کر لیا' اور پھر فراز کی آمد کا انتظار کرنے لگا ۔

فراز مقررہ وقت پر سرمد کے گھر پہنچ گیا ۔ سرمد کو فراز کچھ بدلا بدلا سا لگا ۔ کھانا کھانے کے بعد ایک عجیب بات ہوئی فراز نے سرمد کے بیٹے بہزاد کی کتاب پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ۔ سرمد کو فراز کے اس رویّے پر حیرت ہوئی مگر اُس نے اظہار نہ کیا۔ پھر وہ دونوں لائبریری میں آ بیٹھے ۔ لائبریری میں گفتگو کے آغاز پر فراز نے سرمد کو مہاتما بدھ کی ایک مورتی دکھائی ایسی ہی ایک مورتی سرمد کے میوزیم میں بھی موجود تھی ۔ سرمد کو حیرت ہوئی کہ یہ مورتی فراز کے پاس کہاں سے آئی ؟ سرمد نے مورتی کا معائنہ کیا تو وہ اصلی نکلی ۔ فراز نے وہ مورتی' سرمد کو تحفے میں دے دی ۔ گفتگو کے دوران دو اور حیرت انگیز انکشافات ہوئے بچپن میں فراز کے بائیں ہاتھ پر جو دھبہ تھا ۔ وہ اس کے دائیں ہاتھ پر آگیا تھا اور اس کا دل بائیں کے بجائے دائیں جانب دھڑک رہا تھا ۔ سرمد کو شک ہوا کہ کہیں فراز گوشت پوست کا عکس تو نہیں ، اُس نے فراز کو آئینے کے سامنے کھڑا کیا تو اُس کا شک درست ثابت ہوا! فراز عکس میں کس طرح تبدیل ہوا خود فراز کی زبانی سُنیے ۔

تمھیں یاد ہو گا پانچ سال قبل میں نے ایک سرکاری نوکری کے لیے درخواست دی تھی۔ جس عہدے کے لیے میں نے درخواست دی تھی وہ عہدہ سائنسی اور تکنیکی ماہر کا تھا۔ کام ذرا خُفیہ نوعیت کا تھا۔ اپنے اعلیٰ تعلیمی پس منظر کے باعث مجھے وہ نوکری مل گئی۔

"ابتدا میں تو میں بہت خوش ہُوا کہ چلو تحقیقی کام کرنے کا موقع ملے گا۔ مگر میری خوشی جلد ہی رفو چکّر ہو گئی کیونکہ آفس میں فائلوں کو پڑھنے اور اُن پر نوٹ لکھنے کا کام زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کی کارکنوں کی آپس کی چپقلش، افسرِ اعلیٰ کی خوشامد اور دفتر کے سازشی ماحول نے مجھے جلد ہی بور کر دیا۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو باقی لوگوں سے دُور کرنا شروع کر دیا۔ میرے ساتھ کام کرنے والے تقریباً سب لوگ اپنا زیادہ تر وقت گپ شپ اور چائے پانی میں گزارتے تھے۔ لیکن میں اپنے مطالعے اور تحقیقی کاموں میں لگا رہتا۔ میں اپنے حصّے کا دفتری کام جلد ہی ختم کر لیتا۔ چنانچہ دفتر میں کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا۔

میں کشش اور ایٹم کے بارے میں کچھ تحقیقی کام کرنا چاہتا تھا۔ گزشتہ کئی برسوں سے ایک خیال میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا میں اُس خیال کو عملی شکل دینا چاہتا تھا۔ میری لیبارٹری میں وہ تمام سائنسی آلات موجود تھے جو اس کام کے لیے درکار تھے۔

آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کے مطابق مقام اور زمانہ کی خصوصیات کا انحصار اُن میں موجود اشیار پر ہوتا ہے۔ اگر کسی جگہ کوئی چیز موجود نہیں تو اُس جگہ یا مقام کی ہیئت یوکلڈ کی ہیئت ہوتی ہے۔ یہ وہی ہیئت ہے جس کے اصول ہم سب اسکول کے زمانے میں پڑھ چکے ہیں۔ سائنسی اصول کے مطابق اس خلاء میں اگر کوئی بڑے حجم یا سائز کی اور زیادہ قوت والی چیز رکھ دی جائے تو اُس جگہ کی ہیئت بدل جائے گی اور نہ صرف یہ بلکہ اُس جگہ میں جتنے بھی مستقیم خطوط موجود ہیں اُن کی سمت بدل جائے گی۔ مثال کے طور پر ہم کہتے ہیں کہ روشنی خطِ مستقیم میں سفر کرتی ہے لیکن جب روشنی کی کوئی کرن کسی بڑی DENSITY کثافت والی چیز کے پاس سے گزرتی ہے تو اُس کی سمت بدل جاتی ہے۔ علمِ فلکیات کے ماہرین اس طرح کے عناصر کی تحریکات اور اُن کے عمل کرنے کے طریقوں کی جانچ کر چکے ہیں۔ یہ سائنسی نتائج آئن اسٹائن کے نظریہ "شے کی قوتِ کثافت سے مقام اور زمانہ متاثر ہوتے ہیں" پر مبنی ہیں۔ میں مقام اور زمانہ کو مروڑ دینا چاہتا تھا۔

فراز نے دونوں ہاتھوں کو اس طرح گھماتے ہوئے کہا جیسے وہ کپڑا نچوڑ رہا ہو۔

میں فراز کی گفتگو بڑے دھیان سے سُن رہا تھا، لیکن چونکہ معاملہ خالصتاً سائنسی تھا اس لیے مجھے فراز

کی گفتگو کا مفہوم سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ فراز نے میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے میری مشکل بھانپ لی اور بولا۔

"سر سے گزر رہی ہے؟"

"ہاں ہے تو کچھ یُوں ہی" میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"تم آرٹس کے لوگوں کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ کوئی بھی عقل کی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی" فراز نے چوٹ کی۔

"خیر ایسا بھی نہیں۔ ویسے تمہیں بھی کبھی میر اور غالب سمجھ میں نہ آسکے۔ کیا تم مجھے کوئی ایک شعر بھی درست وزن کے ساتھ سُنا سکتے ہو؟" میں نے جوابی حملہ کیا۔ فراز گڑبڑا گیا۔

"ہاں... ہاں۔ نہیں۔ایک کیا میں تمہیں ایک ہزار شعر سُنا سکتا ہوں لو سنو! علامہ اقبال کا شعر ہے:"

"کھول آنکھ زمیں دیکھ... اور... اور کیا دیکھ؟"

"اپنا چہرہ دیکھ" میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ فراز سر کھجانے لگا اُس کے چہرے پر گھبراہٹ اور شرمندگی کے آثار نمایاں تھے۔ میرا ہنسی کے مارے بُرا حال ہوگیا۔ تھوڑی دیر تک ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے رہے۔

"خیر... چھوڑو تم مجھے اپنے تحقیقی کام کے بارے میں بتاؤ" میں نے فراز کو اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں تمہیں ایک شعر سُنا کر ہی رہوں گا" فراز جذباتی لہجے میں بولا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تمہارے تحقیقی کام کے بارے میں جاننے کے لیے سو سال تک انتظار کرنا پڑے گا" میں نے کہا۔ فراز نے آنکھیں بند کر کے لمبا سانس کھینچا اور بولا۔

"یار مختصر طور پر یہ سمجھو کہ میں نے ایٹموں کے اندر پائی جانے والی مخصوص خصوصیات کو ایک خاص طریقے سے استعمال کر کے مقام کو مروڑنے کا تجربہ کیا۔ سائنس دانوں کا خیال ہے اگر ایک خاص قسم کے اسپین والے کئی ایٹم کسی ایک مقام پر چھوڑے جائیں تو... خیر چھوڑو" فراز کو احساس ہُوا کہ وہ پھر ٹھوس سائنسی گفتگو شروع کر چکا ہے۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا تو فراز مُسکرا دیا اور پھر یوں گویا ہُوا۔

ہماری لیبارٹری میں ایٹموں کا سرچشمہ تیار کرنے والا ایک بڑا آلہ موجود ہے۔ میں نے اُس پر تجربات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نئے تجربے کی خاطر اعلیٰ افسران سے اپنے منصوبے کی اجازت لینی ضروری تھی لیکن تمہیں پتہ ہے کہ ایسے منصوبوں پر کام کرنے کی اجازت آسانی سے نہیں ملتی۔ اگر میں اپنے منصوبے کی اجازت طلب کرتا تو ممکن

تھا کہ فائل در فائل سفر کرتے ہوئے جب تک میری تجویز منظور ہوتی میں بوڑھا ہو کر ریٹائر ہو چکا ہوتا۔ چنانچہ میں نے آفس میں جھوٹ بولا کہ میرا یہ تجربہ روزانہ کے کام کا ہی حصہ ہے۔ کام کی ابتداً سے قبل اُس آلہ کے پاس ہی میں نے اپنے لیے ایک کیبن محفوظ کرا لیا اور اُس کے دروازے پر "ٹاپ سیکرٹ" "خطرناک" اور داخلہ منع ہے" وغیرہ کے بورڈ لگوا دیے تاکہ کوئی آ کر خواہ مخواہ مجھے پریشان نہ کرے۔ کیونکہ اس بات کا کافی امکان تھا کہ میرے ساتھ کام کرنے والے میرے اس الگ تھلگ رہنے پر ناراض ہو کر میرے کاموں میں دخل اندازی کریں گے۔

تجربے کے آغاز کے لیے میں نے سب سے پہلے اپنی کلائی گھڑی استعمال کی۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ گھڑی کے عکس میں بدلتے وقت اُس کے دورانیہ یعنی وقت شمار کرنے والے نظام میں بھی کوئی فرق آتا ہے یا نہیں۔ گھڑی کو ایک مخصوص مقام پر رکھ کر میں نے اُس پر ایٹموں کا سرچشمہ چھوڑ دیا۔ سرچشمہ میں نہاتے ہوئے ایک خاص سمت میں گھومتے ہی گھڑی اپنے عکس میں تبدیل ہو گئی اس دوران اُس کے وقت بتانے کے نظام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خوشی سے اُچھلتے ہوئے میں نے سرچشمہ کو روک دیا اور گھڑی نے فوراً ہی اپنی پہلے والی شکل اختیار کر لی۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے ابھی پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

اس کے بعد میں مختلف طریقوں کو اختیار کرتے ہوئے یہی تجربہ بار بار کرتا رہا۔ بالآخر کامیابی نے میرے قدم چومے۔ ایٹمی سرچشمے کے اندر گھڑی کے عکس میں بدلنے کے بعد میں سرچشمے کو روکنے سے پہلے گھڑی کو اُس کی جگہ سے ہٹا لیتا۔ اس دوران گھڑی اپنی عکسی شکل برقرار رکھتی۔ میں کئی روز تک مختلف چیزوں کو عکس میں بدل کر تجربے کرتا رہا۔ اگرچہ میرے تجربات کامیاب ہو رہے تھے لیکن اس عمل کا پورا راز ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

ایک دن میں نے اپنے اس تجربے کو اپنے اوپر آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اپنے اوپر تجربہ کرنے سے پہلے میں کیڑوں مکوڑوں اور تتلیوں وغیرہ پر تجربے کر کے دیکھ چکا تھا کہ اس میں جان جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تاہم میں نے احتیاطاً اپنے اس تجربے کی مکمل تفصیلات ایک فائل میں لکھ کر محفوظ کر لیں۔

اس خیال سے کہ اگر میں مر بھی گیا تب بھی مستقبل کے سائنس دان میری معلومات کی بنیاد پر اس میدان میں تحقیقی کام کر سکیں۔ میں نے کیبن میں ایک ویڈیو ٹیپ ریکارڈر اور آٹومیٹک کیمرے کا بندوبست بھی کر لیا تاکہ میرے عکس میں تبدیل ہو جانے کے بعد میری حرکات و سکنات ریکارڈ ہو سکیں۔ اس کے علاوہ میں نے کئی اور ایسے سائنسی آلات کیبن میں فٹ کر لیے تھے جو میرے جسم کی مختلف حرکات کی جانچ پڑتال کرتے رہیں۔ پورے انتظامات کرنے کے بعد میں ایٹمی سرچشمے میں داخل ہو گیا۔

سرچشمے کے اندر ایک مخصوص سمت میں چکر پورا کرتے ہی میں عکس میں تبدیل ہوگیا۔ اس تبدیلی کے دوران مجھے کسی قسم کی جسمانی یا ذہنی تکلیف نہیں ہوئی۔ میرے ساتھ ساتھ میرے کپڑے، جوتے اور گھڑی وغیرہ میں بھی تبدیلی آگئی۔ سرچشمے سے باہر آکر میں نے اپنی جانچ شروع کی۔ اب میں سیدھے الفاظ نہیں پا رہا تھا کیونکہ میرے دماغ میں اُلٹی تحریر پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوچکی تھی۔ بوتل کا ڈھکن گھُما کر کھولنے بند کرنے سے مجھے اُلجھن ہونے لگی تھی۔ میرا دایاں ہاتھ مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔ اور بایاں ہاتھ اُس کی جگہ کام کرنے لگا تھا۔ اس لیے اپنے اِن انوکھے تجربات کو میں نے فوراً ہی لکھ ڈالا۔

"اس کے بعد میں پھر ایٹمی سرچشمے میں داخل ہو کر اپنی اصلی حالت میں آگیا۔ اصلی حالت میں آنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ عکسی حالت کی کوئی بھی شبیہہ میرے ذہن میں موجود نہیں۔ عکسی حالت میں مَیں نے جو حرکتیں کی تھیں وہ بھی مجھے یاد نہیں تھیں۔ البتہ میری یہ حرکتیں ویڈیو ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ ہوچکی تھیں۔ جنہیں میں بار بار دیکھتا رہا۔ وہ فائل جس میں میں نے اپنے تجربات لکھے تھے۔ میں نے اُسے آئینے کے سامنے بیٹھ کر پڑھا کیونکہ وہ اُلٹی لکھائی میں لکھے گئے تھے۔

فراز کی کہانی سُنتے ہوئے مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے میں کسی الف لیلے کی کہانی کے کسی منظر میں موجود ہوں۔ اور میرے ساتھ عجیب وغریب واقعات پیش آرہے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام حالات وواقعات ناقابلِ یقین سے لگتے تھے لیکن اُن پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارا نہ تھا۔ کیونکہ فراز میرے سامنے بیٹھا مجھے یہ سب کچھ سُنا رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ مہاتما بدھ کی اس مورت پر پڑی جس کا ہاتھ خم کھایا ہوا تھا۔

"ٹھہرو فراز! یہ بتاؤ کہ کیا یہ مورتی بھی عکسی شکل میں ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"تم ٹھیک سمجھے سرمد! یقین نہ ہو تو اپنے میوزیم میں رکھی مورتی کو دیکھ آؤ۔" اُس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

میں ہڑبڑا کر اُٹھا اور فراز کو اپنے ساتھ لے کر میوزیم کا رُخ کیا۔ میوزیم کے مطلوبہ حصے میں پہنچ کر میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں نے دیکھا مورتی وہاں موجود نہیں ہے۔ میں نے جلدی سے فراز کی تحفے میں دی ہوئی مورتی وہاں رکھی اور فراز کو لے کر واپس اپنے گھر آگیا۔ (باقی آئندہ ماہ)

عجیب و غریب لوگ

انتخاب: محمد شعیب غازیانی

ایلی بون :- یہ امریکہ میں پیدا ہوا۔ اس کا جسم خوبصورت مگر ٹانگ کے بغیر تھا۔ اس کے دیگر بہن بھائی نارمل تھے۔ اس کے دو مختلف سائز کے پاؤں موجود تھے۔ اس نے مختلف نمائشوں اور سرکسوں میں مداری کی حیثیت کرتب دکھائے۔

جیمز مورس:- یہ نیویارک میں پیدا ہوا یہ اپنے چہرے کی جلد کو کافی دُور تک کھینچ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ اپنے سینے کی جلد کو سر کے اوپر تک کھینچ سکتا تھا۔

جولیا پاسٹرینا: یہ دُنیا کی بدصورت ترین عورت تھی۔ اس کا قد صرف ساڑھے چار فٹ تھا۔ اس کے چہرے کا زیادہ حصّہ، پیشانی، بازو اور سینہ بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ شکل و شباہت سے یہ گوریلا جیسی لگتی تھی۔

فرانک لینٹینی سِسلی کے رہنے والے
فرانک کے تین ٹانگیں تھیں ۔ تیسری ٹانگ جو قدرے
چھوٹی تھی اس کی پشت سے نکلی ہوئی تھی ۔ اس کا
کہنا تھا کہ اس کی تیسری ٹانگ کبھی اس کی راہ میں
رکاوٹ نہیں بنی ۔

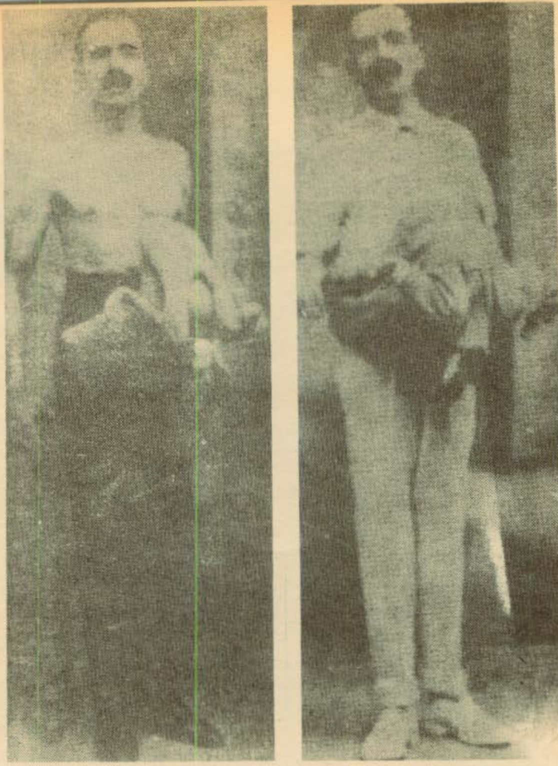

جین لبرا۔ اٹلی کے رہنے والے اس شخص کے جسم کے ساتھ ایک اور چھوٹا سا جسم جُڑا ہُوا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جین کے چاروں بچے مکمل طور پر تندرست اور توانا تھے۔

اسٹیلا میک گریگور۔ اس عورت کی بہت خوبصورت فیشن کی براؤن رنگ کی داڑھی تھی۔ اس نے مشی گن یونیورسٹی (امریکہ) میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیے، اُسے شروع شروع میں دن میں چار یا پانچ مرتبہ شیو بنانی پڑتی تھی۔ بعد میں اُس نے داڑھی رکھ لی تھی۔

Langnese
500g
Langnese
Bee Honey
100% Pure
Selected Quality
تیس سے ساٹھ ہزار شہد کی
مکھیوں کی انتھک کوشش ہی
خالص اور غذائیت سے بھرپور
شہد کے صرف چند قطرے تحفے
کی صورت میں مہیا کرتی ہیں
اور وہ اپنی کوشش کے اس ثمر
کو لینگنیز کہلانا
پسند کرتی ہیں۔

حادثہ

ایک دم نہیں ہوتا

مگر جناب یہ حادثہ تو ایک دم ہُوا... بالکل ایک دم ... دیکھتے ہی دیکھتے ۱۷۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑنے والی دو اسپیڈ بوٹ آپس میں ٹکرائیں اور سطح سمندر

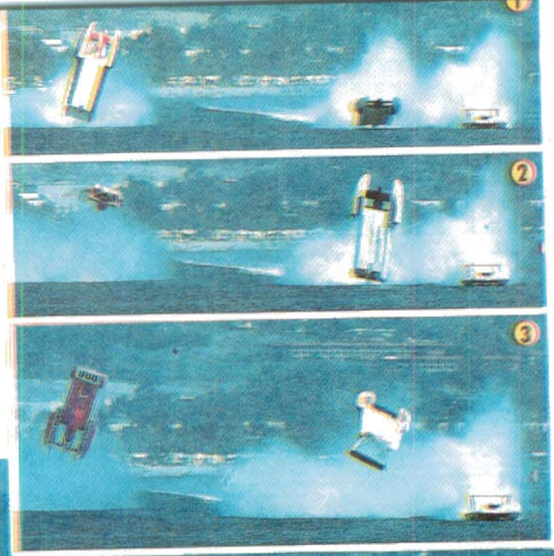

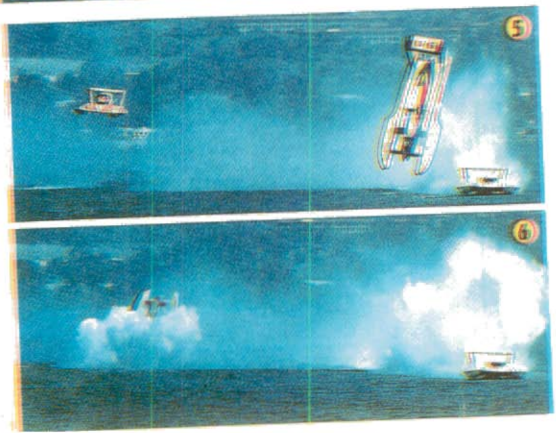

سے اُڑتی ہوئی آسمان کی طرف اُٹھنے لگیں۔ کشتیاں تباہ ہوگئیں مگر بوٹس چلانے والی خواتین معمولی زخمی ہوئیں۔ اس حادثے کے لمحے لمحے کی تصویر بنا لینا بھی تو فوٹوگرافر کا کمال ہے ہے نا...؟

یہ حادثہ امریکی شہر سین ڈیگو کے مشن بے میں پیش آیا۔

محمد سلیم مُغل

خبیث روحیں

انسان کو تنگ کر سکتی ہیں!

مشہور ماہر روحانیات
خواجہ شمس الدین عظیمی
سے خوف کے موضوع
پر دلچسپ گفتگو

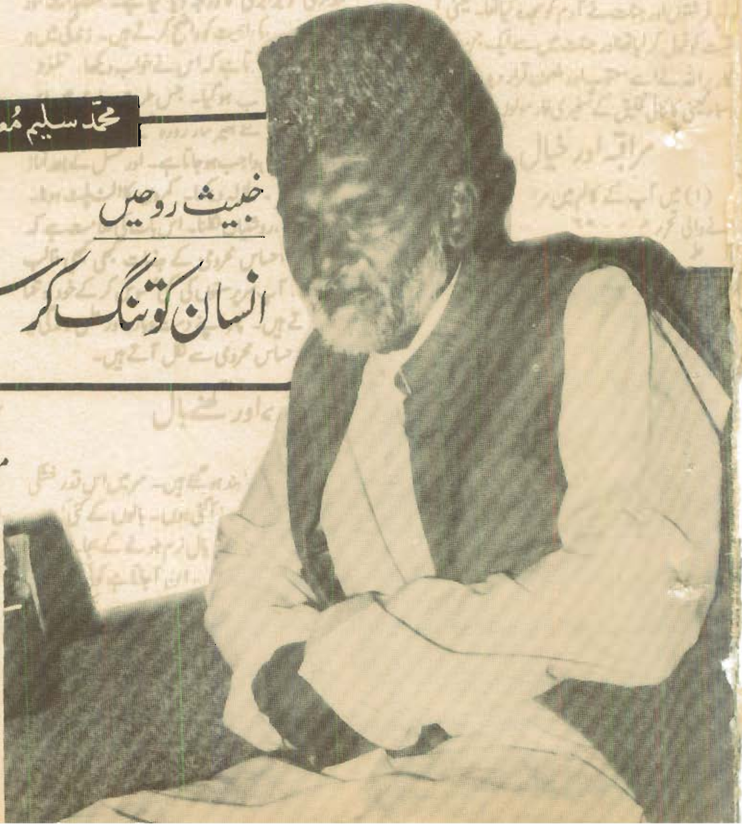

ہیلو... جی میرا نام سلیم مغل ہے اور میں ماہنامہ آنکھ مچولی کے لیے خواجہ شمس الدین صاحب سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں، کیا آپ میری مدد کر سکیں گے؟

جی جی کیوں نہیں؟ میں حکیم وقار یوسف بول رہا ہوں سلیم بھائی

خواجہ شمس الدین عظیمی میرے والد ہیں، میں اُن سے بات کر کے آپ کو فون کر دوں گا...

پھر ایک روز بعد ٹیلی فون پر ایک پیغام ملا کہ آپ کل گیارہ سے بارہ بجے کے درمیان تشریف لے آئیں.... شمسی صاحب گھر پر آپ کا انتظار کریں گے۔

دوسرے روز میں فوٹو گرافر کے ہمراہ اُن کے گھر پہ تھا... میرے ساتھ میرے دوست جاوید خالد بھی تھے۔

میرا خیال تھا کہ جس ماحول میں شمسی صاحب سے ملاقات ہوگی وہ بڑا پُراسرار ہوگا... کمرہ لوبان اور اگربتیوں کی مہک میں رچا بسا ہوگا۔ دیواروں پر نہ سمجھ میں آنے والے زائچے آویزاں ہوں گے، دھاگے، تعویز، تسبیح اور ان سب کے بیچوں بیچ ایک بڑے سے قالین پر ایک بہت ہی پُراسرار اور ڈرا دینے والا کوئی شخص سیاہ رنگ کے جُبّے میں ملبوس بہت سے عقیدتمندوں میں گھرا ہُوا ہوگا جو گھُور کر مجھے دیکھے گا تو میں سہم کر کسی کونے میں دبک جاؤں گا...

مگر.... یہاں تو یہ سب کچھ نہیں تھا.... ایک صاف ستھرے کشادہ گھر کے خوبصورت سے ڈرائنگ روم میں جہاں ہر چیز بڑے قائدے اور قرینے سے رکھی ہُوئی تھی۔ ہمیں آرام دہ صوفے پر بیٹھنے کو کہا گیا... چند لمحوں میں شمسی صاحب بھی تشریف لے آئے... سادہ اور پُروقار شخصیت... ان میں کوئی انہونی بات نہ تھی بڑے مشفق اور مہربان جیسے اکثر بزرگ ہوا کرتے ہیں۔

میں نے نیازمندی سے سلام کیا انہوں نے محبت سے جواب دیا۔ میں نے تاخیر پر معذرت چاہی... انہوں نے بزرگانہ شفقت کے ساتھ "کوئی بات نہیں" کہہ کر میرا دل رکھ لیا۔

تعارف کے بعد میرے ٹیپ ریکارڈر نے کیسٹ پر جو آواز سب سے پہلے ریکارڈ کی وہ میری اپنی تھی۔

"خواجہ صاحب نئے سال کے آغاز پر آنکھ مچولی کا خوفناک نمبر آ رہا ہے۔ مگر اس سے یہ تاثر نہ لیجیے گا کہ یہ جاسوسی ڈائجسٹوں کی طرح محض خوفناک اور بے مقصد کہانیوں کا مجموعہ ہوگا بلکہ ادارے کے عزائم یہ ہیں کہ اس نمبر کو خوف کے موضوع پر ایک چھوٹا سا انسائیکلو پیڈیا یا حوالے کی کتاب بنا دی جائے۔ اس مقصد کے لیے خوف کے موضوع پر معلوماتی مضامین، قرآنی احکامات، ماہرینِ نفسیات کے تجزیے اور بہت سی دلچسپ کہانیوں کے علاوہ دیگر بہت سی مزیدار اور مفید تحریریں بھی اس میں شامل کی جارہی ہیں۔ چونکہ آپ کا موضوع "روحانیت" ہے اور آپ اکثر بیشتر خوف کے موضوع پر کچھ

نہ کچھ لکھتے ہیں، خوف زدہ لوگوں کا علاج کرتے ہیں۔ اس لیے ہم نے آپ سے گفتگو کرنا مناسب سمجھا۔ میں یہاں یہ وضاحت بھی کر دوں کہ ہماری اور آپ کی گفتگو کو چونکہ اکثر کم عمر ساتھی پڑھیں گے اس لیے ایک تو ہم مُشکل موضوعات کے بجائے اپنی گفتگو کو خوفناک نمبر کے حوالے سے خوف تک محدود رکھیں گے اور دوم یہ کہ میں اگر کہیں کوئی بچکانہ سوال پوچھ بیٹھوں تو بُرا نہ مانیے گا۔ بلکہ یہی سمجھیے گا کہ یہ سوال کم عمر ساتھیوں کی دلچسپی کے لیے ہے۔

شمسی صاحب نے بڑے تحمّل سے میری طویل تمہیدی گفتگو کو سُنا اور اس دُعا کے ساتھ اپنی گفتگو کا آغاز کیا کہ "اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے نیک مقاصد میں کامیاب کرے۔"

دُعا کا یہ لمحہ سوال و جواب کا نقطۂ آغاز بنا...

میرا پہلا سوال تھا... آپ کا موضوع "رُوحانیت" ہے کیا خوف بھی روحانیت کا موضوع ہے؟

جواب ملا... میرا میدان مابعد النفسیات PARA PSYCHOLOGY ہے جو روحانیت کی ایک شاخ ہے۔ یہ مضمون دنیا میں مروّجہ تمام علوم کی بُنیاد ہے، یہ علم اس بات پر بحث کرتا ہے کہ کائنات کے سارے علوم کی بنیاد "اطّلاع" ہے۔

خواجہ صاحب... یہ آخری بات قدرے مشکل معلوم ہوئی... کچھ وضاحت فرمانا پسند کریں گے؟

دیکھئے آپ نے ابھی خوف کا ذکر کیا تھا... "خوف" بھی ایک اطّلاع ہے۔ ایک آدمی ایسا بھی ہے جو شیر سے لڑنے کا سوچتا ہے، اُس کے برعکس دوسرا آدمی ایسا ہے جو چوہے سے بھی ڈر جاتا ہے... تو ایک سے آدمیوں میں یہ تضاد کیوں ہے؟ بس فرق اطّلاع کا ہے... ایک نے خوف کے ماحول میں پرورش پائی اور زندگی بھر بزدل رہا دوسرا بے خوفی کے ماحول میں پروان چڑھا اور بہادر یا جری کہلایا۔ اسی طرح خوشی، غم، بہادری یہ سب ایک طرح کی اطّلاع ہیں۔

عظیمی صاحب۔ آپ کی بات پر یاد آیا کہ دو طرح کے لوگوں کو اکثر بے خوف دیکھا گیا ہے ایک تو اللہ سے مضبوط تعلّق جوڑنے والے اور دوسرے ڈاکو، لٹیرے، قاتل یا اسی طرح کے بُرے لوگ تو یہ کیسی عجیب بات ہے....؟

نہیں آپ کا مشاہدہ ٹھیک نہیں ہے، یاد رکھیے بُرا آدمی اِس اُمید پر جُرم کرتا ہے کہ اُس کی پُشت پر کوئی مضبوط آدمی موجود ہے۔ جو اُس کے لیے ڈھال بَن جائے گا لیکن اس کے باوجود جُرم کرنے کے بعد وہ پولیس سے چھُپتا ہے، ٹھکانے بدلتا ہے... تو یہ سب کچھ خوف نہیں تو پھر اور کیا ہے... جبکہ اللہ کا ولی کبھی ایسا نہیں کرتا... یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اللہ کا نیک بندہ اپنے رب کے علاوہ کسی سے کوئی توقع

نہیں رکھتا اس لیے وہ بے خوف ہو جاتا ہے۔ یہ بات نہیں بھولیے کہ خوف توقع کے آس پاس بسیرا کرتا ہے۔ توقع سے بے نیاز لوگ کبھی خوفزدہ نہیں ہوتے۔ آپ مشاہدہ کر لیجیے جو شخص جس قدر زیادہ خوفزدہ ہوگا اس کی توقعات بھی اُسی قدر زیادہ ہوں گی۔

اس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ اللہ کا نیک بندہ اللہ سے توقعات رکھتا ہے اس لیے اُسے اللہ ھی سے خوف زدہ ھونا چاہیے...؟

جی نہیں جسے آپ خوف سمجھ رہے ہیں یہ خوف نہیں ہے۔ اللہ تو بہترین دوست ہے، دوست کا خوف کس لیے... خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کہا ہے کہ "اللہ کے دوستوں کو غم اور خوف نہیں ہوتا۔"

مگر جناب قرآنِ پاک میں تو یہ بھی آیا ہے کہ "جنھوں نے اللہ کے خوف کو دلوں میں جگہ دی وہ جنّت کے حق دار ھوئے"۔ غالباً یہ سورۂ رحمٰن کی آیت ہے۔

آپ نے بالکل ٹھیک کہا... مگر یہاں ایک باریک سا فرق ہے اُسے سمجھ لیجیے۔ ایک شخص سگریٹ پیتا ہے مگر اپنے والد کے سامنے نہیں پیتا اور کہتا ہے کہ اُن کے خوف سے نہیں پیتا، ایک بچّہ کہتا ہے کہ مجھے جلدی گھر جانا چاہیئے، ماں سے خوف آتا ہے۔

آپ غور کیجیے۔ یہاں 'خوف' سے مراد صرف اور صرف احترام ہے، آپ خود سوچیئے کہ خوف تو ہمیشہ دوری پیدا کرتا ہے۔ آپ سانپ سے خوفزدہ ہوتے ہیں تو اُس سے دُور بھاگتے ہیں۔ شیر کا ڈر آپ کو اُس کے قریب نہیں آنے دیتا... تو پھر یہ کونسا خوف ہے جو بجائے دُور لے جانے کے آپ کو اللہ کے قریب لا رہا ہے... یقیناً یہ وہ خوف نہیں ہے بلکہ یہ احترام کی ایک شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں تمہیں ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ جو ذات ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرے اُس سے خوفزدہ کیوں ہُوا جائے... اُس سے تو محبت کرنا چاہیے۔ آپ بچّوں کو اور اپنے قارئین کو سمجھائیں کہ وہ اللہ سے خوفزدہ نہ ہوں بلکہ پیار کریں۔ اللہ بھی اُن سے بہت پیار کرے گا۔

بزرگوارم... آپ کی یہ بات سُن کر میرے ذھن میں ایک سوال اُبھرتا ہے کہ ھمارے اکثر بزرگ جو ھمیں سانپ، بچھو اور جہنّم کی آگ کے خوفناک مناظر سے خوفزدہ کر کے اللہ کے قریب لانا چاھتے ھیں تو کیا یہ سمجھا جائے کہ اُن کا طریقۂ کار مناسب نہیں ہے۔

یقیناً مناسب نہیں ہے... بالکل مناسب نہیں ہے... قرآن کی رُو سے، روحانیت کے لحاظ سے، مابعد النفسیات کے حوالے سے، ہر اعتبار سے یہ طریقہ نامناسب ہے... جب لوگ خوفزدہ ہو کر اللہ کے قریب آئیں گے تو محبت کا عنصر درمیان سے غائب ہو چکا ہوگا۔ جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ ہم اس انداز سے سوچیں کہ اللہ ہمارا کتنا اچھا دوست ہے۔ اس کے ہم پر کتنے احسانات ہیں، وہ قدم قدم پر ہماری حفاظت

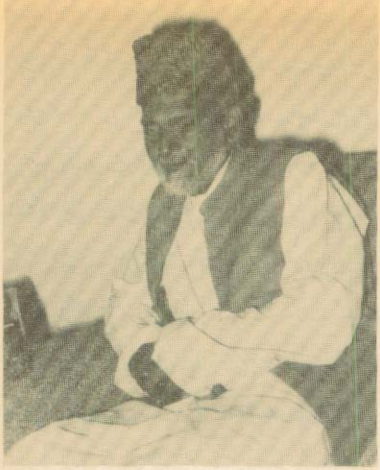

کرتا ہے، ہمیں کھانے کو نعمتیں عطا کرتا ہے۔ پہننے کو لباس دیتا ہے... ہماری بڑی بڑی غلطیوں پر بھی درگزر کرتا ہے... تو جو اللہ اتنا اچھا دوست ہے۔ ہم اُسے کیوں یاد نہ کریں... اس کی عبادت کیوں نہ کریں۔ اگر ہماری دعوت و تبلیغ کا طریقۂ کار یہ ہوگا تو ہم تمام تر محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف آئیں گے اور اُس ذات سے ہمارا تعلق مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگا۔

خواجہ صاحب... یہ بتائیے کہ جن بھوت، جادو ٹونہ اور ہپناٹزم، مسمریزم وغیرہ بھی روحانیت کے موضوع ہیں ؟

اس انداز سے نہیں ہیں جس طرح لوگوں نے بنا لیے ہیں۔

تو پھر یہ روحانیت کیا ہے ؟ آپ ہمیں کس طرح سمجھائیں گے ؟

دیکھیے... اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ "ہم نے اپنی روح انسان میں ڈال دی اور اس طرح بے جان پُتلا اُچھلنے کُودنے لگا۔" یہ جو ہماری روح ہے... یہ اللہ کی ذات کا حصّہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں کبھی تمہاری آنکھ بن جاتا ہوں مگر تمہاری آنکھیں مجھے نہیں دیکھ سکتیں... یہ آنکھ بن جانا کیا ہے... دراصل اُس نے اپنی ذات کا ایک حصّہ رُوح کی شکل میں ہمارے اندر رکھ دیا ہے تاکہ ہم اُس کی مدد سے اُسے سمجھ سکیں۔ اُس تک پہنچ سکیں، ہم اسی روح کی مدد سے اللہ کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں... روح کا یہ سارا کھیل ہی دراصل روحانیت کہلاتا ہے...

ہم نے روح کو کئی حوالوں سے سُنا ہے، نیک روح، بد روح، روحوں کا بھٹکنا، روحوں کا تنگ کرنا وغیرہ تو کیا یہ سب کچھ درُست ہے... روحیں کیا واقعی تنگ کرتی ہیں۔

ہاں یہ درست ہے مگر اس کی جو تشریحات ہم تک پہنچی ہیں وہ دُرست نہیں ہیں۔ آئیے میں آپ کو سمجھاتا ہوں کہ روحیں کس طرح تنگ کرتی ہیں... دنیا میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں اچھے اور بُرے... اچھے لوگ اکثر اچھے لوگوں کے دوست بن جاتے ہیں۔ اور بُرے لوگ بُروں کے دوست... جب یہ لوگ مر جاتے ہیں تو ان سب

کی روحیں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں بلکہ انسان اور جنات کی روحیں ایک ہی جگہ رہتی ہیں... چونکہ جنوں میں بھی اچھے اور بُرے جن ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کے مرنے کے بعد اُن کی بھی اچھی اور بُری روحیں، انسانی روحیں ایک ہی جگہ جاکر رہتی ہیں... یہاں پُر بُرے انسانوں یا بُرے جنوں کی بُری روحیں شیطان کے ہاتھ لگتی ہیں جن سے وہ دنیا میں لوگوں کو تنگ کرنے کا کام لیتا ہے۔ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ بُری روحیں اچھے اور نیک لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، صحت مند اور تندرست لوگوں کو بھی عموماً تنگ نہیں کر سکتیں، بلکہ ایسے گھروں میں بھی بسیرا نہیں کر سکتیں جہاں اللہ کا ذکر باقاعدگی سے ہوتا ہو، قرآن پڑھا جاتا ہو، نمازوں کا اہتمام ہوتا ہو، بلکہ یہ روحیں تنگ کرنے کے لیے بیمار ذہنوں کا انتخاب کرتی ہیں، ایسے ذہن جن میں وسوسے اور شک جلدی جگہ بنا لیتے ہوں، بیمار ذہن بد روحوں کے لیے زرخیز کھیتی ثابت ہوتا ہے... اسی طرح بُرے اور بدقماش لوگ بھی ان بُری روحوں کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ شیطان ان روحوں کے ذریعے بُرے لوگوں سے تخریب کے کام لیتا ہے۔ صحت مند ذہن کا آدمی ان کے دام میں نہیں آسکتا... میری اس بات کو ایک مثال سے سمجھ لیجیے... کوئی آدمی کہتا ہے کہ لاؤ میاں پچاس روپے، میں تمہیں سو روپے کا نوٹ بنا کر دیتا ہوں، کمزور ذہن کا آدمی لالچ میں آجائے گا اور سو کا نوٹ تو کیا حاصل کرے گا، پچاس روپے بھی گنوا دے گا جبکہ اس کے برعکس مضبوط ارادے اور صحت مند ذہن کا آدمی اس فراڈ کو مانے گا ہی نہیں اور اس کے چکر میں نہیں آئے گا اس طرح صاف بچ جائے گا... بس یہی حال بُری روحوں اور ان کی تخریب کاریوں میں آنے والے لوگوں کا بھی ہے۔

خواجہ صاحب آپ نے ابتدا میں فرمایا تھا کہ ہماری رُوح اللہ کی ذات کا حصہ ہے... اس کے بعد آپ نے یہ بھی کہا کہ روحیں دو طرح کی ہوتی ہیں، اچھی اور بُری... میں یہ بات سمجھ نہیں سکا کہ جو رُوح اللہ کی ذات کا حصہ ہے وہ بُری کس طرح ہو سکتی ہے۔؟

دیکھیے اللہ نے روح کے لیے دو راستوں کا تعین کر دیا ہے... ایک راستہ اچھا ہے اور دُوسرا بُرا، ایک رحمانی ہے اور ایک شیطانی، ان راستوں کا تعین کرنے کے بعد اللہ نے روح کو یہ اختیار بھی دے دیا ہے کہ وہ جس راستے کو چاہے اپنے لیے منتخب کرے۔ اب روح اگر اچھے راستے کا انتخاب کرتی ہے تو اچھے راستے کا تاثر اس روح کے لیے اچھا لباس بن جاتا ہے۔ اسی طرح بُرے راستے کا تاثر ان راستوں پر چلنے والی روحوں کے لیے بُرا لباس بن جاتا ہے... اس لباس کو ہم "ہمزاد" یا "جسم مثالی" کہتے ہیں... جب ہم اچھی بُری روح کہتے ہیں تو دراصل اچھا جسم مثالی یا بُرا جسم مثالی کہہ رہے ہوتے ہیں۔ ورنہ روح تو اللہ تعالیٰ کی ذات کا حصہ ہے وہ کس طرح بُری ہو سکتی ہے۔ اسی طرح قبر کا عذاب یا قبر کی راحت، عذاب اور ثواب یہ سب جسمِ مثالی یا روح کے لباس پر ہوتا ہے... انسانی روح پر نہیں ہوتا... اس لباس کو سائنسدان AURE کہتے ہیں۔ روسیوں نے کیرولین فوٹوگرافی کے ذریعے AURE کی تصاویر بھی بنائی ہیں۔ حضور پاکؐ کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے میرے "ہم زاد" کو مسلمان کر دیا۔ یہی "ہمزاد" دراصل روح کا لباس یا جسمِ مثالی کہلاتا ہے۔ اور

یہی لباس ہے جو اچھا یا بُرا ہوتا ہے۔ روح کبھی بُری نہیں ہوتی۔

وسوسہ خود ایک تخریب ہے ... لوگوں نے انہی وسوسوں کے بہت سے نام رکھ چھوڑے ہیں، کوئی جن کہتا ہے کوئی بھوت، کوئی پریت اور کوئی چھلّ پیری ... ایسے اور بھی بہت سے نام ہیں۔ اکثر لوگ وہمی ہوتے ہیں لیکن بعض لوگ واقعی اس مخلوق کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں۔

جناب آپ لوگوں کی رہنمائی کیجئے اور انھیں بتائیے کہ انھیں کس طرح علم ہو کہ وہ اس مخلوق کے ستائے ہوئے ہیں؟

دیکھیں یہ بہت آسان ہے "انسان کبھی نہ کبھی بیمار پڑجاتا ہے یہ کوئی عجیب بات نہیں ... انسان جب بیمار ہوتا ہے تو اس کا جسم بیمار ہوتا ہے جبکہ اُس کے ذہن کا رویّہ بیمار نہیں ہوتا لیکن اگر ذہن بھی بیمار ہوجائے، یعنی وسوسے ستائیں، بُرے خیالات آئیں تو اُسے خطرے کی گھنٹی سمجھنا چاہیئے ... اور ایسے میں نیک لوگوں سے رجُوع کرنا چاہیئے ... اُن قرآنی آیات اور دُعاؤں کا وِرد کرنا چاہیے جو ایسے مواقع کے لیے علمائے کرام نے بتائی ہیں۔ مگر ایک بات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ کہیں کسی غلط آدمی کے ہتّھے نہ چڑھ جائیں۔ آج کل ٹھگوں نے عاملوں کا روپ دھار لیا ہے اور وہ لوگوں کو بے وقوف بنا کر دونوں ہاتھوں سے لُوٹ رہے ہیں۔ میرے پاس ایک عورت آئی اُسے آسیب زدہ کہہ کر اُس کی سونے کی چوڑیاں تک اُتروالیں مگر لوگوں کو کون سمجھائے ہم مُفت علاج کرتے ہیں، پیسے نہیں لیتے اس لیے لوگوں کا اطمینان نہیں ہوتا۔ پھر لُٹ کر واپس آتے ہیں مگر اُس وقت تک اپنا بہت نقصان کر چُکتے ہیں۔

جنوں کا انسانوں کے قبضے میں ہونا کس حد تک درست ہے؟ کیا الہ دین کے جن کی طرح کا کوئی واقعہ حقیقت

بھی ہو سکتا ہے۔۔۔؟

نہیں یہ سب افسانہ ہے۔ جنوں کا ہونا تو قرآنِ پاک سے بھی ثابت ہے اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا البتہ جنّ انسانوں سے بالکل مختلف مخلوق ہے، جو نظر نہیں آتی مگر روپ بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ عموماً انسانوں سے دُور رہتی ہے مگر انسانوں کی طرح ہر کام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، کھیتی باڑی، شادی بیاہ اور بہت سے کام اُن کے بیوی بچے بھی ہوتے ہیں، یہ لوگ عبادات بھی کرتے ہیں۔ بلکہ جنّات اکثر اچھے ہوتے ہیں اور انسانوں کو عموماً تنگ نہیں کرتے ... ہاں "الیاجن" یا ایسا انسان جو روحانی طور پہ مضبوط اور نیک ہوں ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں، ایک دوسرے کے دوست بن سکتے ہیں ... اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھتے ہیں، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے مدرسے میں جنّات پڑھا کرتے تھے، حضرت سلیمانؑ کے حوالے سے تو آپ نے جنّات کے لاتعداد واقعات پڑھے ہوں گے، اچھے لوگوں کے ساتھ جنوں کا اُٹھنا بیٹھنا کوئی انہونی بات نہیں ... ویسے ایک بات بتاؤں کہ جنّ دوست ہو جائیں تو تعاون بہت کرتے ہیں ...

کیا امتحان میں نقل بھی کروا سکتے ہیں، میں نے ازراہ تفنن پوچھا۔

جو لوگ روحانیت کی اس منزل پہ ہوں کہ جنّات سے دوستی کرلیں یا جنّ اُن سے دوستی کرے تو دراصل وہ نقل وغیرہ یا شعبدہ بازی کی منزل سے بہت آگے نکل چکے ہوتے ہیں ... وہ ایسے چھوٹے اور حقیر کاموں کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

میں ایک بچی کو جانتا ہوں جیسے کوئی جنّ وغیرہ کھلونے اور پیسے دے جایا کرتا تھا ...

نہیں وہ جنّ نہیں ہمزاد تھا ... عظیمی صاحب نے میری اصلاح کی۔

تو کیا فرق ہے جنّ، بھوت، پریت، ہمزاد اور آسیب وغیرہ میں۔

دیکھیں جنّ انسانوں کی طرح ایک مخلوق ہے۔ جبکہ بقیہ روحیں اور شیطانی قوتیں ہیں۔

میرا اگلا سوال جادو ٹونے سے متعلق تھا۔ خواجہ صاحب کیا واقعی لوگوں کو جادو ٹونہ آتا ہے اور اس کی کچھ حقیقت ہے ..؟

جادو ایک طاقت ور مخفی علم ہے جو قرآن سے ثابت ہے، سامری جادوگر نے رسّیوں سے جس طرح سانپ بنائے۔ اور حضرت موسیٰؑ کا عصا جس طرح اژدہا بن کر اُن سانپوں کو نگل گیا۔ یہ واقعہ تو آپ نے بھی پڑھا ہوگا۔ مگر آج کل جادو کم ہے۔ شعبدہ گر زیادہ ہیں۔ ایک شخص دس کے نوٹ کو جادو کے زور سے سو کا نوٹ بنا کر سب کو حیرت میں ڈال دیتا ہے مگر لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اس کے باوجود وہ بھوکوں کیوں مرتا ہے ... گھر بیٹھ کر جادو کے زور سے ہزار کے نوٹ کیوں نہیں بناتا؟ آپ کو کیا بتاؤں آج کل جادو کا وہم زیادہ ہے اور وہ بھی خواتین کا پھیلایا ہوا، نوّے فیصد سے زیادہ خواتین جادو کے چکر میں رہتی ہیں اور جادو کے وہم میں بھی یہ عامل لوگ عورت کی کمزوری سے واقف ہیں اسی لیے انہیں جادو کے نام پہ بے وقوف بناتے رہتے ہیں۔

کبھی کبھار بُرے خواب ہمیں عالمِ غفلت میں بھی سخت خوفزدہ کر جاتے ہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے؟

خواب ہماری زندگی کا حصہ ہیں یقین کی کمی سے زندگی وسوسوں میں گھر جاتی ہے' وسوسے خواب میں آکر ہمیں ڈراتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔ ویسے کبھی بُرا خواب دیکھ لیا جائے تو حسب توفیق صدقہ نکال دینا چاہیے اور استغفار کرنا چاہیے۔

بچے خوف زدہ ہوں تو کیا کریں؟

میں بچوں کو نہیں اُن کے والدین کو سمجھاؤں گا کہ وہ ابتدا ہی سے بچوں کو ڈرانے سے گریز کریں۔ ان کی تربیت اور پرورش بے خوفی کے ماحول میں کریں... دراصل جو والدین خود شعوری یا لاشعوری طور پر خوف زدہ ہوتے ہیں وہی بچوں کو بھی ڈراتے ہیں۔ یہ بچوں کے لیے بُرا کرتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ بچہ جس چیز سے ڈرتا ہو اُسے وہیں لے کر جائیں اور بتائیں کہ دیکھو ڈرنے کی تو یہاں کوئی بات نہیں ہے۔ والدین پہلے اپنی اصلاح کر لیں بچے خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ والدین گھر میں بیمار ذہن کی باتیں بھی نہ کریں' جادو، ٹونہ، دشمنی، حسد اور موت وغیرہ جیسے موضوعات پر بچوں کے سامنے باتیں کرنے سے گریز کریں۔ انہوں نے ایسا کیا تو یقیناً جسمانی اور روحانی طور پر مضبوط، قوی اور بہادر نسل پیدا ہوگی۔

ہمارے ساتھیوں کے لیے کوئی پیغام...

بس یہی پیغام ہے کہ وہ اللہ سے محبت کریں' رات کو سونے سے قبل بچے تین بار اللہ کو مخاطب کر کے کہیں "اللہ میاں السلام علیکم۔ اللہ میاں میں سو رہا ہوں' اے اللہ مجھے صبح اُٹھا دینا۔ میری اس بات کو سبق کے طور سے یاد رکھیں اور اس پر عمل کریں... انشاء اللہ اس طرح اللہ سے محبت اور ایک خاص تعلق پیدا ہوگا۔ بس یہی میرا پیغام ہے۔

خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کا تعارف خود انہی کی زبانی

میں ہندوستان کے ضلع سہارنپور میں اجیٹھا شریف میں پیدا ہوا، سیاحی میں زندگی گزاری' گھریلو تعلیم حاصل کی اور چھوٹے موٹے مختلف نوعیت کے کاروبار کیے۔ روحانیت کا شوق شروع سے تھا۔ پاک پٹن میں ایک بزرگ کی توجہ سے زیارت نصیب ہوئی تو یہ شوق بڑھ گیا۔ میرے مرشد حضور قلندر بابا اولیاؒ تھے جنہوں نے مجھے روحانی علوم سکھائے۔ ان کا اصل نام محمد عظیم تھا اور ان کا مزار یہاں شادمان ٹاؤن میں ہے۔ میں اپنے آپ کو عظیمی یا عظیمیہ اُنہی کے حوالے سے لکھتا ہوں۔ نسبت اور خاندان کے حوالے سے انصاری ہوں۔ ۴۰ سال سے مختلف اخبارات میں روحانیت کے موضوع پر کالم لکھ رہا ہوں' ایک ماہ میں لگ بھگ سات ہزار خطوط کا جواب دیتا ہوں جس کی کوئی فیس نہیں۔ میرا ایک رسالہ روحانی ڈائجسٹ کے نام سے کراچی سے شائع ہوتا ہے جبکہ اس کا بین الاقوامی ایڈیشن لندن سے شائع ہوتا ہے۔

ہمارا مشن ایسے اسباق تجویز کرنا ہے جن پر عمل کرنے سے لوگ اپنی روح سے واقف ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے ہم نے مختلف مقامات پر مراقبوں کے مراکز قائم کیے ہیں جن میں پاکستان کے علاوہ برطانیہ، امریکہ اور بھارت بھی شامل ہیں' ان مراکز میں جو لوگ موجود ہیں ان کی ڈیوٹی ہے کہ وہ بغیر فیس کے اللہ کی مخلوق کی خدمت کریں۔ الحمدللہ یہ سلسلہ جاری ہے۔ روحانیت کے موضوع پر دس بارہ کتابیں بھی تصنیف کر چکا ہوں۔

ہم نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ اس انٹرویو کو مشکل موضوعات سے بچا کر چھوٹی عمر کے بچوں کے لیے بھی عام فہم اور مفید بنایا جائے۔ مگر انٹرویو مکمل ہونے پر یہ محسوس ہوا کہ اس کے بعض حصے کم عمر بچوں کے لیے قدرے مشکل ہو سکتے ہیں۔ ان حصوں کو اس اندیشے کے پیش نظر حذف نہیں کیا گیا کہ کہیں انٹرویو کا تسلسل نہ ٹوٹ جائے۔ یہ انٹرویو یکطرفہ نقطہ نظر ہے جس سے اختلاف ممکن ہے۔ اختلاف کی صورت میں خواجہ شمس الدین صاحب کے نام خط لکھا جا سکتا ہے۔

ایس کے اینڈ ایف

تحقیق

تجربہ

اور جذبۂ خِدمت

اسمتھ کلائن اینڈ فرنچ آف پاکستان لمیٹڈ کا اِدارہ گذشتہ پچیس سال سے اعلیٰ معیار کی بہترین ادویات مناسب قیمتوں پر پاکستانی عوام کو بہم پہنچا رہا ہے۔ اِس جذبۂ خدمت کے پیچھے تحقیق اور تجربے کی گراں قدر روایت ہے۔

آج بھی ایس کے اینڈ ایف کا اِدارہ اپنی رِوایات پر قائم رہتے ہوتے پاکستانی عوام کو اور پاکستان کے طبّی ماہرین کو بہترین ادویات فراہم کر رہا ہے۔

ہمارا ڈیڑھ سو سالہ تجربہ اِس بات کی ضمانت ہے کہ ہم نہ صرف پاکستانی عوام کو بلکہ دُنیا بھر میں اعلیٰ معیار کی قابلِ اعتماد ادویات فراہم کر رہے ہیں۔

صحت کے تحفّظ کی ضمانت

SK&F اسمتھ کلائن اینڈ فرنچ آف پاکستان لمیٹڈ

معلُومات اور ذہانت کا منفرد ماہانہ مقابلہ

جُستجو شرط ہے

اسامہ بن سلیم

۱۹۸۸ء کے اختتام پر "سوال در سوال" کا سلسلہ بھی اختتام کو پہنچا۔ ہم سالِ نو کے آغاز پر آپ کے لیے بالکل مُنفرد اور اچھُوتے انداز کا مقابلہ شروع کر رہے ہیں... خدا کرے آپ کو پسند آجائے... اس مقابلے کی نمایاں خُوبی یہ ہے کہ یہ صرف معلومات ہی کا نہیں بلکہ آپ کی ذہانت کا امتحان بھی ہے۔ تھوڑی سی جستجو سے آپ بآسانی "جواب" حاصل کر لیں گے۔

اس مقابلے میں شرکت کا طریقۂ کار بغور پڑھ لیجیے۔

- ذیل میں ۱۰ سوالات دیے جا رہے ہیں۔ جن کا جواب بھی اُن کے ساتھ دیے گئے الفاظ میں کہیں موجود ہے۔
- ہر لفظ میں ایک حرف پوشیدہ ہے، تمام الفاظ سے ایک ایک حرف منتخب کر کے آپ مطلوبہ جواب حاصل کر سکتے ہیں... مگر وہ حروف کون سے ہیں جو آپ کو آپ کا جواب فراہم کرتے ہیں انہی حروف کی تلاش اصل کارنامہ ہے۔
- آپ کی آسانی کے لیے ہم نے ہر سوال کے ساتھ اشارے کے طور سے شعر کا ایک ایسا مصرعہ بھی لکھ دیا ہے جو، جواب کی تلاش میں آپ کا مددگار ہو سکتا ہے۔
- آپ تمام سوالات کے جوابات علیحدہ کاغذ پر صاف اور خوش خط لکھ کر ہمیں بھجوا دیں۔ اپنا نام اور پتہ لکھنا نہ بُھولیں۔ تمام جوابات درست ہونے یا زیادہ سے زیادہ ایک غلطی کی صورت میں ہم آپ کے نام ایک ماہ کی اشاعت کے فرق کے ساتھ شائع کر دیں گے اور قرعہ اندازی کے ذریعے تین انعامات بھی دیں گے۔ جو خوبصورت کُتب کی صورت میں ہوں گے۔

آپ اپنے جوابات اس طرح ارسال کریں کہ وہ ہمیں ہر ماہ کی پندرہ تک موصول ہو جایا کریں

سوالنامہ .... آپ کی ذہانت کے امتحان کے لیے تیار ہے .... ابوُاسامہ

۱ خوشبوؤں میں پوشیدہ شخصیت کا نام تلاش کیجیے، جستجو شرط ہے۔
۱۔موتیا ۲۔ حنا ۳۔ چمپا ۴۔ گُل داؤدی
اشارہ:۔ سارے ناموں میں اک نام پیارا بہت اور ہمارا بہت

۲ مسجد کا نام نماز کی اصطلاحوں میں موجود ہے ... کوشش کیجیے۔
۱۔قومہ ۲۔ رکوع ۳۔طہارت ۴۔تکبیر ۵۔ قعدہ
اشارہ:۔ شوق میری لے میں ہے ، شوق میری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہُو میرے رگ و پے میں ہے (اقبالؒ)

۳ رنگوں کو رنگوں سے علیحدہ کیجیے ... ایک خوبصورت نام سامنے آئے گا۔
۱۔اُودا ۲۔ بھورا ۳۔ جامنی ۴۔ کالا
اشارہ --- یہ آسماں پہ عجب رنگ بکھر گئے دیکھو

۴ پرندے کو پہاڑ کی چوٹیوں میں تلاش کیجیے۔
۱۔ راکاپوشی ۲۔ قراقرم ۳۔ ہمالیہ ۴۔کوہ ایلپس ۵۔ نانگا پربت
اشارہ:۔ تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

۵ ایک کھیل کو کھلاڑیوں کے ناموں میں ڈھونڈیے ... یہ کام اتنا مشکل بھی نہیں۔
۱۔ وسیم اکرم ۲۔ جہانگیر خان ۳۔اصلاح الدین ۴۔ ٹرنر (نیوزی لینڈ کا بیٹسمین) ۵۔جیف ہنٹ
اشارہ:۔ لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

٦ فاتح کا نام جنگوں میں پوشیدہ ہے ... ہر لفظ سے ایک حرف ملا کر نام مکمل کیجیے۔

۱۔ خیبر ۲۔ قادسیہ ۳۔ طرابلس ۴۔ بدر •

اشارہ:۔ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

---

۷ یہ شعری مجموعے اس شاعر کے تو نہیں جس کا نام تلاش کرنا ہے۔ مگر شاعر کا نام انہی مجموعوں میں موجود ہے۔

۱۔ ارمغانِ حجاز (اقبالؒ) ۲۔ دیوان (ناصر کاظمی) ۳۔ شاہ جو رسالو (شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ) ۴۔ چراغِ نیم شب (سلیم احمد)

اشارہ:۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

---

۸ دریا کو سمندروں میں بغور دیکھیے ...

۱۔ بحرِ ہند ۲۔ اوقیانوس ۳۔ بحرالکاہل

اشارہ:۔ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے۔

---

۹ عمارت کا نام پتھروں میں پوشیدہ ہے ... آپ کی ذہانت اسے تلاش کر سکتی ہے۔

۱۔ یاقوت ۲۔ لاجورد ۳۔ مرجان ۴۔ سنگِ مرمر ۵۔ حجرِ اسود ۶۔ نیلم

اشارہ:۔ یہ شاہکارِ محبت ہے جگمگاتا ہُوا

---

۱۰ ایک مُلک کا نام اسلحہ کے ذخائر میں موجود ہے۔ اس سے باہر ہو ہی نہیں سکتا... تلاش کیجیے۔

۱۔ ھینڈ گرنیڈ ۲۔ ڈائنامائیٹ ۳۔ بندوق ۴۔ ماؤزر ۵۔ اسٹین گن ۶۔ تلوار ۷۔ میزائل ۸۔ کرپان

اشارہ:۔ تمھاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

جوابات سوال در سوال نمبر ۵

ماہ نومبر ۱۹۸۸ء

۱۔ شیخ الہند اور اسیرِ مالٹا کے خطابات سے شہرت پانے والے تحریکِ آزادی کے نامور رہنما کا نام مولانا محمود الحسن تھا۔

۲۔ جہانگیر نے ۱۸ سال کی عمر میں پہلی بار کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں اسکواش کے مشہور کھلاڑی جیف ہنٹ کو تاریخی شکست نومبر ۱۹۸۱ء میں دی جو ان کے عالمی چیمپئن بننے کا باعث بنی۔

۳۔ اوتھانٹ وہ واحد ایشائی ہیں جنہیں اقوامِ متحدہ کا سیکریٹری جنرل بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔

۴۔ ساکیا قبیلے کے کھتری راجا شدھوون (سدھوداتا) کا بیٹا مہاتما گوتم بدھ (ساکھی منی) تھا جسے طویل ریاضت کے بعد عرفان (نرواں) حاصل ہوا۔

۵۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی نظم میں فیصلِ کشورِ ہندوستان "ہمالیہ" کو کہا ہے۔

۶۔ نیپال دُنیا کی وہ واحد ہندو سلطنت ہے جس کا شمار غریب ملکوں میں ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ بھارت سیکولر یعنی لادینی سلطنت ہے۔

۷۔ بھارت میں بہنے والا گنگا وہ دریا ہے جس کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اس میں نہانے سے گناہ دُھل جاتے ہیں۔

۸۔ بحرِ ہند کی تیرہ سو میل لمبی اور ایک ہزار میل چوڑی خلیج کا نام خلیجِ بنگال ہے۔

۹۔ گھنے درختوں اور خطرناک جانوروں کے حوالے سے شہرت پانے والا جنگل سُندربن ہے جس کا بیشتر حصّہ بنگلہ دیش میں ہے۔

۱۰۔ بلّی کے خاندان کا گوشت خور پستانیہ "شیر" ہے جسے شجاعت اور بہادری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

جوابات کا باہمی تعلق

۱/۲ آزادی کے قائد مولانا محمود الحسن نے ۳۰ نومبر ۱۹۳۰ کو وفات پائی۔

۲/۳ اوتھانٹ نومبر میں

۳/۴ اوتھانٹ، گوتم بدھ کے پیروکار یعنی بدھ مت کے ماننے والے تھے۔

۴/۵ ہمالیہ اور گوتم بدھ دونوں کا تعلق ایک ہی مُلک یعنی نیپال سے ہے

۵/۶ ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی نیپال میں واقع ہے۔

۶/۷ دریائے گنگا کا منبع ہمالیہ ہے۔ ہمالیہ نیپال میں واقع ہے۔

۷/۸ دریائے گنگا خلیجِ بنگال میں گرتا ہے۔

۸/۹ سُندربن کا جنگل خلیجِ بنگال کے کنارے پر واقع ہے

۹/۱۰ سُندربن شیروں کی آماجگاہ ہے۔ ٹائیگر آف بنگال یہیں پایا جاتا ہے۔

انعام حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھی:-

۱۔ ذوالفقار حیدر، سنبھورو ۲۔ شفقت رحمٰن قریشی، اکوڑہ خٹک ۳۔ محمد شاہد رسول، حیدر آباد

ایک غلط جواب ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام:-

○ شفیق الرحمٰن، حیدر آباد ○ ظہیر الٰہی بابر، حیدر آباد ○ خرم احمد پیرزادہ، گھارو ○ غلام حسین میمن، حیدر آباد ○ شارق شمیم، کراچی ○ طارق علی، حیدر آباد ○ عاصم رضا، راولپنڈی ○ حارث وحید، لاہور ○ اے آر احمد، لاہور ○ غاور جعفری، حیدر آباد ○ محمد ذیشان ایوب، کراچی ○ رومانہ یحیٰی، گوجرانوالہ اکینٹ

دو غلط جوابات ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام:-

○ اُسامہ ممتاز، کراچی ○ اللہ دتہ عطیل، کبیر والا ○ خرم عبدالحمید بٹ، کراچی ○ حسن مہدی خراسانی، کراچی، ○ صائمہ یسین، لاہور۔

دیانت داری کا امتحان

حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ ایک غلام چرواہے کے پاس سے گزرے جو اپنے آقا کی بکریاں چرا رہا تھا۔ آپؓ نے ارادہ کیا کہ اس کی دیانت داری کا امتحان لیں۔ چنانچہ آپ نے چرواہے سے پوچھا۔

"کوئی بکری بیچو گے؟" وہ بولا "مالک یہاں نہیں ہے" ابنِ عمرؓ نے کہا "دے دو کہہ دینا بھیڑیا کھا گیا" غلام چرواہے نے جواب دیا "خُدا سے ڈرو! میرا پاک دامن گناہ سے آلودہ کرنا چاہتے ہو" ابنِ عمرؓ اس کا جواب سُن کر اتنا متاثر ہوئے کہ اُس غلام کو اُس کے آقا سے خرید کر آزاد کر دیا۔ پھر اُسے بکریوں کا وہ گلّہ بھی خرید کر دے دیا جسے وہ چرا رہا تھا۔

اکرام الرحمٰن سلیم، ڈیرہ غازی خان

دوڑنے کی رفتار

۱۔ چوپایوں میں چیتا سب سے تیز دوڑنے والا جانور ہے۔ یہ ایک گھنٹہ میں ۷۰ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے (۲) پرندوں میں سب سے تیز شاہین اُڑتا ہے۔ اس کی رفتار ۱۵۰ میل فی گھنٹہ ہے۔ (۳) ڈولفن مچھلی بڑی تیز تیراک ہے۔ وہ تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے تیرتی ہے۔ (۴) خرگوش کی رفتار ۳۵ میل سے ۴۰ میل فی گھنٹہ تک پہنچ جاتی ہے (۵) ہرن سات میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے (۶) آواز پانی میں ۴۸۶۰ فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ (۷) انسانی جسم کے اندر خون ۷ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کرتا ہے۔

عبدالہادی، نورالائی

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾	ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گرو ہے ﴿۳۸﴾
اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾	مگر داہنی طرف والے (نیک لوگ) ﴿۳۹﴾
فِيْ جَنّٰتٍ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾	(کہ) وہ باغہائے بہشت میں (ہونگے اور) پوچھتے ہونگے ﴿۴۰﴾
عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾	(یعنی آگ میں جلنے والے) گنہگاروں سے ﴿۴۱﴾
مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾	کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے؟ ﴿۴۲﴾
قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾	وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے ﴿۴۳﴾
وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾	اور نہ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے ﴿۴۴﴾
وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾	اور اہل باطل کے ساتھ مل کر (حق سے) انکار کرتے تھے ﴿۴۵﴾
وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾	اور روزجزا کو جھٹلاتے تھے ﴿۴۶﴾
حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿۴۷﴾	یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی ﴿۴۷﴾
فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾	تو (اس حال میں) سفارش کرنیوالوں کی سفارش انکے حق میں کچھ فائدہ نہ دیگی ﴿۴۸﴾

LXXIV—*The Cloaked One*

36. As a warning unto men,
37. Unto him of you who will advance or hang back.
38. Every soul is a pledge for its own deeds;
39. Save those who will stand on the right hand.
40. In gardens they will ask one another
41. Concerning the guilty:
42. What hath brought you to this burning?
43. They will answer: We were not of those who prayed
44. Nor did we feed the wretched.
45. We used to wade (in vain dispute) with (all) waders,
46. And we used to deny the Day of Judgement,
47. Till the inevitable came unto us.

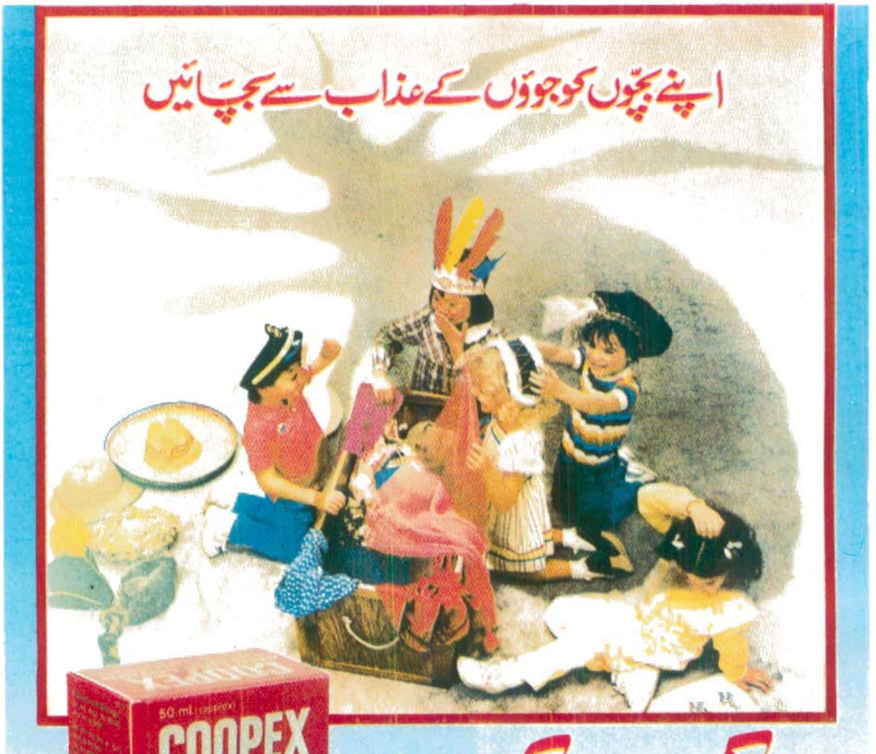

اپنے بچّوں کو جوؤں کے عذاب سے بچائیں
COOPEX
ANTI LICE LOTION
FOR SAFE AND EFFECTIVE TREATMENT OF HEAD LICE
کوپیکس
اینٹی لائس لوشن
استعمال کریں
کوپیکس اینٹی لائس لوشن بچوں کی جلد اور بالوں کو نقصان نہیں پہنچاتی، کوپیکس ڈی ڈی ٹی، بی ایچ سی، پروپوکسر، میلاتھیان اور اسی قسم کے دوسرے مضر صحت اجزاء سے پاک ہے۔
قیمت صرف
15.50
جوؤں اور لیکھوں سے مؤثر نجات کیلئے کوپیکس اینٹی لائس لوشن
TRANSWORLD

PRO-1-78-LP

manhattan PAKISTAN

سامری جادوگر

مدبّر رضوی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام اور ذکر آپ نے ضرور سُنا اور پڑھا ہوگا۔ آپؑ صاحبِ شریعت نبی تھے، "اللہ کا کلام"، "تورات" کی صورت میں آپؑ پر نازل ہُوا، آپؑ نے کوہ طور پر اللہ جل شانہٗ کی تجلّی (نور) دیکھا اور اس سے کلام کیا اسی لیے آپؑ کو کلیم اللہ کہا جاتا ہے۔ آپ کے زمانے میں مصر میں ایک عظیم الشّان بادشاہ حکومت کرتا تھا، مگر اُس نے گھمنڈ میں آ کے خدا ہونے کا دعویٰ کیا، حضرت موسیٰؑ نے اُس کو اللہ کے راستے پر چلنے کی ہدایت کی۔ لیکن وہ سیدھے راستے سے بھٹکا ہُوا تھا۔ غرور اور تکبّر کے نشے میں وہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کا جانی دشمن ہو گیا۔ پیغمبر کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو کئی معجزے عطا کیے تھے۔ ایک دفعہ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے عالیشان دربار میں طلب کر کے اپنے جادوگروں کے کرتب دکھائے۔ کرتب یہ تھا کہ جادوگروں نے زمین پر رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں اور منتر پڑھے، وہ سب لہراتے اور پھُنکارتے ہوئے سانپ بن گئیں۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصا زمین پر ڈال دیا۔ جو خُدا کے حکم سے ایک خوفناک اژدہا بن گیا۔ اور اژدہے نے جادوگروں کے سانپوں کو فوراً نگل لیا۔ حضرت موسیٰؑ نے جب اژدہے کو ہاتھ لگایا تو وہ پھر ایک عصا (لاٹھی) میں تبدیل ہو گیا۔ اس معجزے سے جادوگر دہشت زدہ اور مرعوب ہو کر سجدے میں گر گئے اور کہنے لگے بے شک حضرت موسیٰؑ کا خدا سچا ہے، اور ہماری یا ہمارے کرتب کی کوئی حقیقت نہیں۔ جادوگر حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ پر ایمان لے آئے اور انہوں نے فرعون کی سزا کی بھی پرواہ نہ کی۔ فرعون ایسا بدبخت تھا کہ پھر بھی ایمان نہ لایا اور اُلٹا حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں

کا سخت دشمن ہوگیا۔ حضرت موسیٰؑ کے عصا کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ آپ نے ایک مرتبہ پانی کی تلاش میں پتھریلی زمین پر عصا مارا، تو وہاں سے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے بارہ چشمے جاری ہوگئے۔ حضرت موسیٰؑ کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ آپ نے فرعون کے دربار میں اپنا ایک ہاتھ بغل میں دبا کر باہر نکالا تو آپ کی ہتھیلی ستارے کی طرح چمکنے لگی۔ اس معجزے کو ہی ید بیضا کہا جاتا ہے۔

فرعون اپنے کفر اور ظلم سے باز نہیں آیا، اس نے حضرت موسیٰؑ اور اُن کے ساتھیوں اور عزیزوں کو اتنا تنگ کیا کہ ان لوگوں نے طے کیا کہ ہم دریائے نیل کو پار کر کے مصر کو ہی چھوڑ دیں اور کسی دوسری جگہ پناہ لے لیں۔ لہٰذا حضرت موسیٰؑ، اُن کے بھائی حضرت ہارونؑ اور بنی اسرائیل کے بہت سے لوگ بحرِ قلزم کی طرف روانہ ہوگئے۔ فرعون اور اس کے لشکر نے حضرت موسیٰؑ اور اُن کے ساتھیوں کا پیچھا کیا۔ بنی اسرائیل بے سہارا لوگ تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے پار اُتریں۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ کے حضور دُعا کی اور اپنا ۔ ۔ ۔ عصا پانی کے اوپر مارا، اللہ کے حکم سے معجزہ رونما ہوا۔ پانی کا دھارا دو حصوں میں ٹکڑے ہو کر پھٹ گیا اور اس کے بالکل بیچ میں، صاف، خشک اور چوڑا راستہ بن گیا۔ حضرت موسیٰؑ اور اُن کے ساتھی اطمینان سے دریا کے بیچ میں بنے ہوئے راستے سے گزر کر دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ ان کے بعد فرعون اور اس کا لشکر بھی بیچ کے راستے پر چلنا شروع ہوا، لیکن ابھی انھوں نے تھوڑا سا راستہ ہی طے کیا تھا کہ پانی کے دھارے کے دو علیحدہ علیحدہ ٹکڑے اچانک ایک دوسرے سے آملے۔ خشکی کا راستہ ایسے غائب ہوگیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ دریائے نیل موجیں مارتا ہوا ایک مسلسل دریا بن گیا۔ پار اُترنا تو درکنار، اُنھیں اُلٹے پاؤں بھاگنے کی بھی مہلت نہ ملی اور اس طرح فرعون اور اس کا لشکر بحرِ قلزم میں ڈوب کر ہلاک ہوگیا۔

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل نے بحرِ قلزم کو پار کر کے جس سرزمین پر قدم رکھا وہ عربستان کا ایک حصہ ہے جو قلزم کے مشرق میں ہے۔ یہی وادئ سینا ہے اور کوہِ طور اسی کے ایک سرے پر واقع ہے۔ اسی علاقے میں بنی اسرائیل جب بھوک اور پیاس سے تنگ تھے تو حضرت موسیٰؑ نے زمین پر عصا مار کر پانی کے بارہ چشمے جاری کیے اور اللہ تعالیٰ کے حضور دُعا کی، تو غذا کے طور پر آسمان سے "من سلویٰ" جیسی نعمت اُتری۔ "من" ایک حلوہ جیسی میٹھی اور انتہائی مزیدار چیز تھی، جو درختوں پر سفید اولوں کی طرح جم گئی تھی اور "سلویٰ" بٹیروں کے غول کے غول تھے، جن کو ذبح کر کے اور بھون کر کھایا جا سکتا تھا۔ بنی اسرائیل کو جب کھانے پینے کی طرف سے اطمینان ہوا تو گرمی کی شدت اور دھوپ سے پریشان ہونے لگے۔ حضرت موسیٰؑ نے بارگاہِ ربّ العزت میں پھر دُعا کی اور آسمان پر بادلوں کے پرے کے پرے چھا گئے اور ہر طرف سایہ ہوگیا۔ اللہ کی قدرت کہ بنی اسرائیل جہاں بھی سفر کرتے ہوئے جاتے بادلوں کا یہ سائبان اُن کے سروں پر سایہ ڈالتا ہوا ساتھ ساتھ چلتا تھا۔

خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے وعدہ کیا تھا کہ جب فرعونی حکومت سے بنی اسرائیل کا چھٹکارا ہوجائے گا تو انھیں "شریعت" دی جائے گی۔ اللہ کی مرضی اور رضا سے حضرت موسیٰؑ کوہِ طور پر پہنچے اور وہاں تنہائی میں اللہ کی عبادت کی۔ آپ چالیس روز تک اعتکاف میں رہے۔

حضرت موسیٰؑ جب طور پر چلّہ کے لیے گئے تو اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اُن سے فرمایا کہ تم بنی اسرائیل کی دیکھ بھال کرنا اور انھیں سیدھے اور سچے راستے سے نہ بھٹکنے دینا۔

حضرت موسیٰؑ نے چلّہ کشی کے بعد ربِّ حقیقی کا جلوہ دیکھا، اس کی تجلّی دیکھی، مگر وہ اُس کی تاب نہ لاسکے۔ بے ہوش ہوگئے اور کوہ طور اللہ کے جلوے کی ایک جھلک سے ریزہ ریزہ ہوگیا... اسی موقع اور جگہ پر حضرت موسیٰؑ کو تورات عطا کی گئی اور شریعت سونپی گئی۔

اس طرف تو ربِّ جلیل، حضرت موسیٰؑ کو شریعت اور تورات جیسی انمول دولت عطا کر رہا تھا۔ اُدھر بنی اسرائیل کے درمیان ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ بنی اسرائیل کو سُدھارنے اور سیدھا راستہ دکھانے کی حضرت موسیٰؑ نے ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن یہ ایک عجیب ناشکری اُمّت تھی۔ اُن میں صبر واستقلال کی کمی تھی۔ بُری ذہنیت اور اخلاقی گراوٹ کا ذرا سی دیر میں اظہار کرنے لگتے تھے۔ ہوا یوں کہ حضرت موسیٰؑ ... جب طور پہاڑ پر تورات لینے کے لیے جانے لگے تو اُنھوں نے بنی اسرائیل سے فرمایا: میں ایک ماہ کے اعتکاف میں جارہا ہوں۔ ہارونؑ تمھارے درمیان موجود ہیں۔ اُن سے رہنمائی حاصل کرنا..." اللہ کے حکم سے اعتکاف کی مُدّت تیس دن کے بجائے چالیس دن ہوگئی... بنی اسرائیل خواہ مخواہ بے چین ہونے لگے اور فضول قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اس دیر سویر سے اور بنی اسرائیل کی بُری ذہنیت اور گمراہی سے ایک شخص نے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔

اُس بے دین اور منافق آدمی کا نام سامری تھا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سامری اُس کا لقب تھا۔ یُوں تو سامری ظاہری طور سے بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھا لیکن دراصل وہ بُت پرست اور جادوگر تھا۔ وہ خُدائے واحد اور شریعتِ موسوی پر دل سے یقین نہ رکھتا تھا۔

بنی اسرائیل سینکڑوں برس تک مصریوں اور فرعونوں کے غلام رہے تھے۔ مصر میں بُت پرستی مُشرکانہ رسمیں اور عقیدے عام تھے۔ جادو منتر، ٹونے، طلسم، شعبدہ بازی۔ دیوی دیوتاؤں کی پُوجا کا قدیم مصر میں بہت رواج تھا۔ ہندوؤں کی طرح قدیم مصری بھی گائے، بیل اور بچھڑے کو مقدس خیال کرتے تھے اور اُن کو پُوجتے تھے۔ اِسی لیے بنی اسرائیل کے عقیدوں میں کمزوری جھلکنے لگتی تھی اور بڑی آسانی سے شرک اور گمراہی میں مائل ہوجاتے تھے۔

ان تمام باتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے سامری نے بنی اسرائیل کو بہکایا اور اُن سے کہا کہ "تم لوگ جب مصر سے چلے تھے تو تمہاری عورتوں نے مصری عورتوں سے بہت سے زیورات مانگ کر لیے تھے، جو تم واپس نہ کر سکے۔ اب وہ زیورات اپنی عورتوں سے لے کر میرے پاس لے آؤ۔ میں تمہارے فائدے کی ایک بات کر کے دکھاؤں گا۔" بنی اسرائیل نے زیورات سامری کے حوالے کر دیے۔ اُس نے بھٹی میں آگ جلائی اور زیورات کو پگھلا کر ایک دھات کا بچھڑا (گوسالہ) تیار کیا۔ پھر اپنے پاس سے ایک مُٹھی بھر خاک اس بچھڑے کے اندر ڈال دی۔ بنی اسرائیل یہ دیکھ کر سخت حیران ہوئے کہ اس بے جان بچھڑے میں اچانک جان سی پڑ گئی اور وہ زندہ بچھڑے کی طرح "بھائیں، بھائیں" بولنے لگا۔

اب سامری نے اور زیادہ چالاکی دکھائی۔ بنی اسرائیل کی حیرانی اور عقیدے کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سامری نے اُن کو گمراہ کیا کہ ذرا دیکھو موسیٰؑ سے بھول چوک اور غلطی ہو گئی۔ وہ تو خُدا کو تلاش کرنے اور دیکھنے طور پہاڑ پر گیا ہے، حالانکہ تمہارا معبود اور خُدا تو تمہارے سامنے موجود ہے اور تم اپنی آنکھوں سے اس کو بولتے ہوئے دیکھ رہے ہو۔۔۔ بنی اسرائیل نے بدبختی سے سامری کی بات مان لی، اس بچھڑے کو اپنا معبود سمجھ کر اس کی پُوجا کرنے لگے۔ حضرت ہارونؑ نے اُن کو بہت سمجھایا اور لعنت ملامت کی کہ ایسا ہرگز نہ کرو مگر وہ نہ مانے اور کہنے لگے جب تک موسیٰؑ واپس نہیں آتے ہم ایسا ہی کرتے رہیں گے۔

اِدھر تو یہ ہو رہا تھا، اُدھر ربِّ کریم نے حضرت موسیٰؑ کو بذریعہ وحی اس تمام واقعے سے۔۔۔ آگاہ کر دیا اور اُن کو بتایا گیا کہ اے موسیٰؑ جس قوم کے لیے تم اتنے بے چین اور پریشان ہو وہ ایسی گمراہی میں مُبتلا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو سخت رنج ہُوا اور وہ بڑے غصّے میں بنی اسرائیل کی طرف لوٹے۔ اُنھوں نے بڑے غیظ و غضب میں قوم کو لتاڑا اور پھٹکارا۔ وہ غصّے سے کانپ رہے تھے، یہاں تک کہ ان کے ہاتھ میں تورات کے احکام کی جو تختیاں (الواح) تھیں، گر گئیں۔

بنی اسرائیل ڈھیٹ بن کر کہنے لگے، ہمارا کیا قصور، مصریوں کے زیورات کا بوجھ ہمارے ساتھ تھا، سامری نے ہم سے لے کر یہ تماشا بنا دیا اور ہمیں سیدھی راہ سے بھٹکا دیا۔

حضرت موسیٰؑ کے لیے بنی اسرائیل کا یہ شرک اور گمراہی ناقابلِ برداشت تھی وہ غصّے اور رنج میں اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو مارنے دوڑے اور سوال کرنے لگے کہ تم نے بنی اسرائیل کو اس غلط حرکت سے کیوں نہ روکا۔ حضرت ہارونؑ نے کہا بھائی میں نے ان لوگوں کو بے حد سمجھایا بجھایا اور اس حرکت سے منع کیا مگر انہوں نے ہرگز میری بات نہ مانی۔ بلکہ میری جان لینے کے درپے ہو گئے۔ میں آپ کا انتظار کر رہا تھا کہ کسی طرح آپ ہی ان کو قابو میں لائیں گے۔ حضرت

ہارونؑ کی یہ بات سُن کر حضرت موسیٰؑ سامری کی طرف بڑھے اور اُس سے فرمایا کہ بدبخت تونے یہ کیا کھیل تماشا بنایا ہے؟

سامری بولا کہ میں نے ایک ایسی بات دیکھی کہ بنی اسرائیل میں سے کسی نے نہ دیکھی ہوگی۔ جس وقت فرعون دریا میں غرق ہوا تھا، اُس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام ایک گھوڑے پر سوار اسرائیلیوں اور فرعونی لشکر کے درمیان حائل تھے۔ میں نے یہ عجیب بات دیکھی کہ اُن کے گھوڑے کے سُم جب زمین کو چھوتے تھے، تو اُن کے سُم کی خاک سے زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے تھے۔ چٹیل اور خشک زمین پر یکایک سبزہ اُگ آتا تھا۔ تو میں نے جبرئیل کے گھوڑے کے قدموں سے ایک مٹھی خاک اپنے پاس محفوظ کر لی۔ اُسی خاک سے میں نے یہ عجیب و غریب کمال دکھایا کہ مُردہ دھاتی بچھڑے میں یہ خاک ڈال دی اور یہ بچھڑا، زندہ جانور کی طرح "بھاں، بھاں" کرنے لگا۔

حضرت موسیٰؑ، اللہ کے پاک اور جلیل القدر نبی تھے انہوں نے سامری سے فرمایا کہ "ملعون، اب تیرے لیے دنیا میں یہ سزا ہے کہ تو پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرے اور جب کوئی آدمی تیرے قریب آئے، تو بھاگ جائے اور چیخے کہ دیکھنا مجھے ہاتھ نہ لگانا، باقی رہا عاقبت کا حال تو وعدۂ الٰہی کے مطابق تو وہاں ہمیشہ سخت عذاب میں مُبتلا رہے گا۔ اے سامری اپنی آنکھوں سے دیکھ جس بچھڑے (گوسالہ) کو تو نے معبود بنانے کا ڈھونگ رچایا، اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اس کو آگ میں پھینک کر ہم ابھی بھسم کیے دیتے ہیں۔ اور اس کی راکھ کو دریا میں بہائے دیتے ہیں تاکہ تجھے اور تیرے ان گمراہ اور بیوقوف چیلے چانٹوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے جعلی معبود اور جھوٹے خُدا کی یہ حیثیت ہے!۔ وہ خدا، دوسروں کی بھلائی کیا کرے گا جس میں اپنی ہستی کو بھی بچانے کی صلاحیت اور طاقت نہ ہو۔ بدبختو! اور نادانوں۔ یہ چھوٹی سی بات بھی تم نہ سمجھ سکے کہ تمہارا ہمارا حقیقی معبود صرف اللہ ہے جو واحد و یکتا ہے، جس کا نہ کوئی ساتھی ہے، نہ شریک اور وہ ہر شے کا عالم اور دانا ہے اور وہ ہر بات پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا قصّہ اور آگے جاتا ہے، جس کو فی الحال ہم بیان نہیں کر رہے لیکن سچائی کی تلاش کرنے اور دین و مذہب سے لگاؤ رکھنے والے ہر شخص کو اپنی معلومات اور ہدایت کے لیے اُسے ضرور پڑھنا چاہیے۔ قرآن مجید اور احادیث نبویؐ کے مطالعہ سے نمایاں ہوتا ہے کہ ختم المرسلین رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے بعد حضرت موسیٰؑ اولوالعزم رسول اور پیغمبر ہیں۔ اور بے شک تمام نبیوں اور رسولوں میں بڑی قدر و منزلت کے مالک ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے بچپن سے وفات تک کے حالات ایسے عجیب و غریب ہیں اور انہوں نے فرعون، قوم فرعون اور خود بنی اسرائیل کے ہاتھوں جو تکلیفیں اور مصیبتیں اُٹھائیں اور ان کی اصلاح و رہنمائی کے لیے جس ایذا اور دشواریوں سے گزرے اس کی مثال رنبی اکرمؐ اور حضرت ابراہیمؑ کو چھوڑ کر کسی نبی اور رسول کی زندگی میں نہیں ملتی۔ حضرت موسیٰؑ کے حالاتِ زندگی میں ایک مسلسل جدوجہد دکھائی دیتی ہے اور بصیرت کے بڑے پہلو ملتے ہیں۔

ایک ہاتھی اور چھ نابینا

شاہنواز فاروقی

ہندوستان میں صدیوں پہلے
علم کی اُن میں پیاس تھی زیادہ
ہاتھی دیکھنے جائیں گے وہ
سو، وہ اندھے ہندوستانی
جنم جنم کے ساتھی جیسے
بڑھ کر پیٹ چھُوا پہلے نے
اُف! یہ تو ہموار سا ہے
پھر دُوجا نابینا بڑھا
چھُوتے ہی وہ چیخ پڑا
گول ہے یہ اور چکنا بھی
سو، میرا یہ کہنا ہے
اب سُنیے جی سوم کا قصّہ
سونڈ پکڑ کر وہ بولا
سمجھ گیا میں کیسا ہے

چھ نابینا ساتھ تھے رہتے
اِک دن سب نے کیا ارادہ
علم کی پیاس بُجھائیں گے وہ
اپنی فطرت میں سیلانی
اِک دن ہاتھی دیکھنے پہنچے
اور لگا چِلّا کر کہنے
ہاتھی تو دیوار سا ہے
اور بڑھ کر دانتوں کو چھُوا
میرے مالک، میرے خُدا
تیز دھار اور لمبا بھی
ہاتھی نیزے جیسا ہے
اُس نے پکڑا سونڈ کا حصّہ
میرے رب، میرے مولا
ہاتھی سانپ کے جیسا ہے

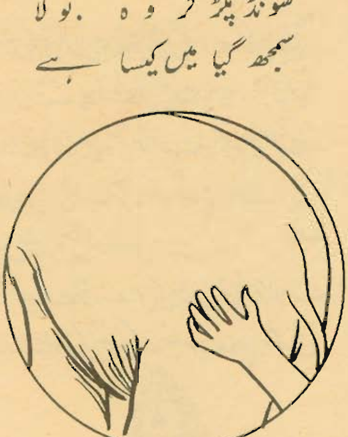

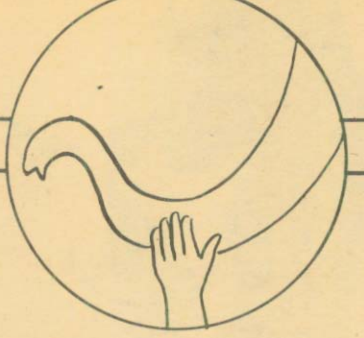

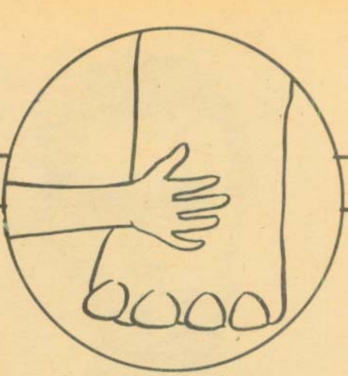

پھر چوتھا نابینا بڑھا
پیر چھُوا اور فرمایا
ایسا ہے نہ ویسا ہے
پھر آیا پنجم کا نمبر !
پکڑ لیا ہاتھی کا کان
غلط آپ کا کہنا ہے
چھٹے نے آخر میں اُکتا کر
ہاتھی کی ہلتی دُم پکڑی
ایسا ہے نہ ویسا ہے
دیر تلک وہ لڑتے رہے
ٹھیک تھا ہر اک جُدا جُدا

اور ہاتھی کا پیر چھُوا
میری سمجھ میں یہ آیا
ہاتھی پیڑ کے جیسا ہے
اُس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر
اور کیا فوراً اعلان
ہاتھی پنکھے جیسا ہے
ہاتھی کا اک چکر کھا کر
اور لگائی ہانک یہ تگڑی
ہاتھی رسّی جیسا ہے
اپنی رائے پہ اَڑے رہے
لیکن ہر اک غلط بھی تھا

(جان جے ساکس کی نظم سے ماخوذ)

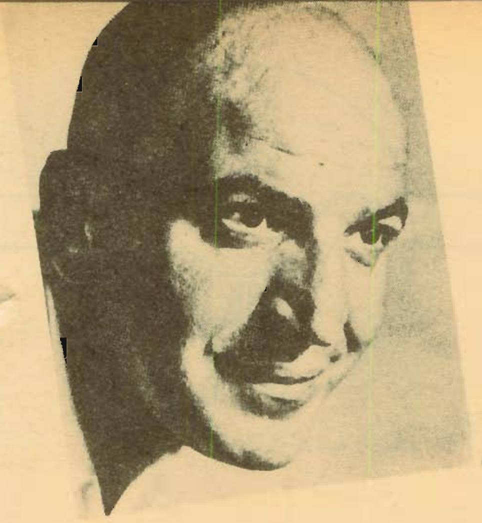

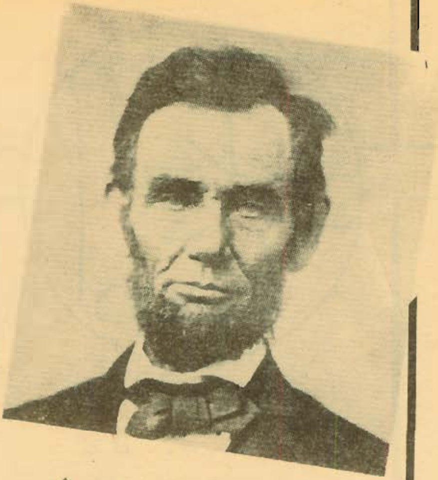

دنیا کے عظیم بھُوت

ابنِ عالم

دُنیا کی نامور شخصیات اور ان کے بھُوت

دُنیا پُراسرار واقعات سے بھری ہُوئی ہے۔ ایسے واقعات جنہیں سُن کر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان میں بہت سے حادثات و واقعات تو فرضی ہوتے ہیں اور کچھ سچے۔ ۱۹۸۲ء میں لندن سے ایک کتاب (The World's Greatest Ghosts) دُنیا کے عظیم ترین بھُوت اشائع ہوئی ہے۔ اس کے مصنفین نائجل بلنڈیل اور راجر بور نے تحقیق و تفتیش کے بعد اس کتاب میں ایسے ایک سو واقعات جمع کر دیے ہیں جو سچے اور حیرت انگیز ہیں اور دُنیا کے مشہور لوگوں کے ساتھ پیش آئے ہیں یا مشہور شخصیات کا بھُوت لوگوں نے دیکھا ہے۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے اس کتاب سے چند واقعات کا انتخاب پیش کیا جارہا ہے

کوجیک کی بھُوت سے ملاقات:۔ ٹیلی وژن کی مشہور سیریل "کوجیک" کا کردار تو آپ کو یاد ہوگا۔ دراز قد اور گنجے سر کے مالک ٹیلی سیوالاس نے کوجیک کا کردار ادا کر کے زبردست شہرت

حاصل کی۔ان کی زندگی میں بھی ایک ناقابلِ یقین بلکہ خوفناک واقعہ گزر چکا ہے۔جس کا تصور کرکے وہ آج بھی خوفزدہ ہوجاتے ہیں۔ ہُوا یہ کہ ایک بار وہ رات کے تین بجے نیویارک آرہے تھے۔ ہائی وے پر انہیں اندازہ ہُوا کہ ان کی کار میں ایندھن ختم ہوچکا ہے۔قریب ہی واقع ایک کافی ہاؤس کے قریب اُنہوں نے گاڑی پارک کی۔ اندر گئے اور پہلے تو گرم گرم کافی پی کر سردی کے اثر کو کم کرنے کی کوشش کی۔ پھر قریبی گیس اسٹیشن کا پتہ معلوم کرکے پیدل ہی اُس طرف روانہ ہوگئے۔ ابھی وہ تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ اُن کے قریب ایک سیاہ کیڈلک کار آکر رُکی۔کار میں سوار شخص نے اُنہیں لفٹ کی پیشکش کی جسے ٹیلی سیوالاس نے قبول کرلیا۔کار میں بیٹھنے کے بعد اُنہیں اندازہ ہُوا کہ ان کا بٹوہ کہیں گر گیا ہے جس میں روپے موجود تھے۔ان کی پریشانی بھانپ کر کار والے نے ان کو ایک ڈالر دیا۔جسے انہوں نے اس شرط کے ساتھ لیا کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں اُسے واپس کردیں گے۔ پھر اُنہوں نے اس آدمی سے ایک کاغذ پر اس کے گھر کا پتہ اور نام لکھوالیا۔اس آدمی کا نام ہیری ایگانس تھا۔

اگلے دن ٹیلی سیوالاس نے اُس آدمی کے گھر فون کیا۔ایک خاتون نے فون ریسیو کیا اور بتایا کہ ہیری ایگانس ان کے شوہر کا نام ہے جن کا تین سال قبل انتقال ہوچکا ہے۔یہ سُن کر ٹیلی سیوالاس کو شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔اگر وہ شخص مرچکا تھا تو پھر وہ کون تھا جس نے گزشتہ رات ان کو کاغذ پر اپنا نام و پتہ تحریر کیا تھا۔وہ اس عورت سے ملنے خود گئے۔اور اس شخص کے ہاتھ کی تحریر اُسے دکھائی اس عورت یعنی مسز ہیری ایگانس نے اقرار کیا کہ یہ تحریر اُس کے مرحوم شوہر ہی کی ہے۔ پھر ٹیلی سیوالاس نے اس شخص کے لباس کے بارے میں بتایا۔مسز ہیری نے بتایا کہ انہی کپڑوں میں ہیری کی تدفین ہوئی تھی۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہیری کے بھوت نے ان کی مدد کی تھی؟ ٹیلی سیوالاس نے ایک بار کہا "کوجیک نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے کیس نمٹائے مگر یہ کیس شاید وہ کبھی حل نہ کرسکے گا۔"

کیا لنکن موت کے بعد بھی زندہ تھا؟ مشہور امریکی صدر ابراہام لنکن کے بارے میں بھی پُراسرار قسم کی روایات سو برس سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے باوجود موجود ہیں، لنکن کو واشنگٹن کے ایک تھیٹر میں اپریل ۱۸۶۵ء میں گولی ماردی گئی تھی۔لنکن کا تابوت ایک اسپیشل ٹرین میں رکھ کر تدفین کے لیے لے جایا گیا۔یہ ٹرین ہر اسٹیشن پر آٹھ منٹ کے لیے رُکتی تھی۔اور لوگ جوق در جوق اپنے محبوب رہنما کا آخری دیدار کرتے تھے۔چند روز بعد ایک عجیب وغریب واقعہ رُونما ہُوا۔رات کو ایک پُراسرار سی ٹرین مختلف اسٹیشنوں سے گزرتی اور ہر اسٹیشن پر گھڑی آٹھ منٹ کے لیے رُک جایا کرتی تھی۔اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہائٹ ہاؤس میں ابراہام لنکن کو اکثر رات کے وقت دیکھا گیا ہے۔برطانیہ کے سرونسٹن چرچل ایک بار وہائٹ ہاؤس کے اُس کمرے میں سوئے جو کبھی ابراہام لنکن کی خوابگاہ تھی۔اُنھوں نے بھی لنکن کے

بھوت کو دیکھا اور اُسی رات کمرہ بدلنے پر مجبور ہو گئے ۔ ایک امریکی صدر تھیوڈور رُوز ویلیٹ کا کہنا ہے ۔ "میں نے لنکن کو مختلف کمروں اور ہال میں خود چلتے پھرتے دیکھا ہے"۔ ایک اور امریکی صدر آئزن ہاور کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے کئی مرتبہ لنکن کی موجودگی کو محسوس کیا ہے۔ اسی طرح ایک بار وہائٹ ہاؤس کی ایک اسٹاف آفیسر خاتون میری ابین کو ایک دن محسوس ہُوا کہ دوسری منزل پر واقع خوابگاہ میں کوئی شخص موجود ہے۔ وہ وہاں پہنچیں تو دیکھا کہ ایک شخص بستر پر بیٹھ کر جُوتے اُتار رہا ہے۔ اس شخص کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میری کو سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ شخص ابراہام لنکن تھا۔

لارڈ تھامس کو اپنی موت کا علم ہو گیا ۔ ۲۴ر نومبر ۱۷۷۹ء کو سرے، انگلستان کا ایک لارڈ تھامس لائٹلٹن اپنے چند دوستوں کے ہمراہ ناشتے کی میز پر بیٹھا اپنے چٹکلوں سے محفل کو زعفران زار بنا رہا تھا۔ دورانِ گفتگو لارڈ نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ تین دن بعد وہ مر جائے گا۔ مگر اس کی اس بات کو قہقہوں میں اُڑا دیا گیا۔ اگلے دن لارڈ نے ایوانِ نمائندگان میں تقریر کی۔ جسے بہت پسند کیا گیا۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ وہ اپنے ساتھی رُکن پارلیمنٹ پیٹر اینڈ ریوز کے ساتھ ویک اینڈ گزارنا چاہتا ہے۔ مگر تیسری رات کو اچانک گیارہ بجے لارڈ تھامس لائٹلٹن کو اپنے سینے میں شدید درد کا احساس ہُوا اور چند لمحوں بعد وہ اپنے ایک خادم کے بازوؤں میں دَم توڑ چکا تھا۔ عین اُسی وقت چند میل دُور ڈارٹ فورڈ میں واقع مکان میں اینڈ ریوز کی آنکھ کھُل گئی تو اُس نے دیکھا کہ لارڈ تھامس اُس کے بستر کے نزدیک کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے "اینڈ ریوز، میرا وقت آچکا ہے"۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گیا۔ پیٹر اینڈ ریوز کو پریشانی کے عالم میں نیند نہ آسکی اور اگلی صبح اُسے لارڈ کے مرنے کی اطلاع مل گئی۔ گویا لارڈ نے اپنی موت کی جو اطلاع پیشگی دی تھی وہ صحیح ثابت ہُوئی۔

وہ ایک لڑکی :- ۱۹۶۴ء میں سیسکس، برطانیہ میں کئی ڈرائیوروں نے رات کے وقت ایک بھُورے بالوں والی لڑکی کو دیکھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر بہت سے ڈرائیور خوفزدہ ہو گئے کیونکہ لڑکی چند لمحوں تک نظر آنے کے بعد غائب ہو جاتی تھی۔ ۱۹۷۲ء تک بہت سے لوگوں کو وہ رات کے وقت نظر آتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ بہت سے لوگوں نے اس کا پیچھا کرنا چاہا۔ اُسے پکڑنا چاہا مگر ہر بار ناکام رہتے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس جگہ کافی عرصہ قبل ایک حادثے میں ایک بھُورے بالوں والی لڑکی ختم ہو گئی تھی۔ یہ بھُوت اُسی لڑکی کا تھا۔ لڑکی نے حادثے کے وقت زرد رنگ کی برساتی پہنی ہُوئی تھی۔ اس کا بھُوت بھی اُسی انداز میں نظر آتا تھا۔

یہ کیسا ایئر پورٹ تھا؟ ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے۔ برطانیہ کے رائل ایئر فورس کے ایک پائلٹ وکٹر گوڈارڈ نے جنوبی انگلستان پر پرواز کے دوران ایک بہت بڑے میدان میں ایک فضائی

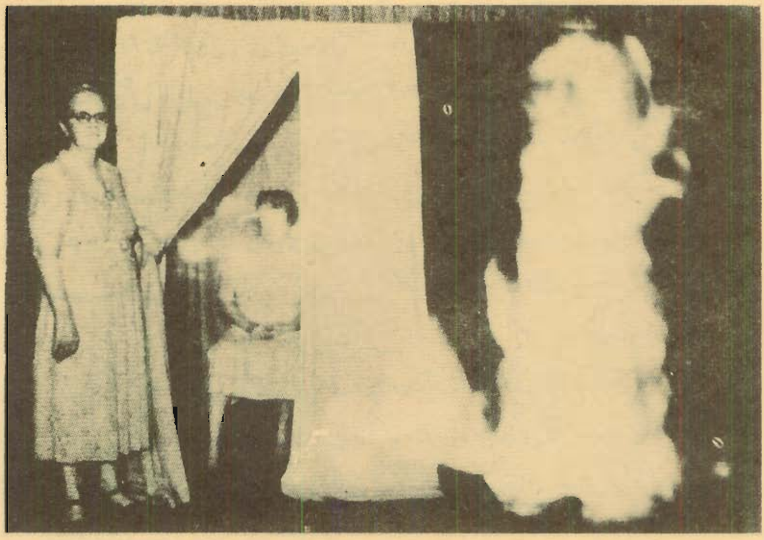

انفرا ریڈ کیمرے سے روح کی آمد کا ایک منظر۔ اوُپر کی تصویر میں دھندلا سا عکس
اس حاضر ہونے والی روح کا ہے جو نیچے کی تصویر میں واضح طور پر نظر آرہی ہے۔

اڈہ دیکھا۔ جس میں جہازوں کے ہینگر بنے ہوئے تھے اور رن وے پر کئی طیارے کھڑے تھے۔ وکٹر سخت حیران ہوا کیونکہ اُس کے پاس موجود نقشوں میں کسی ایسے فضائی اڈّے کی کوئی تفصیل موجود نہ تھی اور نہ ہی ایئر فورس کے ریکارڈ میں یہ بات شامل تھی۔ پانچ برس بعد وکٹر گوڈارڈ نے وہ جگہ دوبارہ دیکھی وہاں ایئر پورٹ بن چکا تھا اور اب وہاں رائل ایئر فورس کے طیارے کھڑے تھے۔ یہ نازیوں کے خلاف انگریزوں کی فرنٹ لائن تھی۔ گویا اس نے پانچ برس پہلے کا ایک منظر دیکھ لیا تھا۔ وکٹر گوڈارڈ بعد میں ایئر مارشل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مگر وہ اس حیرتناک منظر کو کبھی نہ بھول سکے۔ یعنی جس چیز کا کوئی وجود نہیں اُسے پہلے سے دیکھ لیا جائے۔

معذور بھوت:۔ نوٹنگھم، وسطی انگلستان کے رہنے والے ایک خاندان کے کئی افراد نے ۱۹۷۰ء میں اپنے گھر میں یونیفارم میں ملبوس ایک شخص یا دوسرے معنوں میں ایک بھوت دیکھا۔ خاندان کے افراد اُسے دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھار وہ بھوت نظر نہ آتا تو عجیب و غریب آوازیں سُنائی دینے لگتیں۔ اُن لوگوں نے ایک ماہرِ روحانیات سے رابطہ قائم کیا۔ جس نے کئی روز کی تحقیق کے بعد بتایا کہ نظر آنے والا بھوت ایک ایسے شخص کا ہے جو بہت پہلے سیڑھیوں سے گر کر معذور ہو گیا تھا اور بعد میں خودکشی کر لی تھی۔

بھوت نے زندگی بچائی:۔ برطانوی فوج کے ایک کارپورل جیرالڈ پولر کا کہنا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ایک بھوت نے اُس کی زندگی بچائی۔ ہوا یہ کہ برما کے محاذِ جنگ پر ایک مورچے پر جاپانی توپخانہ بُری طرح گولہ باری کر رہا تھا۔ پولر نے چاہا کہ چند لمحے آرام کر لے۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اس کے قریب کوئی موجود ہے۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو ایک سِکھ سپاہی کھڑا تھا جس نے پولر کو کہا کہ کیپٹن اُس سے ملنا چاہتا ہے وہ فوراً سگنل آفس پہنچا۔ وہاں پہنچ کر پولر کو معلوم ہوا کہ اُسے کسی نے طلب نہیں کیا۔ وہ حیرانی کے عالم میں اپنے مورچے پر پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ اس کے مورچے پر شیل لگنے سے ہر چیز تہس نہس ہو چکی تھی۔ پولر نے بعد میں کہا۔

"حیران کُن بات یہ ہے کہ ہمارے ہیڈکوارٹر میں کوئی سکھ سپاہی نہیں تھا۔"

آپ کے گھر کے آگے لگا ہوا کوڑے کا یہ انبار آپ کے بارے میں لوگوں کی رائے کو خراب کر رہا ہے
گھر کی طرح اپنی گلی کو بھی صاف رکھیے۔

درخت قومی معیشت کے استحکام کا ایک ذریعہ ہیں، اُنھیں کاٹ کر قومی معیشت کو دیمک مت لگائیں۔ زیادہ سے زیادہ درخت اُگائیں۔

میری ڈائری

ڈائری لکھنا بھی دیگر مشاغل کی طرح ایک مشغلہ ہے۔ مگر یہ مشغلہ نسبتاً بڑوں میں زیادہ مقبول ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ چھوٹی عمر کے لوگ ڈائری نہیں لکھ سکتے، ہمارے مشاہدے میں کئی ایسے طلبہ و طالبات اور نوآموز قلم کار آئے ہیں جو اپنی ڈائری بے قاعدگی یا باقاعدگی سے لکھتے ہیں مگر لکھتے ضرور ہیں۔ یقیناً لکھتے پڑھتے رہنا ایک اچھی عادت ہے، ڈائری لکھنے کا ہر ایک کا اپنا علیحدہ ایک انداز ہے۔ کسی کی ڈائری اشعار سے مزین ہے تو کسی کی اقتباسات سے، کوئی اپنے تاثرات کو ڈائری میں قلم بند کرتا ہے تو کوئی اپنے روزمرہ کے معمولات کو،

اگر آپ ڈائری لکھتے ہیں تو آپ کی ڈائری میں بھی کوئی پیارا سا شعر، کوئی مفید قول، کوئی گُر کی بات یا کوئی حکیمانہ سا نکتہ ضرور ہوگا، اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی ڈائری کا کوئی ورق دوسروں کے لیے بھی مفید اور معلوماتی ہوسکتا ہے یا اُن کے ذوقِ مطالعہ کو تسکین بخشتا ہے تو پھر ایک لمحے کی بھی دیر نہ کیجیے، ڈائری کے اس ورق کی ایک نقل فوراً ہمیں بھجوا دیجیے۔ ہم اسے آپ کے نام کے ساتھ بہت جلد "میری ڈائری" میں شامل کریں گے۔

۲، نومبر ۱۹۸۸ء (عبدالقادر بلوچ - اسلام آباد)

شام کو کھیل کود کے بعد گھر لوٹا تو سردی بڑھ چکی تھی۔ امی نے گرم گرم چائے بنا کر دی اور میں ابّو کی لائبریری سے ایک کتاب اٹھا لایا، درمیان میں سے کھولی تو قائدِ اعظم کا یہ فرمان نظروں سے گزرا میں نے فوراً اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔

"ہم جتنی زیادہ تکلیفیں سہنا اور قربانیاں دینا سیکھیں گے، اُتنا ہی زیادہ پاکیزہ، خالص اور مضبوط قوم کی حیثیت میں اُبھریں گے، جیسے سونا آگ میں تپ کر کندن بن جاتا ہے۔"

۱۶، نومبر ۱۹۸۸ء (خالد منہاس، ناظم آباد، کراچی)

آج صبح دیر سے آنکھ کھلی ۔۔۔ بیدار ہوا تو باجی ناشتہ لے کر آگئیں۔ خلافِ معمول آج گھر میں امی، ابو، بڑے بھائی، انکل کوئی بھی نظر نہ آیا ۔۔۔ باجی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ سارے لوگ صبح ہی صبح ووٹ ڈالنے گئے ہیں ۔۔۔ فوراً یاد آگیا۔ کئی دنوں سے الیکشن کے بارے میں خبریں آرہی تھیں مختلف پارٹیوں کے جلسے جلوس ہو رہے تھے، نعرے لگ رہے تھے۔ ناشتے کے بعد باجی سے اجازت لے کر باہر نکلا تو ہر طرف گہما

گھی نظر آئیں، رنگ برنگے جھنڈے، جھنڈیاں اور بینر جو پہلے بھی لگے ہوئے تھے مگر اب اُن میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔ بہت ساری گاڑیاں اِدھر سے اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں بھی نظارا کرتا رہا۔ پھر یہ دُعا کرتا ہُوا گھر آگیا کہ خُدا کرے ان انتخابات کے باعث ہمارے ملک میں استحکام پیدا ہو، خوشحالی ہو، امن و انصاف ہو، ہم اتحاد اور محبت کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

۵ فروری ۱۹۸۷ء (محمد شفیق، ایبٹ آباد، سرحد)

صُبح صبح اخبار کا مطالعہ کرتے ہُوئے احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر بہت پسند آیا۔ میں نے فوراً اپنی نوٹ بُک میں لکھ لیا،

عزم سفر کیا ہے تو رختِ سفر بھی باندھ
منزل ہے آسماں تو بے بال و پَر نہ جا

---

۲ مارچ ۱۹۸۷ء (محمد عادل منہاج، نیو کراچی)

صبح اسکول پہنچا... دیکھا تو کلاس خالی تھی اور سارے بچے باہر خوش گپیوں میں مصروف تھے، میں نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ آپ لوگ کلاسوں میں کیوں نہیں بیٹھ رہے۔ سب لڑکوں نے مجھے گھُورا اور ایک بولا "تمہیں معلوم نہیں آج انڈیا اور پاکستان کے درمیان کرکٹ میچ ہے۔ آج پڑھائی نہیں ہو رہی۔ تھوڑی دیر بعد چُھٹی ہو جائے گی"۔ مجھے بہت حیرت ہوئی، حیران و پریشان گھر پہنچا، نماز کا وقت ہو رہا تھا اور بھائی جان انتہائی انہماک سے میچ دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا "چلیں بھائی جان۔ نماز کا وقت نکل رہا ہے۔ مسجد چلتے ہیں"۔ بھائی جان نے مجھے سخت نظروں سے دیکھا اور لاپرواہی سے بولے "پڑھ لیں گے یار۔ میچ تو دیکھنے دو"۔ میں سوچنے لگا کہ میرے نماز نہ پڑھنے کی صورت میں جہنم کی خوفناک سزاؤں سے ڈرانے والے بھائی جان کو آج کیا ہوگیا ہے؟

---

۳ اگست ۱۹۸۸ء (رضوان احمد، ناظم آباد، کراچی)

"ہمارے اسکول میں امتحان کے نتیجے کا اعلان ہونے والا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اسکول پہنچا۔ میں نے پوری تندہی اور محنت کے ساتھ تمام پرچے دیے تھے۔ پھر اللہ میاں سے دُعا بھی کی تھی کہ وہ مجھے اچھے نمبروں سے کامیاب کرے۔ اسکول کے گراؤنڈ میں نتیجے کا اعلان ہُوا۔ میں نے اپنی کلاس میں پہلی اور پُورے اسکول میں دوسری پوزیشن لی ہے۔ تمام اساتذہ نے مبارک باد دی۔ دوستوں نے مٹھائی کھلانے پر اصرار کیا۔ اسکول سے نکلتے ہی تقریباً بھاگتے ہوئے گھر پہنچا۔ امّی نے سُنا تو میرا منہ چُوم لیا۔ بہت خوش ہوئیں۔ ابّو کو فون کیا۔ ابّو بھی بہت خوش ہوئے۔ میں بھی بہت خُوش تھا۔ مگر میری خوشی میں اُس وقت اضافہ ہوگیا جب ابّو نے گھر میں آتے ہی ایک خوبصورت پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کھولا تو میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ میں نے امّی ابّو کا شکریہ ادا کیا اور گھڑی پہن لی۔

میرے اچھے ابّو نے مجھے بہت ہی پیاری سی گھڑی لاکر دی تھی۔

۲ / جنوری ۱۹۸۷ء (منزہ یاسمین، بھون، چکوال)

"آج ہم ٹرین کے ذریعے کراچی پہنچے۔ ہمارا سفر بہت شاندار گزرا۔ میرے ساتھ چھوٹی بہن شازیہ اور چھوٹے بھائی ریحان بھی تھے۔ اسٹیشن پر ہمیں لینے کے لیے ماموں، ممانی اور ان کے بچّے موجود تھے، ہمارے ماموں کا گھر ناظم آباد میں ہے۔ ہمارے ماموں کے پاس کار ہے۔ ہم سب اُس میں سوار ہوئے، صدر کے پُر رونق علاقے سے گزرے ہر طرف دُکانیں ہی دُکانیں تھیں۔ پھر ہم ایم اے جناح روڈ پر آئے، تھوڑی دیر بعد ہی قائدِاعظم کا مزار آگیا۔ ہم نے کار کے اندر ہی سے فوراً سیلوٹ مارا سب ہماری اس حرکت پر ہنس پڑے۔ بہت ساری گاڑیاں ہمارے ساتھ آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ اتنے بڑے شہر کراچی کو دیکھ کر بہت مزا آیا۔ ماموں نے بتایا کہ وہ پرسوں ہمیں مختلف مقامات پر گھمانے لے جائیں گے۔ ماموں کے گھر پہنچ کر ہم سب نے غسل کیا۔ اور کھانا کھا کر سو گئے۔

۲ / مئی ۱۹۸۷ء (شاہین طفیل، نرسری، کراچی)

ابّو کے ساتھ شام ڈھلے بازار گیا۔ ابّو خریداری میں مصروف تھے۔ سامنے ایک کتابوں کی دکان تھی۔ الف لیلہ کتاب گھر۔ میں فوراً اندر چلا گیا، ڈھیر ساری کتابیں۔ خانوں میں رکھی تھیں، ایک کتاب پر نظر پڑی نام "اقوالِ مشاہیر" میں پلٹ کر دیکھا قیمت لکھی تھی دس روپے۔ فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دس روپے آج ہی ابّو نے دیے تھے۔ میں نے کتاب فوراً خرید لی اور ابّو کے ساتھ گھر آگیا۔ کتاب کھولی سب سے پہلے جس قول پر نظر پڑی وہ تھا "شیر کی ایک دن کی زندگی، گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے" ٹیپو سلطان شہید۔

۲۸ / اگست ۱۹۸۸ء (محمّد سلیم احمد، منصورہ، لاہور)

"آج میں نے اسکول جاتے ہوئے ایک نابینا شخص کو دیکھا۔ مجھے خیال آیا کہ اللہ نے ہمیں کتنی بڑی اور عظیم نعمت سے سرفراز کیا ہے، کیا ہم اس نعمت پر اپنے رب کے شکر گزار ہیں یا نہیں۔"

۲ / اکتوبر ۱۹۸۷ء (شاہد قریشی، بہاولپور)

شام کے سات بج چکے ہیں۔ مجھے اپنے دوست کا انتظار کرتے ہوئے پُورا ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔ اُس نے چھ بجے آنے کو کہا تھا۔ مجھے بہت غُصّہ آرہا ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ نماز کے علاوہ دُنیا کا ہر کام لیٹ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، تقریبات، پروگرامات، کوئی چیز اپنے وقت پر شروع نہیں ہوتی۔ اس موقع مجھے قائدِاعظمؒ

کی ذات یاد آرہی ہے سوچ رہا ہوں وقت کی پابندی کرنا ناممکن کام تو نہیں۔ بس ذرا ہمت کرنے کی ضرورت ہے۔

---

۲۰ اپریل ۱۹۸۶ء (احنار فیق، ڈالمیا، کراچی)

"پاکستان... ہمارا پیارا وطن... ہمارا دیس، ہمارا ملک ہی نہیں بلکہ اسلام کی سرزمین ہے... اسلام کا قلعہ ہے... اس کی حفاظت میں کوئی قربانی گراں نہیں... بے شک

آسیب زدہ مکان کے ایک کمرے میں فرائی پین، پینچی اور کاغذ کا ٹکڑا خود بخود فضا میں بلند ہو رہے ہیں۔ خاتونِ خانہ اپنے بچے کے ساتھ خوف کے عالم میں کھڑی ہیں۔ یہ تصویر آٹومیٹک کیمرے سے بنائی گئی ہے۔

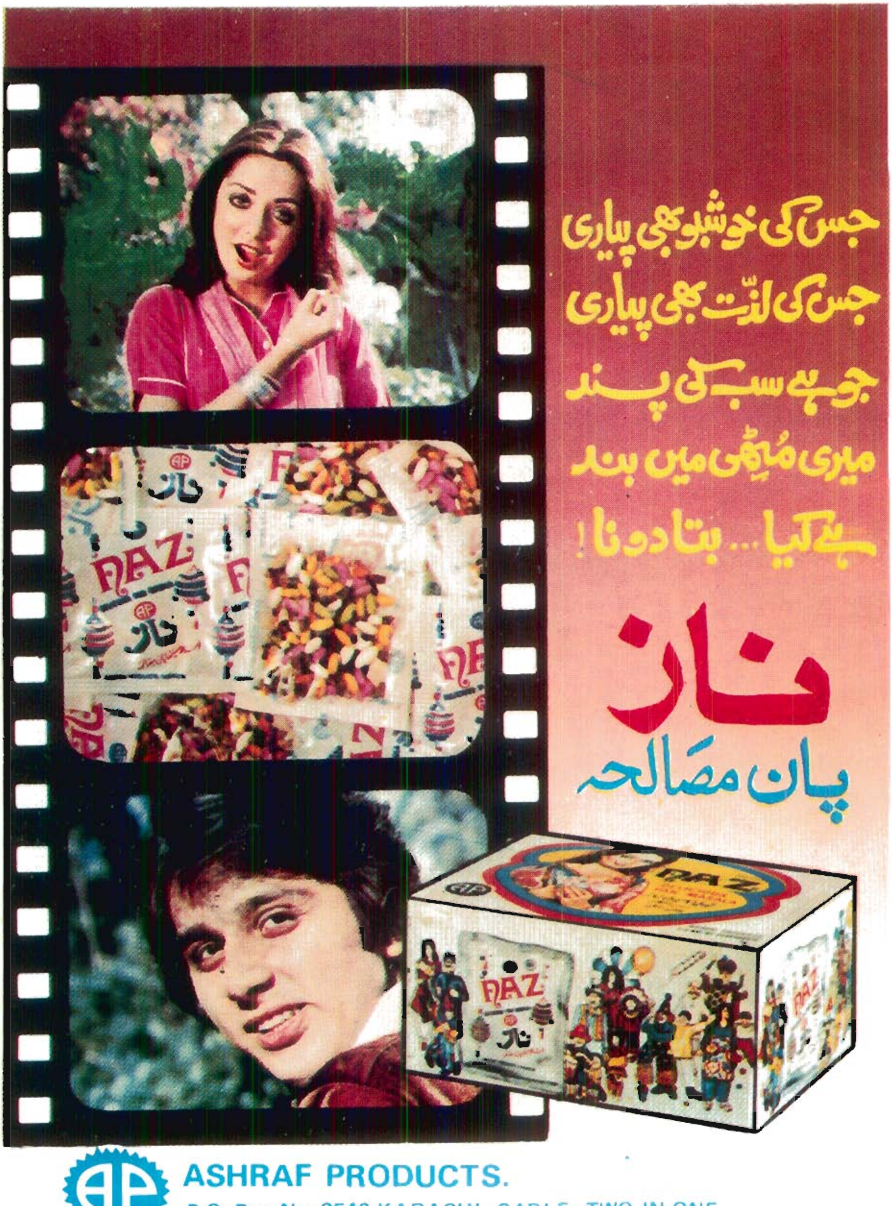
جس کی خوشبو بھی پیاری
جس کی لذّت بھی پیاری
جو ہے سب کی پسند
میری مُٹھی میں بند
ہے کیا... بتادو نا!
ناز
پان مصالحہ
ASHRAF PRODUCTS.
P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE

معیاری خوردنی اشیاء کی پہچان
اس کے اجزاء
TASTE AHMED
AHMED
PICKLE
Mixed in Oil
PRODUCE OF PAKISTAN
NET WT. 330g./11.50 oz.
AHMED FOOD INDUSTRIES (Pvt.) LTD
قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا

نیکِ جن

کلیم چغتائی

آسیب پکڑے گئے!

مگر کیسے؟

"حارث بیٹے"! امی کی آواز آئی۔

"جی امی": حارث نے کیرم کی گوٹیں جمائے ہوئے کہا۔

"بیٹے، یہ برآمدے کا بلب تم نے اُتارا ہے؟" امی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو! کیوں کیا بلب وہاں نہیں ہے؟"

"نہیں ہے جبھی پُوچھ رہی ہوں، تم سے خالد": امی نے خالد سے پُوچھا، جو حارث کے ساتھ کیرم کھیل رہا تھا۔

"ارے چھوڑیے امی، فیوز ہو گیا ہو گا تو کسی نے نِکال کر پھینک دیا ہو گا": حارث نے بے پروائی سے کہا۔

"جی نہیں، ابھی دو روز قبل میں نے منگوا کر لگوایا تھا": امی تیز لہجے میں بولیں۔ پھر انہوں نے ذکیہ باجی رضو آپا اور بھابھی سے بھی پُوچھ گچھ کر ڈالی لیکن ہر ایک کا یہی جواب تھا۔ "مجھے کیا معلوم؟"

امی نے گھر کی نوکرانی کو آواز دی جنہیں سب لوگ بُوا کہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ بُوا کو حارث کی دادی مرحومہ نے ملازم رکھا تھا۔ اس لیے بُوا کو گھر کے ایک فرد کی سی حیثیت حاصل تھی۔ سب ان کا ادب کرتے تھے۔

بُوا آئیں تو امی نے اُن سے پوچھا: "بُوا آپ کو پتا ہے کہ برآمدے کا بلب کہاں گیا؟"

"بی بی جی مجھے بلب سے کیا کام ؟" بُوا حیرانی سے بولیں "اللہ رکھے میرے کمرے میں دو دو بلب لگے ہیں" پھر بُوا کے چہرے پر فکرمندی پھیل گئی۔

"میں تو کہوں، بی بی جی یہ کسی انسان کا کام نہیں لگتا"

"پھر کس کا ہے ؟ حیوان کا ہے؟" حارث نے مذاق اُڑایا۔

"توبہ کرو حارث میاں" بُوا منہ پر ہاتھ رکھ کر بولیں "میرا مطلب یہ ہے کہ یہ کسی جن کا کام ہے"

"ہشت" حارث نے خالد کو اپنی باری چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "جن بھی اب اپنے گھروں میں سو واٹ کے بلب لگانے لگے ہیں کیا ؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ کوئی پڑھا لکھا جن ہوگا اور اُسے رات کو پڑھنے کے وقت ٹیبل لیمپ کی ضرورت پڑتی ہوگی" خالد نے شرارت سے کہا۔ اُسی وقت بے اختیار سب کی نظر میز پر رکھے ٹیبل لیمپ کی طرف اُٹھ گئی کہ جن کہیں ٹیبل لیمپ بھی تو نہیں لے گیا، لیکن ٹیبل لیمپ اپنی جگہ موجود تھا۔

شام کو ابّو اور حامد بھیا دفتر سے آئے، دونوں سے بلب غائب ہونے کا تذکرہ کیا گیا۔ دونوں نے کہا "کوئی بات نہیں، دوسرا بلب آجائے گا" بات آئی گئی ہوگئی۔ تین چار روز بعد، ذکیہ باجی کو کسی دعوت میں جانا تھا۔ تیار ہو کر اُنھوں نے سینڈلیں نکالیں تو صرف ایک سینڈل موجود تھی۔ اُنھوں نے تخت کے نیچے الماری کے پیچھے، دروازوں کی آڑ میں غرض کمرے کا کونا کونا چھان مارا۔ مگر سینڈل نہ ملی۔ پھر اُنھوں نے گھر بھر میں جہاں جہاں سینڈل ملنے کے امکانات تھے، وہاں وہاں تلاش کیا مگر سینڈل نہ ملنی تھی نہ ملی۔ گھر میں کوئی چھوٹے بچّے بھی نہ تھے جو سینڈل اُٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیں۔ ذکیہ باجی کو دیر ہو رہی تھی۔ تھک ہار کر وہ بھابی کی چپلیں پہن کر دعوت میں چلی گئیں، ویسے ان کا منہ بنا ہوا تھا۔

دوسرے دن پڑوس کے مکان کی چھت سے بی پڑوسن نے دیکھا کہ ایک سینڈل حارث کے مکان کے برآمدے کی چھت پر پڑی ہے۔ اُنھوں نے آکر ذکیہ باجی کی امّی کو یہ بات بتائی۔ ذرا سی دیر میں ہر ایک کی زبان پر ایک ہی سوال تھا "سینڈل برآمدے کی چھت پر گئی کیسے ؟"

"بی بی جی! میں تو جانوں یہ کوئی چڑیل ہے" بُوا بڑے یقین سے بولیں۔

"یعنی ... ! ایک ذکیہ باجی کیا کم تھیں کہ ایک اور آگئی" حارث نے ہنس کر کہا۔

"حارث" امّی نے ڈانٹا "ادب سیکھو، وہ تم سے بڑی ہے"

"امّی یہ بات آپ نے ایک ہفتہ پہلے بھی کہی تھی اور میں نے اُسی وقت فوراً اُردو ادب کا مطالعہ

شروع کر دیا تھا" حارث بڑا سنجیدہ بَن کر بولا۔ اور باوجود ضبط کرنے کے امّی مُسکرا پڑیں۔

"حارث میاں، ہنسی مذاق چھوڑو۔ میں تو کہوں کسی پیر صاحب کو بلاؤ۔ وہی کچھ عمل کریں گے تو یہ چڑیل جاوے گی" بُوا پریشان ہو کر بولیں۔

چند روز بعد حامد بھیّا چیختے ہوئے آئے "یہ میرا نیا قلم کس نے نالی میں پھینک دیا تھا؟"

"کس نے پھینکا ہوگا۔ تم ہی سے گر گیا ہوگا" امّی نے رضو آپا کی قمیص پر بٹن ٹانکتے ہوئے کہا۔

"گویا میں نالیوں میں جھانکتا پھرتا ہوں تاکہ میری قمیص کی جیب سے قلم نالی میں گر جائے" حامد بھیّا لال پیلے ہو کر بولے۔ ذرا سی دیر میں گھر کے سارے افراد جنّ کی اس تازہ ترین واردات پر اظہارِ خیال کر رہے تھے۔

"حامد بھیّا، میں نہ کہتا تھا، کوئی پڑھا لکھا جنّ ہے" خالد نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"خالد میاں، جنّات سے مذاق نہیں کرتے" بُوا بولیں "میں تو کہتی ہوں بی بی جی کسی عامل کو بلوائیں"

"اوہو... اب عامل بلوائے جائیں گے" حامد بھیّا بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

"اگلے روز ایک عجیب واقعہ ہُوا۔ حامد بھیّا اور بھابی کسی عزیز سے ملنے گئے تو اپنے کمرے کے دروازے پر تالا ڈال گئے۔ واپس آئے اور کمرے کا دروازہ کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا قیمتی گُل دان فرش پر چکنا چُور پڑا ہے۔ بستر کے تکیے بھی فرش پر پڑے ہیں۔ ایک ٹوٹی ہوئی چپل جو خُدا جانے کس کی تھی۔ بستر پر بڑے سلیقہ سے رکھی ہے۔ بھابی جو چند کتابیں شوکیس پر رکھ کر گئی تھیں، اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہیں۔ بھابی تو ڈر کے مارے کانپنے لگیں۔ ذرا سی دیر میں گھر بھر کے لوگ بھابی کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ پڑوس والوں کو بھی کسی طرح خبر مل گئی اور پڑوس والی خالہ بھی برقعہ ڈال دوڑی آئیں۔ اب جتنے منہ اُتنی باتیں۔ کوئی کہہ رہا ہے "سوا لاکھ بار آیتِ کریمہ کا ختم کراؤ" کوئی کہہ رہا ہے "ایک ہزار ایک روپیہ صدقہ دے دو" کسی کی آواز آئی "ہزار روپے نہیں بلکہ سیاہ بکرا قربانی کر کے اس کا خُون اس کمرے میں ڈال دو" بُوا بولیں "میری مانیں بی بی جی یہ مکان ہی چھوڑ دیں۔ یہاں رہنا اب ٹھیک نہیں" اُسی وقت لائٹ چلی گئی اور پورا گھر رضو آپا کی چیخوں سے گونج اُٹھا۔ سب لوگ گھبرا گئے۔ رضو آپا برآمدے میں کھڑی چیخے جا رہی تھیں "امّی امّی یہاں جنّ ہے۔ اُس نے میرا ہاتھ چھیل دیا ہے"

سب کو ایسا لگ رہا تھا جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اس وقت کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ رضو آپا نے زور کی چیخ ماری اور اچانک جیسے سب ہوش میں آئے۔ ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ حامد بھیّا ڈانٹ کر بولے۔

"ارے، کیا ہوگیا ہے تم سب کو۔" اور دروازہ کھولنے کے لیے چلے گئے۔ امّی کہتی رہ گئیں: "حامد، حامد، اکیلے مت جاؤ۔ حارث تم بھی جاؤ ساتھ"۔ بیرونی دروازہ کھُلنے کی آواز آئی اور ابّو یہ کہتے ہوئے اندر آگئے: "بھئی لائٹ گئی ہوئی ہے تو موم بتّی ہی جلا لی ہوتی۔"

"ابّو جنّ کا اصرار ہے کہ اندھیرا ہی ٹھیک ہے۔" حارث نے سنجیدگی سے اطلاع دی۔

"جن کا اصرار ہے؟ کن کا اصرار ہے...؟" ابّو نے حیرانی سے پوچھا۔

"جنّ! ابّو، جنّات والا جنّ۔ بُوا کہتی ہیں کہ ایک جن ہمارا مہمان ہے۔" خالد کی آواز آئی۔

"پتا نہیں میاں، جن ہے، آسیب ہے، چڑیل ہے، کہ بدرُوح ہے، کچھ ہے ضرور۔ اب اس مکان میں رہنا ٹھیک نہیں۔" بُوا جلدی سے بولیں: "آج رضو بیٹا پر اُس نے حملہ کیا ہے، کل کلاں کو کچھ اور ہوگیا تو؟"

اُسی وقت لائٹ آگئی۔ سب لوگ رضو آپا کے گرد جمع ہوگئے، جن کا رنگ خوف کے مارے پیلا پڑ گیا تھا۔ اُن کی کلائی پر لمبا سا کھرونچا پڑ گیا تھا۔ جس پر خون کے قطرے جم گئے تھے۔

"ارے! یہ کسی بلّی کا کارنامہ تو نہیں؟" حارث نے پوچھا۔

"تمہیں نہیں معلوم میاں جنّات جانوروں کی شکل میں بھی تو آجاتے ہیں۔" بُوا بولیں۔ سب لوگ پریشان نظر آرہے تھے۔

اگلے دن ذکیہ باجی کی شال صحن میں پھٹی ہوئی ملی۔ اس کے اگلے دن حارث کی قمیض کی آستین الگ پڑی ہوئی نظر آئی۔ جن صاحب کی شرارتوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اب تو گھر کے اندر اور باہر لگے تمام بلب رات بھر جلتے تھے۔ پھر بھی رضو آپا، ذکیہ باجی اور بھابی کا حال یہ تھا کہ رات کے وقت اگر پڑوس میں میز بھی گھسیٹی جاتی تو وہ اُچھل پڑتی تھیں۔

چند دن بعد حارث نے خالد سے کہا: "یار یہ جنّ بھُوت کچھ نہیں ہے۔"

"آپ اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں"؟ خالد نے پوچھا۔

"بتاتا ہوں۔" پھر حارث کی آواز دھیمی ہوگئی، خالد اس کی باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ شام میں حارث کا ایک گہرا دوست شریف آگیا۔ وہ حیدرآباد میں رہتا تھا۔ حارث، خالد اور شریف دیر تک بیڈمنٹن کھیلتے رہے۔ شریف کو اگلے دن کسی دفتر میں کوئی کام تھا۔ اس لیے وہ حارث کے ہاں رات ٹھہر گیا۔ ابّو گھر آئے تو سب نے رات کا کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر گپ لڑا کر سب لوگ اپنے اپنے بستر میں گھُس گئے۔ تھوڑی دیر میں مختلف قِسم کے خرّاٹوں کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ حارث، خالد اور شریف ابھی جاگ

رہے تھے، لیکن اُن کے کمرے میں مدھم روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ شریف نے پوچھا: "یار یہ جن کا کیا قصّہ ہے؟"

"ہم خود جن سے ملنا چاہ رہے ہیں، آج شام وہ آئے۔" حارث نے ہنس کر کہا۔

"آجائے تو اچھا ہے۔" خالد بولا۔

"مگر کچھ دیر صبر کے ساتھ چپ چاپ انتظار کرنا چاہیے۔" حارث بولا۔

خاموشی چھا گئی۔ شاید ان تینوں کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا ہلکی سی آہٹ سُن کر حارث نے شریف اور خالد کو جگا دیا۔ شاید وہ ابھی تک جاگتا ہی رہا تھا۔ تینوں بڑی آہستگی سے اُٹھے اور اُنھوں نے کمرے کی بتّی بجھا کر دروازہ آہستہ سے کھول دیا۔ باہر صحن میں ہلکی سی روشنی تھی اور اس روشنی میں ایک سایہ حرکت کر رہا تھا۔ اس سائے نے باورچی خانے کا رُخ کیا۔ پھر وہ باورچی خانے سے لوٹا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ چیزیں تھیں۔ بیلن، ڈبّے، توا وغیرہ۔ اس نے سب چیزیں صحن میں آہستہ سے اِدھر اُدھر رکھ دیں۔ پھر وہ برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ اُسی وقت چمک دار سفید روشنی کا ایک جھماکا سا ہُوا اور برآمدے کے بلب کی دھیمی سی روشنی میں ایک خوفناک کالا پُتلا حرکت کرنے لگا۔ اس سائے کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ٹرے تھی، وہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ اب سائے کے چہرے پر برآمدے کے بلب کی روشنی پڑنے لگی تھی۔ وہ بُوا تھیں جن کی آنکھیں خوف کے مارے جیسے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ وہ ہکّا بکّا ہو کر سیاہ خوفناک پُتلے کی طرف دیکھ رہی تھیں جس میں سے مسلسل ٹوں ٹوں ٹٹ، ٹوں ٹوں ٹٹ کی آواز آ رہی تھی۔ روشنی کا ایک اور جھماکا ہُوا اور ایک عجیب باریک سی آواز آئی۔

"بُوا! تم ہم سے پوچھے بغیر یہ کیا کر رہی ہو؟"

بُوا تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ شاید وہ چیخنا چاہتی تھیں لیکن اُن کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ روشنی کا ایک اور جھماکا ہُوا اور وہی باریک سی آواز آئی۔

"بُوا، تمھیں معلوم نہیں کہ ہم ایک نیک دل جن ہیں، تم نے ہمیں بدنام کر دیا۔" بُوا کا یہ حال تھا کہ اب گریں کہ تب گریں۔ روشنی کا پھر ایک جھماکا ہوا اور باریک آواز نے کہا "اب تک تو ہم نے کسی کو تنگ نہیں کیا۔ اب ہم تمھیں اس غلطی کی سزا ضرور دیں گے۔"

بُوا نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور بڑی مشکل سے ان کے منھ سے آواز نکلی۔

"میں آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔ مجھے عرفان صاحب نے بہکا دیا تھا۔"

"عرفان یا شیطان ؟"

"جی جی! بالکل، شیطان نے مجھے اور عرفان صاحب کو بہکا دیا تھا۔ حضرتِ جن! اب میں اس کی باتوں میں نہیں آؤں گی۔" بُوا گڑگڑا کر بولیں "مجھے عرفان صاحب نے لالچ دیا تھا کہ اگر میں جن کا خوف پیدا کر کے یہ مکان خالی کرا دوں تو وہ مجھے دس ہزار روپے دیں گے۔ مجھے معاف کر دیجیے۔"

"ایک شرط پر تمہیں معاف کیا جا سکتا ہے۔" باریک آواز آئی "تم کل حارث کی امی کے پاس جا کر معافی مانگو۔ انہیں ساری بات بتاؤ اور کہنا کہ جنوں، بھوتوں، چڑیلوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ وہی سب کی حفاظت کرتا ہے، جنوں کی بھی، انسانوں کی بھی۔۔۔ سمجھیں۔۔۔؟"

"جی جی بالکل سمجھ گئی۔"

روشنی کا پھر ایک جھماکا ہوا "شاباش، اب تم جا کر سو جاؤ لیکن یاد رکھنا اگر کل تم نے حارث کی امی سے معافی نہیں مانگی تو یاد رکھنا بہت نقصان اُٹھاؤ گی۔"

"جی جی بہت بہتر حضرتِ جن۔" بُوا گھبرا کر بولیں۔

روشنی کا ایک اور جھماکا ہوا اور سیاہ خوفناک پُتلا حرکت کرتا ہُوا تاریکی میں چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹوں ٹوں ٹٹ کی آواز بھی بند ہو گئی۔

دوسرے دن صبح حارث، خالد اور شریف بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے کہ امی آ کر قریب کے صوفہ پر بیٹھ گئیں اور بڑے جوش سے بولیں۔

"حارث میاں، تم کہتے تھے کہ جن وِن کچھ نہیں ہے۔ حالانکہ جن ہے اور بڑا شریف جن ہے۔"

حارث، خالد اور شریف نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مُسکرا پڑے۔

"اچھا امی" حارث نے حیرت ظاہر کی۔

"ہاں بھئی۔۔۔ بُوا نے مجھے ابھی ابھی بتایا۔۔۔ کل رات جن نے اُنہیں پکڑ لیا تھا۔ کالا کالا سا تھا۔ عجیب باریک سی آواز تھی اُس کی۔ اُس میں سے روشنی کی لہریں نکل رہی تھیں۔ اور ٹوں ٹوں کی آواز آ رہی تھی۔"

"پھر کیا ہُوا۔ بُوا خیریت سے تو ہیں" خالد نے پوچھا۔

"بڑا تیز بخار ہے اُنہیں" امی بولیں "جب وہ صبح باورچی خانے میں نہیں آئیں تو میں اُن کی خیریت پوچھنے کے لیے اُن کے کمرے میں گئی تب انھوں نے مجھے رات کا واقعہ سُنایا اور مزے کی بات سنو اب تک جتنی چیزیں غائب ہوئیں اور جو بھی گڑبڑ ہوئی تھی وہ جن نے نہیں بلکہ بُوا کی تھی۔"

"کیا مطلب؟ کیا بُوا بھی جنوں کی نسل میں سے ہیں؟" حارث نے تعجب سے پوچھا۔
"اوہو۔ بُوا کہاں سے جن ہونے لگیں"۔ امی نے جھلا کر کہا "دراصل ایک شخص یہ مکان ہم سے خالی کروانا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ یہ مکان خود خرید لے۔ جن کی دہشت پھیلے گی تو کوئی اس مکان کو خریدنے بھی نہ آئے گا اور دام بھی زیادہ نہیں لگیں گے۔ اس شخص نے بُوا کو پانچ ہزار روپے دیے تھے کہ وہ مکان میں گڑبڑ کریں اور جن جن کا شور مچائیں مجھے بُوا سے ایسی امید نہ تھی"۔
"مگر امی، وہ بھائی کے کمرے میں جو چیزیں اُلٹ پلٹ ہو گئی تھیں۔ کمرے کے دروازے پر تو تالا لگا ہوا تھا..." خالد نے یاد دلایا۔
"وہ بھی بُوا کا کارنامہ تھا"۔ امی اطمینان سے بولیں۔ "حامد کے کمرے کی پچھلی کھڑکی کھلی رہتی ہے۔ وہیں سے لمبا سا بانس ڈال کر بوا نے ساری چیزیں زمین پر گرادی تھیں۔ مگر دیکھو تو بُوا کو کیا خبر تھی کہ اس مکان میں واقعی ایک جن موجود ہے۔ وہ تو شکر کرو کہ میاں کہ جن شریف ہے اگر خراب جن ہوتا تو...؟"
"آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں، جن واقعی شریف ہے۔ جیسا نام ویسا کام"۔ حارث نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔
"کیا مطلب؟" امی کچھ نہیں سمجھیں۔
"یہ رہا آپ کا جن"۔ حارث نے شریف کی طرف اشارہ کیا جو بڑے اطمینان سے سر جھکائے ناشتے میں اسی طرح مصروف تھا جیسے اُس کے سوا کمرے میں کوئی موجود نہیں ہے۔
"تم مسخرہ پن بند نہیں کرو گے حارث"۔ امی نے ڈانٹا۔
"مسخرہ پن نہیں امی۔ یہی جن ہے۔ کیوں بھئی جن بادشاہ؟" خالد نے ہنس کر شریف کی طرف دیکھا اور شریف نے سر ہلا دیا۔
"بھئی تم لوگ تو پہیلیاں بجھوانے لگے"۔ امی نے اُٹھ کر کہا۔
"امی... بات صرف یہ ہے کہ شریف کٹھ پتلیوں کا تماشا دکھانے کا ماہر ہے۔ یہ اپنے کالج میں کٹھ پتلیوں کے کئی تماشے دکھا چکا ہے۔ بُوا نے جو جن دیکھا وہ شریف کی ایک کٹھ پتلی تھی، جس کو ذرا خوفناک بنادیا گیا تھا"۔
"مگر بُوا تو کہہ رہی تھیں کہ اس میں سے روشنی کی لہریں نکل رہی تھیں"۔ امی بولیں۔
"حامد صاحب کے کیمرے کی فلیش گن آخر کس دن کام آتی؟" حارث نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

" اور وہ ٹوں ٹوں کا شور ؟"

" امی آپ تو جانتی ہیں کہ رات دو بجے ریڈیو لگایا جائے تو کم ہی اسٹیشن لگتے ہیں، زیادہ تر ٹوں ٹوں ٹریں ٹریں کا شور سنائی دیتا ہے۔ شریف نے ایک پاکٹ سائز ریڈیو کٹھ پتلی میں فٹ کر دیا تھا۔ رہی جن کی باریک سی آواز تو یہ خاکسار کا کمال ہے " حارث نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا " آپ کو تو معلوم ہے میں ریڈیو کے کئی ڈراموں میں حصہ لے چکا ہوں "

" بڑے شریر ہو تم تینوں " امی ہنسنے لگیں " اگر بوا کا ہارٹ فیل ہو جاتا تو ... " پھر وہ کچھ سوچ کر بولیں۔ " لیکن تمہیں بوا ہی پر شک کیسے ہوا .... ؟"

" امی، بوا نے جب جن سے ہمیں ڈرانے کی کوشش کی تھی تو اسی وقت مجھے کچھ شبہ سا ہوا تھا، پھر کل اتفاق سے میں نے بوا کو غازی پارک کی طرف جاتے دیکھا، میں بھی پارک ہی جا رہا تھا۔ پارک پہنچ کر میں نے دیکھا کہ بوا ایک صاحب سے بڑی رازداری سے باتیں کر رہی ہیں۔ اور گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتی جا رہی ہیں۔ میں نے سوچا کہ کہیں یہ آدمی بوا کو پریشان تو نہیں کر رہا ... باڑھ کے پیچھے چھُپ کر جو دونوں کی گفتگو سنی تو پتا چلا کہ معاملہ ہی اُلٹا ہے۔ وہ آدمی بوا سے کہہ رہا تھا " میں نے تمہیں پانچ ہزار روپے دے دیے ہیں مگر تم نے ابھی تک کچھ نہیں کر کے دکھایا۔ آج رات زیادہ گڑ بڑ کرو۔ گھر والوں کو جن بھوت سے اتنا ڈراؤ کہ وہ مکان چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ باقی رقم کام ہونے کے بعد مل جائے گی "

بس امی، میں نے یہ سُنا تو بھاگا اور فون کر کے " شریف جن " کو بلا لیا۔ کیونکہ معاملہ اب انسانوں کے قابو سے باہر ہو چکا تھا ... "

خالد اور امی زور سے ہنس پڑے " شریف جن " بھی مسکرا رہا تھا۔

سفر مبارک

معلومات بھی ـــــ رہنمائی بھی

حجاج اور زائرین کے لیے نادر تحفہ!

۲۰۳ صفحات

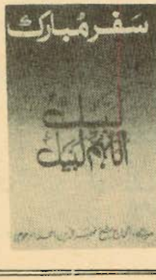

یہ کتاب آپ صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے حاصل کر سکتے ہیں

نتائج تحریری مباحثہ

طالبات طلبہ سے بہتر ہیں

طالبات زیادہ ذہین ہیں یا طلبا۔۔۔ یہ تھا موضوعِ بحث۔ ہمیں خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس پرانی گھسان کی بحث چھڑ جائے گی۔ اور دونوں فریق بڑھ چڑھ کر دلائل دیں گے اور اتنی تعداد میں مضامین موصول ہوں گے کہ ان کا پڑھنا ہمارے لیے دشوار ہو جائے گا۔ اس قلمی بحث کا مقصد صرف اتنا تھا کہ طلبا اور طالبات دونوں کو ایک دوسرے کے محاسبے کا موقع مل سکے۔ دونوں ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہو سکیں۔ نیز یہ کہ خوبیوں کو مزید اجاگر کریں اور خامیوں کی اصلاح کر سکیں۔

جہاں تک موضوعِ بحث کا تعلق ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ایک صنف کی حیثیت سے کسی کو کسی پر برتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ زندگی کے بے شمار معاملات ایسے ہیں، جن میں طلبا کسی طرح طالبات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح بہت سے کام ایسے بھی ہیں جنہیں طالبات کے مقابلے میں طلبا ہی بہتر طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ طلبا اور طالبات دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں۔ ان کے فرائض کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اصل بات تو احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرض کی ادائیگی ہے۔ جس میں کبھی طلبا آگے نکل جاتے ہیں اور کبھی طالبات۔ دونوں ایک ہی گاڑی کے پہیے ہیں۔ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ دونوں مل کر ہی قوم و ملک کی ترقی و تعمیر کر سکتے ہیں۔ لہٰذا بحث و مباحثہ بند۔۔۔ اور اپنے اپنے حصے کا کام شروع۔۔۔ جی ہاں آج ہی سے۔۔۔!

موافقت اوّل انعام۔ فاطمہ صبا قمرالدّین، میرپورخاص

ہمارے ہاں اب تک ایسے لوگ کثرت سے موجود ہیں جو لڑکیوں کی تعلیم کو بُرا سمجھتے ہیں اور لڑکے لڑکیوں کا مقابلہ یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ لڑکے اور لڑکیوں کا کیا مقابلہ! یعنی وہ اُن کو معاشرے میں مساوی حیثیت دینے کے بجائے اُنھیں کمتر خیال کرتے ہیں۔ اور یہ وہ حالات ہیں جن میں یہ مقابلہ اور بحث جاری ہے کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ طالبات اور طلبہ کی تعلیمی میدان میں سرگرمیوں پر بحث اس لحاظ سے یکطرفہ بحث کی صورت اختیار کرجاتی ہے لیکن اس کے باوجود ہر سال تعلیمی اداروں کے نتائج اس بات کے گواہ ہیں کہ طالبات، اپنی ان تمام معاشرتی مجبوریوں کے باوجود اپنی ذہنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کی اہل ہیں۔ مخالفین یہ کہہ کر اُن کی ذہانت کو رد کر دیتے ہیں کہ وہ صنفِ نازک ہیں وہ کیا کرسکتی ہیں لیکن طالبات نے طلبہ کی اس توجیہہ کو ہمیشہ رد کیا ہے کیونکہ صنفِ نازک اور صنفِ کرخت ہونا یہ کوئی ایسی صفت نہیں جس کا دار و مدار کسی کی ذاتی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں پر ہو یہ تو اللہ تعالیٰ کا نظام ہے لیکن باوجود اس کے کہ اُن کو صنفِ نازک کہہ کر رد کیا گیا۔ طالبات نے اس تاثر کو غلط ثابت کیا ہے کہ وہ کچھ کر سکنے کے قابل نہیں ہیں۔ طلبہ کو ناز ہے کہ وہ پہاڑوں کو تسخیر کرنے، چاند پر جانے اور سائنسی ایجادات کرنے کی برتری رکھتے ہیں اور یہ طالبات کی کُند ذہنی ہے کہ وہ اس معاملے میں ہماری برابری نہیں کرسکتیں لیکن وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ اُن کی یہ برتری عارضی ثابت ہوئی۔ رُوس کی خاتون نے دُنیا کی بلند ترین چوٹی سَر کی اور یہ ثابت کر دیا کہ صنفِ نازک، صنفِ نازک ہونے کے باوجود بہت کچھ کرسکتی ہے۔ سائنس کے میدان میں ہونے والی ترقی میں خواتین نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم کسی سے کم نہیں ہیں۔ روس کی خاتون، ویلنٹینا تراشکوف، نے خلا بازی میں اپنا مقام منوالیا۔ سائنسی میدان میں مادام کیوری خواتین کی نمائندہ تسلیم کی جاسکتی ہیں۔ اور نوبل انعام یافتہ ڈورتھی کرافورڈ اور پروفیسر ریٹا وغیرہ اس بات کی گواہ ہیں کہ سائنسی میدان میں خواتین یعنی طالبات ہرگز کسی سے پیچھے نہیں بلکہ ذہانت میں طلبہ پر برتری ہی رکھتی ہیں اور اکثر و بیشتر شعبوں میں اُنھوں نے طلبہ سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اور اس اعلیٰ کارکردگی کی بہت سی وجوہات ہیں، لیکن سب سے بڑی وجہ اُن کی وہ وفاکیشی، کی فطرت ہے جو اُنھیں قدرت کی طرف سے مرحمت کی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ جس شعبے اور جس میدان میں جاتی ہیں پوری لگن، تندہی اور وفاداری کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

طلبہ کی اکثریت اپنا زیادہ تر وقت مختلف قسم کے ہنگاموں، سیر و تفریح اور دیگر فضول کاموں میں ضائع کر دیتی ہے۔ جبکہ اوّل تو طالبات کو گھریلو ذمّہ داریوں کے بعد پڑھنے کا موقع ملتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنے اس وقت کو ضائع نہیں کرتیں اور اس کا صحیح استعمال کرتی ہیں۔

نقل کا رجحان بھی زیادہ تر طلبہ میں پایا جاتا ہے اور جس کا ثبوت یہ ہے کہ آئے دن امتحان ہال میں طلبہ چاقو دکھانے، اساتذہ کو زخمی کرنے، پرچوں کا بائیکاٹ کرنے، پرچے پھاڑ دینے اور اسی طرح کی مختلف وارداتیں کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ طالبات اس قسم کی وارداتیں اور شوشے چھوڑنے سے پرہیز کرتی ہیں۔ اور محنت کرتی ہیں۔

اس کے لیے طلبہ یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ طالبات میں اتنی ہمت اور طاقت ہی نہیں کہ وہ یہ سب کام کرسکیں لیکن مخالفین کی یہ بات طالبات رد کرتی ہیں کیوں کہ اُن کی نظر میں یہ کوئی بہادری، ہمت اور شجاعت کا کام نہیں ہے بلکہ سَراسر بدتمیزی ہے اور بدتمیزی کو طاقت کہنا سراسر ناانصافی ہے وہ طاقت ہی کیا جو اندھے بھینسے کی طرح استعمال کی جائے اور طالبات ان لغو باتوں کے مرتکب ہونے سے پرہیز کرتی ہیں اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ طالبات زیادہ تر گھر میں رہنے اور خاندان کے سرپرستوں اور بزرگوں کا احترام اور تابعداری کرنے کی باعث اُن کی طبیعت اُس کو گوارا نہیں کرتی کہ وہ بدتمیزی کی مرتکب ہوں۔

طالبات کی ذہنی برتری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ معاشرہ ہر لحاظ سے طلبہ کو برتر مقام اور بہتر مراعات دیتا ہے لیکن اس کے باوجود طلبہ اپنی ذہنی برتری منوانے میں ناکام رہے ہیں۔ طلبہ جسمانی طور سے خواتین سے طاقتور ہیں، معاشرتی روایات کے مطابق اُن پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اُن کے کھانے پینے، صحت اور تعلیم غرض ہر چیز کا طالبات سے بہتر خیال رکھا جاتا ہے اور ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ طلبہ کے لیے اگر دس دس ٹیوشنوں کا انتظام بھی کرنا پڑے تو اس بات سے گریز نہیں کیا جاتا ہے۔ اور اس کے باوجود طلبہ اپنی جسمانی طاقت کا استعمال کرکے نقل کرتے ہیں اور ان تمام کوششوں کے باوجود تعلیمی میدان میں حسب باری رزلٹ کی آتی ہے تو طالبات پوزیشن لے جاتی ہیں۔ اور طلبہ منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

طلبہ یہ کہتے ہیں کہ طالبات جسمانی شعبوں میں ہماری برابری نہیں کرسکتیں جبکہ یہ بات کہتے ہوئے طلبہ کو اپنی زیادتی کا احساس ہونا چاہیئے کہ وہ طالبات کو نہیں بلکہ خدا کو چیلنج کر رہے ہیں اور ایک ایسی صفت پر ناز کر رہے ہیں جس میں اُن کی اپنی ذرّہ برابر محنت شامل نہیں ہے لیکن اس کے باوجود "نیشنل وومن گارڈ" کھیلوں کے میدان غرض ہر جسمانی شعبے میں بھی طالبات نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کسی سے پیچھے نہیں۔ جہاز اُڑانے والی پہلی پاکستانی خاتون شُکریہ خانم نے یہ ثابت کیا کہ جسمانی طاقت کو ہمتوں اور جذبوں سے شکست دی جاسکتی ہے۔

نرسنگ کے شعبے میں طالبات نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ ہمت، یہ ذہانت، یہ جذبہ، خدمت وایثار اور لگن اُنہی کے حصے میں آئی ہے اور طالب علم اس میں اُن کی برابری نہیں کرسکتے"

صادق ہوں اپنے قول پہ غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مخالفت   دوم انعام:-   کاشف شہزاد، کراچی

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے   ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

طالبات طلبہ سے زیادہ ذہین ہیں یا طلبہ طالبات سے' یہ شاید ایک طویل اور ناختم ہونے والی بحث ہے۔ مگر یہ بات طے ہے کہ طلبہ طالبات سے زیادہ ذہین ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے مذکورہ بالا شعر سے بھی ہمیں جو اشارہ ملتا ہے، وہ یہی ہے کہ نوجوانوں (طلبہ) میں ہی اتنا حوصلہ اور عزم ہوتا ہے کہ وہ قدرت کے ہر چیلنج کا دلیری سے مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور بڑے بڑے معرکے سر کرتے ہیں۔

سائنس ہی کے میدان کو لیا جائے تو یہاں بھی طلبہ ہی سرگرم نظر آتے ہیں۔ جو انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرکے کسی بھی مُلک کو ترقی کی راہوں پر گامزن کرتے ہیں۔ یہ طلبہ ہی ہوتے ہیں جو ماہر سائنسدانوں اور انجینئرز کا روپ دھار کر ساری دُنیا میں اپنی ذہانت کا لوہا منولتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اکثر سائنسی میلے منعقد ہوتے ہیں جہاں طلبہ و طالبات مختلف سائنسی نمونہ جات کی نمائش کرتے ہیں، ان مقابلوں میں بھی اکثر طلبہ طالبات پر بازی لے جاتے ہیں اور اپنی ذہانت دوسروں پر عیاں کرتے ہیں۔

فن و ادب کے میدان میں بھی طلبہ کسی سے پیچھے نہیں۔ اکثر رسائل و اخبارات میں طلبہ کی تحریریں رسائل اور اخبارات کی زینت بنتی ہیں، کوئی بھی رسالہ اُٹھاکر دیکھ لیا جائے، اس میں قلمکاروں کی اکثریت طلبا پر مشتمل ہوتی ہے۔ طلبہ کی تحریریں ان کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہوتی ہیں۔ اور اُن کی ذہانت کی عکاسی کرتی ہیں۔ بعض رسائل تو ایسے ہیں جو محض طلبہ کی ہمّت اور ذہانت کی بدولت جاری ساری ہیں۔

کھیلوں کے میدان میں بھی طلبہ ہمیشہ طالبات پر حاوی رہے ہیں۔ ایک کہاوت ہے

"صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہوتا ہے۔"

اس کہاوت کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہی طالب علم ذہین ہوتے ہیں جو کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ طالب علم جو کھیلوں میں حصّہ نہیں لیتے، وہ ذہنی طور پر بھی ناکارہ ہوتے ہیں۔ طلبہ چونکہ طالبات کے مقابلے میں کھیلوں میں زیادہ حصّہ لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ طالبات کے مقابلے میں زیادہ ذہین ہوتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ طالبات کے مقابلے میں ان کا ذہن زیادہ تیزی سے کام کرتا ہے۔

تعلیمی میدان میں بھی طلبہ طالبات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اُنہیں نکمّا اور کُند ذہن خیال کیا جاتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ معاشرہ ابھی تک اُنہیں وہ ماحول نہیں فراہم

کر سکا، جو وقت کی ضرورت ہے۔ آج کل کے طلبہ کئی ایک مسائل کا شکار ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ تعلیمی ادارے طلبہ کی کثیر تعداد کو داخلے دینے کے لیے نظر نہیں آتے اور طلبہ اپنا قیمتی وقت کالجوں اور اسکولوں کے چکر لگانے میں ضائع کر دیتے ہیں اور بالفرض اگر داخلہ مل بھی جائے تو رہی سہی کمی کو پورا کرنے میں اساتذہ کرام اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سال گزرنے کے باوجود کورس پورا نہیں ہوتا۔ اکثر انہیں نوٹس پر ٹرخا دیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ طلبہ کو مجبوراً ٹیوشن اور دوسرے ذرائع تلاش کرتے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلبہ کے امتحانی نتائج نسبتاً خراب رہتے ہیں۔ اور پھر ستم ظریفی یہ کہ اس کا قصوروار بھی طلبہ کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

دراصل، ذہانت صرف امتحان میں شاندار کامیابی لانے کو خیال کیا جاتا ہے حالانکہ یہ کام رٹا فیکیشن سے باآسانی ہو جاتا ہے، بالخصوص طالبات جنہیں بہت ذہین خیال کیا جاتا ہے۔ رٹے پر انحصار کر کے کامیابی حاصل کرتی ہیں۔ طلبہ پر ایک اور الزام جو عائد کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ امتحان میں نقل کرتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ محض ایک الزام ہی ہے اور اگر ایسا ہے بھی تو ایک مثل بہت مشہور ہے کہ

"نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔"

یعنی یہ کام بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنا ذہن استعمال کر سکتے ہوں۔

الغرض ان تمام دلائل کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ طلبہ طالبات سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔

تو شاہیں، ہے پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

طالبات کی ذہانت کا ایک ثبوت

جنابِ والا طالبات کی ذہانت کا اس واقعے سے اندازہ لگائیے کہ میری ایک کزن جو کہ طالبہ ہیں۔ مجھ سے ایک دن کہنے لگیں بتائیے وہ کون سی چیز ہے جس کے چھ پاؤں دو ہاتھ دو پیر، چھ آنکھیں اور دو پنجے ہیں۔ میں نے کہا یہ ناممکن ہے۔ ایسی کوئی چیز نہیں، لیکن وہ ضد کرنے لگیں کہ ایسی چیز کا وجود ہے۔ میں نے سوچ بچار کے بعد آخر ہار مان لی۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور کہا کہ بس یہ ہے آپ کی ذہانت۔ میں نے عاجز آکر کہا کہ اب بتاؤ بھی کہ وہ کیا چیز ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ جناب وہ ایک گھوڑ سوار ہے جس نے ہاتھ میں کبوتر پکڑا ہوا ہے۔ مجھے یقین آگیا کہ واقعی ہماری طالبات کتنی ذہین ہیں۔

(شیخ محمد انوار۔ پاک پتن)

Goldfish
Deluxe Pencil
حقیر
سی
لکیر
حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی
گولڈ فِش ڈیلکس پینسل
SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E. MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: 293451
جہاں چلے، رواں چلے
BOND

نسیم سحر اکبرآبادی

دنیا میں بعض تاریخی حقائق میں اس قدر مشابہت ہوتی ہے کہ انہیں سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اگر اسی طرح کے واقعات فلموں، ڈراموں یا کہانیوں میں پیش کیے جائیں تو دیکھنے اور سننے والے اسے تفریح طبع کی خاطر قبول تو کر لیتے ہیں لیکن دل سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے، لیکن اگر ایسے دو تاریخی اور عالمی سطح کے کرداروں میں حیرت انگیز حد تک مماثلت پائی جائے تو انھیں تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ آج ہم امریکہ کے دو صدور ابراہام لنکن اور جان ایف کینیڈی کے حالاتِ زندگی آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جن کی زندگی میں ایک صدی کا فاصلہ تو ضرور ہے، لیکن حالات و واقعات کی یکسانیت نے انہیں تاریخی بنا دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

① لنکن اور کینیڈی دونوں بنیادی فلسفۂ نظریۂ حقوقِ انسانی کے علمبردار تھے۔

② لنکن ۱۸۶۰ء میں صدر منتخب ہوئے تھے اور کینیڈی ۱۹۶۰ء میں

③ دونوں صدور کی بیگمات میں بھی یہ قدر مشترک رہی کہ "وہائٹ ہاؤس" میں زچگی کے بعد ان کی اولاد وفات پا گئیں۔

④ لنکن اور کینیڈی دونوں ہی "قتل" کیے گئے۔

⑤ دونوں صدور یعنی لنکن اور کینیڈی "جمعہ" کے دن قتل ہوئے۔

⑥ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ دونوں صدور کی بیگمات قتل کے وقت اُن کے ساتھ تھیں۔

⑦ آپ کو شاید معلوم نہ ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان دونوں صدور کے سروں میں گولیاں لگی تھیں۔

⑧ لنکن اور کینیڈی کے قتل کے بعد امریکی صدارت کا عہدہ سنبھالنے والوں کے نام بھی یکسانیت کے لیے تاریخی

لنکن اور کنیڈی

دو امریکی صدور کے چونکا دینے والے یکساں حالات

حقائق بن گئے ہیں' دونوں صدور کے جانشین " جانسن " تھے ۔ اور وہ دونوں "جانسن" سینٹ کے رُکن بھی تھے ۔

⑨ لنکن کے جانشین کا نام "اینڈریو جانسن" تھا اور وہ ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوا تھا جبکہ کینیڈی کے جانشین کا نام "لینڈن جانسن" تھا ۔ جو اینڈریو جانسن سے ٹھیک ایک صدی بعد یعنی ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوا تھا یقیناً یہ مماثلت بھی تاریخی حقائق کا ایک جز بن گئی ہے ۔

⑩ ایک صدی کے فرق سے یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہی ہے کہ لنکن کا قاتل "بوتھ" ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوا تھا جبکہ

⑪ کینیڈی کا قاتل "اوسوالڈ" ۱۹۳۹ء میں پیدا ہُوا تھا ۔

⑫ لنکن کے سیکریٹری کا نام "کینیڈی" تھا اور کینیڈی کے سیکریٹری کا نام "لنکن" تھا ۔

⑬ وقوعہ (یعنی جس دن قتل ہوئے) والے روز لنکن کے سیکریٹری "کینیڈی" نے اپنے محترم صدر سے درخواست کی تھی کہ وہ تھیٹر نہ جائیں، اسی طرح کینیڈی کے سیکریٹری "لنکن" نے بھی اپنے محترم صدر سے درخواست فرمائی تھی کہ وہ ڈلاس نہ جائیں ۔ اس طرح دونوں سیکریٹریوں کی چھٹی حس میں بھی مماثلت تاریخی حقیقت بن گئی ہے ۔

⑭ لنکن کا قاتل "بوتھ" ایک تھیٹر میں گولی مار کر بھاگا اور ایک گودام میں چھُپ گیا تھا ۔ جبکہ کینیڈی کے قاتل "اوسوالڈ" نے ایک گودام سے کینیڈی کو گولی کا نشانہ بنایا اور بھاگ کر ایک تھیٹر میں چھُپ گیا تھا ۔

عرب جن، شیطان اور بھوت پریت کو ایک ہی جنس میں شمار کرتے تھے ۔ لیکن ان کے نام انھوں نے الگ الگ رکھ چھوڑے تھے، کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ جنوں شیطانوں اور بھوت پریت کی شکلیں اور ان کے مشاغل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں ۔ عربوں نے ایسے جنوں کو جو جنگلوں اور میدانوں میں رہتے تھے اور اپنا روپ بدل کر مسافروں کو دھوکا دیتے تھے اُن کا نام غول رکھا تھا ۔

عربوں کا اعتقاد تھا کہ جن صحرا میں رہنے والے بدوؤں کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے ۔ جاڑوں میں جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تو ان کے ساتھ جن بھی بیٹھ کر آگ تاپتے تھے ۔ لیکن جب بدو کھانا کھاتے تو یہ اس کھانے میں شریک نہ ہوتے تھے اور یہ کہہ کر معذرت کر لیتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھاتے ۔ یہ جن جہاں آباد تھے ان کی بستیوں کے نام بدی ، بقار اور عبقر تھے ۔

کہتے ہیں کہ یہ جن اکثر بچوں اور جوانوں کو اُٹھا بھی لے جاتے تھے ۔ حضرت علیؓ کے ایک بھائی طالب کو یہ اُٹھالے گئے تھے اور پھر ان کا کبھی پتا نہ چل سکا ۔ عمر بن عدی لخمی جو وہاں کا بادشاہ تھا ۔ اُسے بھی اُٹھالے گئے تھے اور کئی برس بعد یہ واپس ملا تھا ۔ اس طرح فرانہ نامی شخص کو بھی اُٹھالے گئے تھے ۔ جب مدت کے بعد فرانہ واپس آیا تو سُننے والوں کے لیے اس کی باتیں عجیب وغریب تھیں ۔

جب مَیں نے بھوت کو قتل کیا

طارق جمیل

ایک اندھیری اور سُنسان رات کا قصّہ

مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ بھُوت میرے سامنے آکر میرے اوسان خطا کر دے گا۔ اب بھی جب کبھی میں سردیوں کی رات میں اور جب دُھند بھی چھائی ہوئی ہو، نہر کے ساتھ ساتھ گھنے درختوں میں گھری ہوئی سنسان سڑک پر سے گزرتا ہُوں تو مجھے اُس رات کا خیال آجاتا ہے۔ چلو! میں تمہیں پورا قصّہ سُناتا ہوں کہ ہُوا کیا تھا اور وہ بھُوت کون تھا اور پھر کس طرح وہ میری موٹر سائیکل کے پہیوں کے نیچے کُچلا گیا۔ یقین کرو اُسے دیکھ کر ایک دفعہ تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی اور ٹھنڈے پسینے آگئے تھے لیکن آخر کار وہ خود ہی میرے قدموں تلے روندا گیا۔

یہ شاید دسمبر کا مہینہ تھا لیکن شاید کیوں؟ یقیناً دسمبر ہی کا مہینہ تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے اور دسمبر کی

اٹھائیس تاریخ تھی۔ لاہور شہر کو سردی نے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں اپنے چھوٹے بھائی عامر کو ریل گاڑی میں بٹھا کر واپس گھر آ رہا تھا۔ اُس روز پشاور جانے والی گاڑی کچھ زیادہ ہی لیٹ تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے لیکن گاڑی کا ابھی دُور دُور کوئی نشان نہ تھا۔ آخر خُدا خُدا کر کے پلیٹ فارم کی زرد روشنیوں میں گھِرے ہوئے لاؤڈ اسپیکر نے ایک کھُرکھُری سی آواز میں گاڑی کی آمد کا اعلان کیا تو سب کی جان میں جان آئی۔ گاڑی آئی تو میں نے عامر کو گاڑی میں بٹھایا اور اُسے خُدا حافظ کہہ کر اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ اُس وقت رات کا ایک بج چُکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ابھی گھر تک پہنچنے کے لیے مزید پون گھنٹہ موٹر سائیکل پر سفر کرنا ہے۔ خیر میں نے اسٹینڈ پر سے موٹر سائیکل لی اور اُسے اسٹارٹ کر کے گھر کی راہ لی۔ اسٹیشن کے باہر اتنی رات بیت جانے کے باوجود ابھی رونق تھی ٹریفک کا رش تو ختم ہو چکا تھا لیکن چائے کے ہوٹل اور ویگنوں کے اڈے آباد تھے۔ اِکّا دُکّا مسافر بھی آ جا رہے تھے مجھے صرف سردی کی فکر ہو رہی تھی اور گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اسٹیشن کے علاقے سے باہر نکلتے ہی وہ بدتمیز بھُوت میری ملاقات کے لیے کھڑا ہو گا۔ میں نے سویٹر کے اُوپر اپنی موٹی جیکٹ کو خوب اچھی طرح کس لیا تھا اور کانوں کو بھی مفلر سے اچھّی طرح لپیٹ لیا تھا۔ سردی اتنی تھی کہ سانس منہ سے بھاپ بن کر نکل رہی تھی۔ جب میں مال روڈ پہ پہنچا تو سارے ماحول میں سوائے میری موٹر سائیکل کی آواز کے اور کوئی آواز نہ تھی۔ مال روڈ کے کنارے بوڑھے درخت پتّوں میں سر دیے سو رہے تھے ساری سڑک پر ایک پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یُوں ہی اچانک مجھے ایک فضول سا خیال آیا کہ اگر اس وقت خدانخواستہ موٹر سائیکل خراب ہو جائے یا اس کا پیٹرول ختم ہو جائے تو میں کیا کروں گا۔ یہ سوچتے ہی میں کچھ پریشان سا ہُوا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس نامعقول خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ میری موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ خاموشی کو چیرتی ہوئی بھاگتی جا رہی تھی۔

اب میں مال روڈ کے اُس حصّے پر پہنچ چکا تھا جہاں سے مجھے دائیں ہاتھ کو مڑنا تھا۔ یہی نہر والی سڑک تھی۔ درختوں سے گھِری ہوئی۔ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے اوپر جا کر درختوں کی ٹہنیوں میں غائب ہو گئے تھے۔ اور ان پر لگے ہوئے بلب روشن تو تھے لیکن اُن کی روشنی اس وقت صرف اُن گھونسلوں تک محدود تھی جو درختوں کی ٹہنیوں پر پرندوں نے بنا رکھے تھے۔ سڑک بالکل سُنسان اور نیم تاریک تھی۔ جونہی میں اُس سڑک پر مُڑا تو دیکھا کہ دھُند اور کہُر کے غبار نے سڑک کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ دائیں بائیں اور سامنے دس فٹ کے فاصلے سے زیادہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف کہُر کے بادلوں کی ایک چادر تھی جو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، ٹھنڈ اتنی زیادہ کہ میری ناک جیسے چہرے سے گر گئی ہو۔ میں نے ہاتھ لگا کر اپنی ناک کو

ٹٹولا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنی جگہ پر موجود تھی۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف اتنا پتا چلتا تھا کہ میرے سامنے اور ارد گرد ایک سفید پردہ ہے۔ جس کے اوپر میری موٹر سائیکل کی روشنی پڑ رہی تھی اور ابھی جیسے اُس پر کوئی فلم چلنا شروع ہو جائے گی۔ اچانک ہی میں نے محسوس کیا کہ جیسے میری موٹر سائیکل کی آواز بند ہو گئی ہو، حالانکہ موٹر سائیکل چل رہی تھی۔ بہت دُور سے بائیں ہاتھ کی آبادی میں سے مجھے چوکیدار کی سیٹی بجنے کی آواز سُنائی دی اور پھر اُسی خاموشی میں کہیں گم ہو گئی۔ میں سانس روکے چلا جا رہا تھا۔ میرے کان بھی سردی کی وجہ سے جم سے گئے تھے۔ میرا ذہن پھر طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنتا جا رہا تھا۔ اور میں چاہ رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ جاؤں، فاصلہ تھا کہ کم ہونے کو ہی نہیں آ رہا تھا۔ اچانک سن سے کوئی چیز میری طرف بڑھی اور میرے پہلو کے قریب سے پیچھے کو نکل گئی۔ میرا دل چاہا کہ پیچھے مڑ کر دیکھوں لیکن خوف میرے اندر سرایت کر چکا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت ہی نہیں کی۔ بار بار یہی خیال آتا کہ ابھی پیچھے سے کوئی آکر مجھے دبوچ لے گا۔ میرے دل کی دھڑکن یا تو بند ہو گئی تھی یا بہت تیز ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں بار بار موٹر سائیکل کی اسپیڈ بڑھاتا لیکن موٹر سائیکل اپنی ہی رفتار سے چلی جا رہی تھی اور میں اُس سفید کہر کے حصار سے باہر نہیں نکل رہا تھا۔ میں نظریں سامنے جمائے بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ ایک گول سی چیز تیزی سے میری طرف لپکی اور چھپاک سے میرے سینے سے ٹکرا کر چمٹ گئی۔ اب تو میں بہت گھبرایا اور گھبراہٹ میں موٹر سائیکل کا توازن بھی بگڑ گیا۔ رفتار کچھ کم ہو گئی۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ سینے کی طرف دیکھوں اور میرے سینے پر ایک دباؤ سا پڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر دبا رہا ہو۔ مجھے کچھ سُجھائی نہیں دیتا تھا کہ کیا کروں کہ اچانک میرے سامنے، دُھند کی چادر کے اُوپر ایک کالے سیاہ رنگ کا سایہ سا لہرایا۔ کبھی دائیں ہو جاتا کبھی بائیں۔ اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں غور کیا تو ایک بہت بڑا سر جو درختوں کی ٹہنیوں کو چھو رہا تھا۔ بڑا سا دھڑ اور۔ اور۔ اُس کے پاؤں۔ یا اللہ میں کیا کروں، اُس کے پاؤں سڑک پر گھسٹ رہے تھے اور وہ میرے سامنے ناچ رہا تھا۔ کبھی دائیں ہو جائے کبھی بائیں۔ میرے تو جیسے حواس اُڑ گئے۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ سخت سردی میں ٹھنڈے پسینے آنے شروع ہو گئے۔ اور وہ کم بخت تھا کہ میرے سامنے میری ہی طرف منہ کیے ناچے چلا جا رہا تھا اور میری رفتار سے اُلٹے پاؤں بھاگ بھی رہا تھا۔ میں نے دل میں اللہ سے دُعا کی کہ یا اللہ کس مُشکل میں پھنس گیا ہوں۔ اچانک میرے کانوں میں اُس کی آواز بھی آنا شروع ہو گئی غوں غوں غوں۔ اور آواز بڑھتی گئی جیسے قریب آ رہی ہو۔ میں نے ڈرنے اور خوفزدہ ہونے کے باوجود اپنے اوسان کچھ بحال رکھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ آواز جوں جوں بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ سایہ چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ اور اب اُس کا قد

بھی چھوٹا ہوگیا ہے۔ میں نے غور کیا تو لگا کہ یہ آواز تو کسی موٹر کی لگ رہی ہے اور میرے پیچھے سے آرہی ہے۔ جونہی وہ موٹر میرے زیادہ قریب آئی اور پھر مجھ سے آگے نکل گئی اُسی لمحے زن سے وہ بھُوت چھوٹا ہوتے ہوتے میرے موٹر سائیکل کے پہیوں تلے سے پیچھے نکل گیا۔ اور اب میرے سامنے گزرنے والی موٹر کی سُرخ رنگ کی بتّیاں آہستہ آہستہ دُھند میں بہت آگے نکل گئیں۔ دراصل یہ بھُوت نہیں تھا میرا اپنا سایہ تھا جو کہ پیچھے سے آنے والی موٹر کی روشنی کی وجہ سے سامنے دُھند کی چادر پر پڑ رہا تھا اور جُوں جُوں موٹر قریب آئی گئی وہ چھوٹا ہوتا گیا۔ میں نے خُدا کا شکر ادا کیا اور اپنی حماقت پر ہنسی بھی آئی۔ ذرا دم لینے کو موٹر سائیکل روکی۔ تو پیپل کا ایک بڑا سا پتّا میری جیکٹ سے جُدا ہو کر نیچے گر پڑا جو کہ ہوا کے دباؤ سے میرے ساتھ چپکا ہوا تھا۔

بھیّا بیلی ــــ سکھی سہیلی

بُوجھ پہیلی

۱۔ آگ لگے میرے ہی بل سے ہر انسان کے آتی کام
دن میں پودے مجھے بناتے اب بتلاؤ میرا نام

۲۔ پہلا آدھا کھٹ کھٹ میں باقی آدھا مل مل میں
کر دیتا ہوں نیند حرام خون چوسنا میرا کام

۳ چھوٹے بڑے سبھی کو بھائے بُوجھ سکے تو بُوجھ
گول مٹول، رنگ ہے پیلا پیٹ میں داڑھی مُونچھ

۴ ایک عورت کے پیٹ نہ آنت اُوپر نیچے دانت ہی دانت
منہ سے لیوے جان نکال کس کر سر پر پڑے وبال

۵ ایک پھول ہے کالے رنگ کا سب کے سر پر آئے
جب بھی بادل گھر گھر آئیں یہ سر پر آجائے

جواب بوجھ پہیلی:۔ ۱- آکسیجن۔ ۲- کھٹمل۔ ۳- آم۔ ۴- قینچی۔ ۵- چھتری۔

ہم مسلمان ہیں

سیّد نظر زیدی

تم ہمیں دیکھ لو، ہم کو پہچان لو
دوست ہیں ساری دنیا کے یہ مان لو

ہم کسی کو بھی ناحق ستاتے نہیں
یوُں ہی دُشمن کسی کو بناتے نہیں

ہے اگر دُشمنی تو بُرائی سے ہے
ورنہ نفرت بہت ہی لڑائی سے ہے

چاہتے ہیں چلے حکم قرآن کا
فیصلہ جو بھی ہو، ہو وہ ایمان کا

سب کو عزّت ملے، سب کو راحت ملے
غیر ہیں جو اُنھیں بھی محبت ملے

کوئی بھوکا نہ ہو، کوئی ننگا نہ ہو
کوئی جھگڑا نہ ہو، کوئی دنگا نہ ہو

ہر طرف امن و انصاف کا راج ہو
سَر پہ انساں کے ایمان کا تاج ہو

سب سے اُونچا ہو بس نام اللہ کا
سب کو پہنچائیں پیغام اللہ کا

ہم مسلمان ہیں، ہم مسلمان ہیں
اہلِ ایمان ہیں، اہلِ ایمان ہیں

(رجسٹرڈ ...)
قائم شدہ ۱۹۴۱

جائیے —!
ہم آپ سے نہیں بولتے۔

دیکھئے نا —! حرا۔ شیزا۔ کرن اور فرخ سب کے
اکاؤنٹ حبیب بینک میں ہیں مگر آپ نے اب تک
میرا اکاؤنٹ نہیں کھلوایا۔

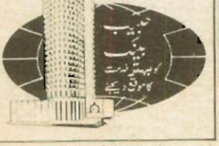

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)
manhattan International

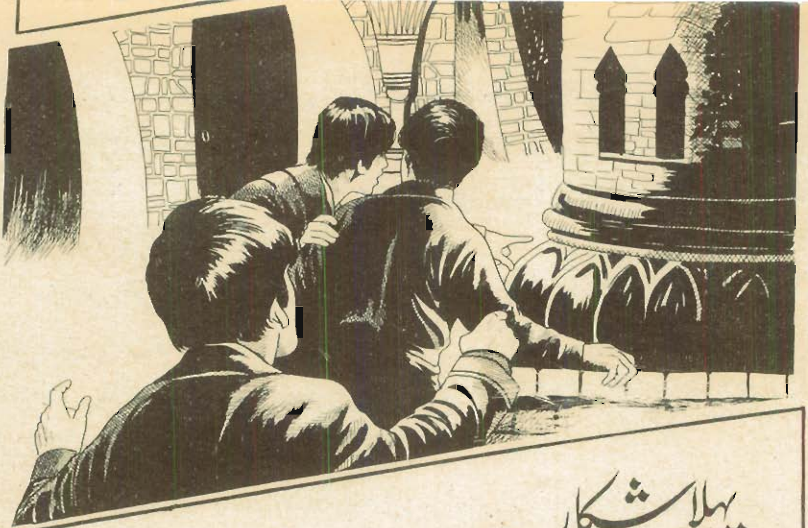

پہلا شکار

شام کے بعد گھر نہ لوٹنے والے بچوں کا انجام

رابعہ محمود

جمعہ کی شام چار بجے کے قریب عثمانی اور خالد ہمارے یہاں آئے اور شکار پر چلنے کی دعوت دینے لگے۔

"کیسا شکار؟" میں نے دریافت کیا۔ "غلیل سے نشانہ لگانے کا ارادہ ہے؟" میں نے پھر سوال کیا۔

عثمانی چیخ ہی تو پڑا۔ "آدمی ہو یا سوالیہ نشان، سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بس لگ جاتے ہو بولنے۔" "اتنی لمبی تقریر تو کر دی جناب نے لیکن ہمارے سوال کا جواب پھر بھی نہیں ملا۔" میں نے کہا۔

"عید پر خالد کے ابو نے جو چھرے کی بندوق خالد کو دی تھی نا۔ بس اس سے ہی باری باری... شکار کریں گے۔ کبوتر تو مر ہی جائیں گے۔" عثمانی نے جواب دیا۔

ہم بھاگم بھاگ امّی سے اجازت لینے پہنچ گئے۔ پہلے تو وہ ہچکچائیں لیکن ہمارے یقین دلانے پر کہ ہم باقاعدہ شکار پر تھوڑا ہی جا رہے ہیں بس سامنے والے جنگل میں غلیل سے چڑیوں پر نشانہ بازی کریں گے، انہوں نے اجازت دے دی۔ جلد واپس آنے کا وعدہ کرکے ہم وہاں سے نو۔ دو۔ گیارہ ہو گئے۔ کیونکہ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں امّی اپنی رائے تبدیل نہ کر دیں۔ ویسے بھی ہم نے باہر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ آپا ہمارے خلاف رائے دینے کے لیے تیزی سے جا رہی تھیں۔

قریب ایک گھنٹے تک ہم تینوں دوست اِدھر اُدھر چڑیوں پہ نشانے لگاتے رہے لیکن کسی ایک کو بھی نشانہ نہیں بنا سکے۔ خالد کا موڈ خراب ہوتا جا رہا تھا وہ واپس چلنے کا مشورہ دے رہا تھا آخر

میں جھنجھلا کر کہا: "یہ کیا بوریت ہے۔ خالی ہاتھ تو ہم جانے سے رہے۔ آپا ویسے ہی کمبختی مچائے رکھتی ہیں۔ اب تو مارے طعنوں کے جینے بھی نہیں دیں گی۔ ہم امی سے اجازت لینے سے پہلے رُعب ڈالنے کے لیے آپا کے پاس گئے تھے کہ ہم شکار کو جا رہے ہیں اور کبوتر مار کر لائیں گے۔ آپا نے بہت یقین کے ساتھ کہا تھا "بے کار جا رہے ہو تم سے نہیں مرنے کی چڑیا وڑیا!!"

عثمانی کچھ یاد کرتے ہوئے بولا "ارے ہاں کبوتر کیوں نہ مارے جائیں۔ شکار ہو تو شاندار ہو۔" "کیوں نہیں کیوں نہیں" خالد نے کہا "کُتے کا بس ہو تو ہانڈی ہی کھائے"۔

"ہمیشہ بے تکی بات کرتے ہو" میں نے جواب دیا "بھلا یہاں کُتے کا کیا ذکر، ہانڈی کا تو خیر ہو بھی سکتا ہے۔ ایک طرح سے کہ کبوتر اس میں پکیں گے۔"

عثمانی نے کہنا شروع کیا "ایک بار ابو کے ایک دوست جو شکاری بھی ہیں ابو سے کہہ رہے تھے کہ اس جنگل میں تھوڑی ہی دُور ایک پُرانا مندر ہے، اس میں بہت سے کبوتر رہتے ہیں لیکن کوئی ان کو مارتا نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں مارتے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔ "کیا بھوت رہتے ہیں مندر میں" میں نے دیکھا کہ خالد کا چہرہ ایک دم فق پڑ گیا۔ "کیا ہوا خالد تم کو" عثمانی نے ڈانٹ کر کہا۔ "ڈر گئے نا؟" خالد نے جلدی سے جواب دیا "نہیں نہیں ڈرنے کی اس میں کیا بات ہے"

ہم خوب سمجھ رہے تھے کہ خالد کی بھوتوں کے نام سے جان نکلتی ہے لیکن ہم نے کچھ نہ کہنا ہی مناسب سمجھا کیوں کہ ہم جانتے تھے کہ وہ بہت حسّاس ہے، اسی لیے لڑکے ان کو خالدہ بیگم کہتے تھے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ جنگل میں اندھیرا ذرا زیادہ ہی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری دہشت بھی بڑھ رہی تھی۔ آپا کے طعنوں کا ڈر ہی تھا جو اب تک ہم کو گھر واپس جانے سے روکے ہوئے تھا۔ ورنہ ہم تو کبھی کے جا چکے ہوتے۔ عثمانی جو بہادر ہونے کا دعویٰ کرتے رہتے تھے اس آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے بولے "اندھیرا تو ہو ہی گیا ہے، گھونسلوں سے ہی کبوتر پکڑ لیں۔"

خالد جو دوسری طرف دیکھ رہا تھا ایک دم بولا "وہ دیکھو ایک دم سے روشنی ہو گئی وہاں۔ وہیں ہوگا مندر، پجاری نے چراغ جلا دیا ہوگا۔ ابا جان تو کہتے تھے کہ وہاں کوئی نہیں رہتا" عثمانی نے کہا۔ میں ذرا ہمت کر کے بولا "پجاری کہیں اور رہتا ہوگا۔ شام کو چراغ جلانے آجاتا ہوگا۔" ہم سب تیز قدموں سے روشنی کی طرف چلے جا رہے تھے۔ خالد کسی سوچ میں تھا اور بار بار پیچھے رہ جاتا تھا۔ اب تو ہم پر بھی خوف طاری ہو چلا تھا۔ آخر ہم سے نہ رہا گیا اور ہم نے تھکن کا بہانہ کرتے ہوئے کہا "چلو یار عثمانی واپس چلیں اب تو ہم سے

نہیں چلا جاتا - پیر من من بھر کے ہو گئے ہیں "

عثمانی ہنس کر بولا "تھکن سے یا ڈر کے مارے، بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے کچھ نہیں ہوتے بھوت پریت۔ یہ تو بڑے بوڑھوں کے دماغ کی اختراع ہے تاکہ ہم بچوں کو ہر جگہ جانے سے روک سکیں "

"وہ دیکھو بکائن کے درخت کے پیچھے سے چاند بھی اُوپر آ رہا ہے۔ اس کی روشنی میں بڑی آسانی سے کبوتر پکڑ لیں گے "

عثمانی کے اُوپر خوف کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ ہماری کلاس کا سب سے تندرست و توانا لڑکا مانا جاتا تھا۔ اس کو اپنے زورِ بازو پر اتنا ناز تھا کہ وہ اسکول کے ہر لڑکے کو کُشتی کی دعوت دے چُکا تھا۔ پر ایسا کون احمق تھا جو اپنے ہاتھ پیر تُڑواتا۔ شاید اپنی طاقت پر اعتماد نے ہی اُس کو اتنا نڈر بنا دیا تھا۔

عثمانی کے پُر اعتماد لہجے سے ہماری بھی ہمت بڑھی اور خالد نے بھی تیز تیز قدم اُٹھاتے شروع کر دیے۔ جلد ہی ہم تینوں روشنی کے کافی قریب پہنچ گئے۔ ہلکی ہلکی چاندنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ چڑیاں غالباً بسیرے کے لیے اپنے گھونسلوں میں چلی گئی تھیں۔ کیونکہ ایک دم خاموشی ہو گئی تھی اور شاید اسی وجہ سے اُداسی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

ایک اور ڈر، ہمارے دل میں بڑھ رہا تھا۔ وہ یہ کہ امّی سے ہم وعدہ کر کے آئے تھے کہ جلد واپس گھر پہنچ جائیں گے۔ اب وہ پریشان ہوتی ہوں گی۔ اور سخت سزا ملے گی، لیکن ہم بالکل مجبور تھے۔ دوستوں کے بغیر اکیلے واپس جانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہی مثل ہمارے اوپر صادق آتی تھی کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

خیر ذرا ہی دیر میں ایک ٹوٹی پھوٹی سی عمارت ہمارے سامنے کھڑی تھی، جو درختوں اور بیلوں سے اتنی ڈھکی ہوئی تھی کہ یہ معلوم کرنا دشوار تھا کہ یہ مندر ہے یا کسی دوسری عمارت کا کھنڈر ہے۔

یہاں پہنچ کر خوف زیادہ ہی بڑھ گیا۔ ہم تینوں غیر ارادی طور پر بہت دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ بس ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم نے ذرا بھی آواز نکالی اور پیچھے سے کسی نے ہمارا گلا دبا یا۔ خالد غریب کی حالت کچھ زیادہ ہی غیر تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھے جا رہا تھا۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا یا شاید چاندنی میں ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

عثمانی دروازے کی تلاش میں عمارت کے چاروں طرف چکر لگانا چاہتا تھا۔ آخر کار ہم تینوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا اور چوروں کی طرح دبے پاؤں عمارت کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ بس اتنا معلوم ہو سکا کہ دروازہ کوئی نہیں۔ البتہ اُوپر ایک روشن دان ہے۔ جس میں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔

"بھائی ہم کو تو اب بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اب ہم تمہارا ساتھ نہیں دے سکتے۔" ہم نے سچ بولتے ہوئے عثمانی کو مخاطب کیا۔

عثمانی ہماری بات کا جواب دیے بغیر بولا "وہ دیکھو جہاں پتوں میں سے روشنی نکل رہی ہے۔ وہ ہی دروازہ معلوم ہوتا ہے، چلو ذرا اندر جھانک کر تو دیکھ لیں پھر واپس چلے چلیں گے۔" خالد بولا "تم جاؤ اندر میں یہیں کھڑا ہوں۔"

جیسے ہی عثمانی نے جھاڑیاں ایک طرف ہٹائیں ایک دم روشنی ہماری آنکھوں میں پڑی اور کوئی چیز پھڑ پھڑاتی ہوئی ہمارے چہروں سے ٹکراتی ہوئی نکل کر اُڑ گئی۔ غالباً کوئی پرندہ ہوگا۔ عثمانی... فوراً زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملنے لگا۔

ہمارا دل دھک سے ہوگیا اور ہم نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا عثمانی جلدی بتاؤ۔ ہمارا تو ڈر کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔" خالد بھاگ کر ہمارے نزدیک آگیا اور بولا "تم لوگ بڑے ڈرپوک ہو۔ اس پرندے کا پَر میری آنکھ میں لگ گیا تھا۔ چلو اب اندر سے کبوتر پکڑ کر لاتے ہیں۔"

ہم حیرت سے دنگ ہی تو رہ گئے۔ کس بلا کا نڈر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈر سے واقف ہی نہیں۔

"نہیں بھائی اب ہم آگے بالکل نہیں جائیں گے۔" ہم دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ عثمانی ناراض ہو کر کہنے لگا "ٹھیک ہے میں اکیلا ہی جاتا ہوں۔"

اب تو ہم دونوں کو عثمانی پر سخت غصہ آرہا تھا۔ عجب قسم کا شخص ہے۔ بھلا جان بوجھ کر خطرے میں جانا کون سی عقلمندی ہے اور بہادری بھی نہیں بلکہ بے وقوفی کی دلیل ہے۔ انگریزی کی وہ کہاوت یاد آگئی کہ "بیوقوف ایسی جگہ جا گھستے ہیں جہاں فرشتے بھی قدم رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔"

"خالد اور ہم گھر واپس جا رہے ہیں۔" یہ کہہ کر ہم دونوں چل پڑے۔ ہم دونوں خاموش چلے جا رہے تھے ہم غصے میں عثمانی کو چھوڑ کر تو آئے تھے لیکن اب افسوس ہو رہا تھا کہ اپنے دوست کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہیئے تھا اگر ہم اس کو تھوڑی دیر اور سمجھاتے تو ممکن ہے وہ واپس آجاتا۔ ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک چیخ سنائی دی جو سارے جنگل میں گونج گئی۔ خالد ایک دم مجھ سے لپٹ گیا۔ اور منہ ہی منہ میں کہنے لگا "یا اللہ ہم کو سب بلاؤں سے محفوظ رکھنا..."

ہمیں عثمانی کی زیادہ پریشانی تھی وہ چیخ یقیناً اُسی کی تھی۔ اپنی آواز کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم نے کہا "ہائے اللہ عثمانی کو پکڑ لیا کسی نے۔" پھر ہم نے ہمّت کر کے آواز دی "عثمانی تم کہاں ہو؟" ہماری آواز جنگل

کے اس سرے سے اُس سرے تک جاتی ہوئی سُنائی دی پھر سناٹا چھا گیا۔ عثمانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب تو رہی سہی ہمت نے بھی جواب دے دیا۔ اور بغیر کچھ سوچے سمجھے ہم دونوں گھر کی جانب تیزی سے بھاگنے لگے۔ اتنے میں ہماری نظر ایک شخص پر پڑی جو ہماری ہی طرف بھاگتا آرہا تھا۔ "وہ کون آرہا ہے" یہ کہتے ہی خالد دھڑام سے زمین پر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے بھائی جان کی آواز سُنائی دی "راشد خالد، عثمانی تم لوگ ٹھیک تو ہو" چاند بادلوں کی اوٹ میں آگیا تھا۔ اس لیے کچھ نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ ہم بھائی جان کی آواز پہچانتے ہی آگے بڑھ کر اُن سے لپٹ گئے۔ مالی اور شوفر بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ "خُدا کا شکر ہے کہ تم خیریت سے ہو" بھائی جان بولے اتنے میں ان کی نظر خالد پر پڑی۔ وہ کہنے لگے کہ "یہ کون ہے؟" ہمارے بتانے پر کہ خالد بے ہوش پڑا ہے انھوں نے ہمارے تھیلے میں سے پانی کی بوتل نکال کر اُس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے۔ تھوڑی دیر میں خالد نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بھائی جان کو ذرا فرصت ہوئی تو انھوں نے پوچھا کہ "عثمانی کہاں ہے؟ امی تو کہہ رہی تھیں کہ وہ بھی تمہارے ہمراہ آیا تھا" مندر کی روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم نے اُن کو بتایا کہ "وہاں اندر گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی جب چیخنے کی آواز آئی تھی شاید اُسی کی ہوگی" یہ کہتے کہتے ہماری آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اب بادل چھٹ گئے تھے اور کافی روشنی معلوم ہو رہی تھی۔ خالد کو ایک ملازم کے سپرد کر کے ہم لوگ مندر کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ جس جگہ سے ہم نے بیلیں ہٹائی تھیں وہاں ایک دروازہ تھوڑا سا کھُلا ہوا نظر آرہا تھا۔ بھائی جان اندر جھانکنے لگے اور کافی دیر تک جھانکتے ہی رہے۔ آخر ہم سے نہ رہا گیا۔ ہم نے پوچھا "کیا عثمانی اندر ہے؟" لیکن انھوں نے جیسے سُنا ہی نہیں وہ اُسی طرح ٹکٹکی باندھے اندر دیکھتے رہے۔ زمین پر بیٹھ کر بھائی جان کی ٹھوڑی کے نیچے سے ہم نے بھی اندر جھانکا۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ایک لمحے کے لیے ہمارا دل دھڑکتے دھڑکتے رُک گیا ہو۔ جو منظر ہم نے دیکھا وہ عجیب و غریب تھا۔ سامنے چبوترے پر ایک مُورتی رکھی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اُوپر کو اُٹھا ہوا تھا۔ دوسرا گود میں رکھا ہُوا تھا اور اس کی ہتھیلی میں ایک دیا جل رہا تھا جس کی لَو کبھی بھڑک اُٹھتی تھی اور کبھی بالکل مدھم ہو جاتی۔ دیے کے بھڑکتے ہی سامنے مندر کی دیوار پر مورتی کے پیچھے عجیب بے ڈھنگی پرچھائیاں تیزی سے چھت کی طرف لپکتیں اور پھر پھیل کر نیچے آجاتیں۔

چبوترے کے نیچے مورتی کے سامنے عثمانی عجیب حیرانی کے عالم میں مجرم کی طرح دوزانو بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ ٹکٹکی باندھے مورتی کی آنکھوں کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہ میسمریزم

کا شکار ہوگیا ہو۔ مُورتی کے چہرے پر ہم کو ایک فاتحانہ مُسکراہٹ سی محسوس ہوئی۔ ایسا محسوس ہُوا کہ عثمانی اگر چاہے بھی تو اپنی نظریں وہاں سے ہٹا نہیں سکتا۔ یہ سب ہم نے آنِ واحد میں دیکھ لیا تھا۔ پھر ہماری نظر عثمانی کے ہاتھ پر پڑی جس سے اُس نے ایک ذبح کیا ہُوا کبُوتر پکڑ رکھا تھا۔ اس میں سے خُون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ شاید اُس نے کبوتر پکڑ کر اندر ہی ذبح کر لیا تھا۔ تاکہ زیادہ کبوتر لاسکے۔ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا یہ عثمانی نے ہم کو کبھی نہیں بتایا۔

عثمانی کے چاروں طرف دائروں کی شکل میں بے شمار کبوتر گھومے جارہے تھے۔ ان کے پیروں میں شاید گھنگھرو پڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ فضا میں ہلکی سی جھنکار بھی تھی۔ جس پر ہم نے بعد میں غور کیا۔ عثمانی ذرا سی حرکت کرتے اور سارے کبوتر ایک دم اُڑ کر اپنے پَروں سے ان کو مارنے لگتے۔

بھائی جان نے عجیب سی آواز میں پُکارا "عثمانی" مندر کے ہر کونے سے آواز آئی "عثمانی" لیکن عثمانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بھائی جان نے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ ایک دم اندھیرا ہوگیا اور دھڑے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ شاید ہوا کے جھونکے سے چراغ بُجھ گیا تھا۔ ہماری تو چیخ دُور تک پھیل گئی۔

بھائی جان ٹارچ جلا کر اندر داخل ہوئے عثمانی بے ہوش پڑا تھا۔ مُورتی بھی اوندھے منہ گری پڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ عثمانی کی گردن پر پڑا تھا۔ کبوتر سب غائب ہوگئے تھے۔ بھائی جان عثمانی کو اُٹھا کر باہر لائے اور شوفر کی مدد سے اُن کو موٹر تک پہنچایا۔ خالد پہلے سے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں خدا خدا کر کے ہم سب گھر پہنچے۔ آپا اور امّی باہر کھڑی سب کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہم دوڑ کر امّی سے لپٹ گئے۔ انہوں نے پیار سے ہمارے سر پر ہاتھ پھیرا تو ہماری جان میں جان آئی۔

بھائی جان نے عثمانی کو بستر پر لٹایا۔ اور جُھک کر اُس کی گردن کو غور سے دیکھنے لگے ہم نے بھی قریب جا کر دیکھا۔ اس کی گردن پر انگلیوں کے نشان بنے ہوئے تھے۔ جیسے کسی نے اس کا گلا دبانے کی کوشش کی ہو۔ غالباً مورتی کے وزنی ہاتھ گردن پر گرنے سے یہ نشان پڑ گئے تھے۔ عثمانی اب ہوش میں آتا جارہا تھا۔ اس کے ابا کو جیسے ہی اطلاع ہوئی وہ فوراً اُسے اپنے گھر لے گئے۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے عثمانی کو آرام کی ہدایت کی۔ اس واقعے کا نفسیاتی اثر عثمانی پر بہت ہُوا تھا۔ اُسے چُپ سی لگ گئی تھی اس رات اُس پر کیا گزری اس کا ذکر وہ کسی سے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک ماہ بعد وہ اسکول آیا۔ لیکن اب اس میں ایک تبدیلی آگئی تھی۔ وہ اپنی بہادری کے قصّے کسی کو نہیں سُناتا تھا۔

کتابوں کی دُنیا

قابلِ مطالعہ

کتابوں کا تعارف

مطالعہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو نصابی کتابوں کا۔ دوسرے غیر نصابی کتابوں کا۔ نصابی کتابیں تو آپ اس لیے پڑھتے ہیں تاکہ امتحان میں کامیابی حاصل کرسکیں اور غیر نصابی کتابیں مثلاً قصّے کہانیاں، سائنسی معلومات، کھیل کود اور مختلف مشاغل کی کتابوں کے پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ذہن کی تعمیر اور تزئین ہوتی ہے اسی لیے مطالعہ کو ذہن کی غذا کہا گیا ہے۔

ادارہ آنکھ مچولی، اپنے قارئین میں مطالعے کا ذوق وشوق پیدا کرنے کے لیے ایسی دلچسپ اور مفید کتابوں کے تعارف کا سلسلہ شروع کر رہا ہے جو شائع ہو چکی ہیں۔ اس تبصرے میں ہم یہ وضاحت بھی کردیں گے کہ زیرِ تبصرہ کتاب کس عمر کے بچّوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ جو ناشرین اپنی کتابوں پر تبصرہ شائع کرانا چاہیں وہ کتاب کے دو نسخے ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)

پاکستان کی کہانی دادی اماں کی زبانی۔

دادی اماں بیٹھی ہیں۔ اچانک، عدنان دوڑتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے "دادی جان... دادی جان ۱۴ اگست کو میرے اسکول میں جلسہ ہو رہا ہے۔ اور مجھے تقریر کرنی ہے"۔ دادی اماں خوش ہوکر پوچھتی ہیں اور کون کون بچّے تقریر کریں گے؟ عدنان دادی اماں کو پوری تفصیل بتاتا ہے کہ اسکول بہت شاندار طریقے سے سجایا گیا ہے۔ پرچم بھی لہرایا جائے گا، رات کے وقت خوب روشنیاں بھی ہوں گی۔ تب دادی جان پوچھتی ہیں۔

"عدنان تم جانتے ہو کہ یہ جلسہ کیوں ہو رہا ہے؟"

پھر یہیں سے دادی جان اور عدنان میں دلچسپ سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جب عدنان جواب دیتا ہے کہ "یہ جلسہ اس لیے ہو رہا ہے کہ ۱۴ اگست ہمارا قومی دن ہے اور اس دن ہم آزاد ہوئے تھے"۔ تو دادی جان سوال کرتی ہیں کہ "ہم کون ہیں"؟ اور آزاد ہونے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ یہ سُن کر عدنان چکرا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی دادی جان سارے بچّوں کو جمع کرکے نہایت دلچسپ پیرایے میں انہیں آزادی کی کہانی سُناتی ہیں۔ ان کی کہانی اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب انگریز برِصغیر میں تجارت کرنے آئے اور پھر کِس طرح اُنھوں نے سازشیں کیں اور آہستہ آہستہ اس ملک کے حاکم بن گئے۔ دادی اماں نے آگے چل کر یہ بھی بتایا کہ ان انگریزوں کے خلاف مسلمانوں نے کتنی زبردست جدّوجہد کی اور ان کے رہنماؤں مثلاً سر سیّد احمد خان مولانا محمد علی جوہرؔ، علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے مسلمانوں کی رہنمائی کی، اُنہیں تعلیم کی روشنی دی، اُنہیں بیدار کیا اور پھر اپنا ملک بنانے کے لیے جدّوجہد پر آمادہ کیا۔

"پاکستان کی کہانی" ایک دلچسپ آسان اور نہایت معلوماتی کتاب ہے۔ اسے ننھے بچوں کے لیے سلمیٰ زمن صاحبہ نے تحریر کیا ہے۔ اگر بچے اسے پڑھیں گے تو اس سے ان کی معلومات میں بہت اضافہ ہوگا۔ آخر جس ملک میں ہم رہتے ہیں اُس کی تاریخ سے تو ہمیں واقف ہونا ہی چاہیے۔ کتاب کا سرورق نہایت خوبصورت ہے پاکستان کا پرچم، مسلمانوں کے قائدین کی تصویریں، دادی جان اور بچوں کے اسکیچ سے سرورق کو سجایا گیا ہے۔ کتاب کی مصنفہ سلمیٰ زمن ماہرِ تعلیم ہیں۔ سرسید گرلز کالج کی پرنسپل بھی رہی ہیں اس لیے اُنہیں خوب معلوم ہے کہ بچوں کے لیے کتابیں کس طریقے سے لکھی جانی چاہئیں۔ یہ کتاب انجمن ترقیٔ اُردو نے شائع کی ہے اور اس کی قیمت ۵ا روپے ہے۔

ایجادوں کی کہانیاں:-

یہ بہت پُرانی بات ہے۔ ایک قافلے نے رات کے وقت جنگل میں پڑاؤ کیا۔ کھانا پکانے اور سردی سے بچنے کے لیے آگ جلائی۔ جب صبح کو چلنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جس جگہ انہوں نے آگ جلائی تھی وہاں زمین پر کانچ کے بڑے بڑے ٹکڑے سورج کی روشنی میں پڑے چمک رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس زمین میں کانچ کے ذرّے تھے جو آگ کی گرمی سے پگھل کر کانچ کی شکل میں جم گئے۔ وہ لوگ ان ٹکڑوں کو تحفہ سمجھ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ قافلہ اہلِ فونیشیا کا تھا جو آج تاریخ میں کانچ یا شیشے کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔

ایک سائنسدان ایک رات اکیلا اپنے کمرے میں بیٹھا چائے کے لیے پانی گرم کر رہا تھا۔ اتفاقاً پانی ضرورت سے زیادہ کھول گیا اور کیتلی کا ڈھکنا بھاپ کے زور سے اُچھل اُچھل کر اُوپر ہوا میں ناچنے لگا۔ پہلے پہل تو وہ گھبرایا لیکن رفتہ رفتہ یہ بات اُس کی سمجھ میں آگئی کہ یہ بھاپ کی طاقت کا کرشمہ ہے۔ پھر کیا تھا اس نے بھاپ کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ اِسی بھاپ نے ایک طرف پانی پر دُخانی جہاز اور دوسری طرف خشکی پر مشینیں چلا دیں۔ اُس سائنسدان کا نام جارج اسٹیفن سن تھا۔

"ایجادوں کی کہانیاں" ایک ایسی مفید کتاب ہے جس میں اُن حیرت انگیز ایجادوں کا تذکرہ ہے جس سے انسان کو بے شمار فائدے پہنچ رہے ہیں۔ اب مثلاً یہی دیکھیے کہ جس کاغذ پر آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہیں، جو لباس آپ نے پہن رکھا ہے، جس بجلی کی روشنی سے آپ کمرے کے اندھیرے کو بھگاتے ہیں اور جب بجلی چلی جائے تو جو دیاسلائی آپ روشن کرتے ہیں۔ یہ کاغذ یہ لباس، یہ بجلی، یہ دیاسلائی، یہ پُل اور پہیا، ریل گاڑی اور بائیسکل، موٹر کار، ٹیلی فون، ٹائپ رائٹر، مشین، گراموفون، ریڈیو، ٹیلی وژن یہ ساری کارآمد چیزیں آخر کیسے ایجاد ہوئیں، انہیں کس نے ایجاد کیا؟ ان کی مکمل روداد "ایجادوں کی کہانیاں" میں پڑھنے کو ملتی ہے۔ سائنس

کے طالب علموں ہی کے لیے نہیں آرٹس کے طلبہ و طالبات کو بھی یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ کیونکہ جو معلومات اس کتاب میں جمع کردی گئی ہیں اس سے ہر پڑھے لکھے آدمی کو واقف ہونا چاہیے۔ یہ کتاب فیروز سنز لمیٹڈ نے شائع کی ہے ساڑھے سات روپے دے کر کسی بھی بک اسٹال سے طلب کی جاسکتی ہے۔

بچّوں کی الف لیلہ :-

ایک مچھیرا سمندر سے مچھلیاں پکڑتا تھا۔ ایک دن اُس نے سمندر میں جال ڈالا تو بجائے مچھلی پھنسنے کے ایک بند بوتل نکلی۔ اُس نے بوتل کھولی تو اُس میں سے گاڑھا گاڑھا کالا دُھواں نکلا اور پھر اس دھوئیں میں سے ایک جنّ نکلا اور کہا جنّ نے کہ "اے مچھیرے اب تو مرنے کے لیے تیار ہوجا!" یہ سُن کر مچھیرا تو بہت گھبرایا... پوچھنے لگا "ارے بابا! میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے جو تو میری جان لینا چاہتا ہے" اس پر جنّ نے اپنی کہانی سنائی کہ کس طرح سے حضرت سلیمانؑ نے ناراض ہوکر اُسے بوتل میں قید کردیا تھا اور وہ صدیوں سے اس میں بند تھا۔ شروع میں تو اُس نے سوچا تھا کہ جو اُسے بوتل سے آزادی دلائے گا۔ وہ اُسے انعام واکرام سے نوازے گا لیکن جب کسی نے اُسے آزادی نہیں دلائی تو اُس نے عہد کرلیا کہ جو بوتل کا منہ کھولے گا اُسے میں جان سے مار دُوں گا تو اے مچھیرے! اب تو مرنے کے لیے تیار ہوجا۔!

مچھیرے نے جواب دیا کہ "اے جنّ تو جھُوٹ بولتا ہے۔ اتنا بڑا جنّ بھلا اتنی چھوٹی سی بوتل میں کیسے قید ہوسکتا ہے"۔ جنّ نے کہا "اچھا تجھے یقین نہیں ہے۔ لے دیکھ ابھی میں بوتل کے اندر جاکر دکھاتا ہوں..." یہ کہہ کر جنّ دوبارہ دُھواں بن کر بوتل میں اُتر گیا۔ مچھیرے نے لپک کر بوتل کا منہ بند کردیا۔ آگے کیا ہوا؟ اس کی دلچسپ تفصیل "بچّوں کی الف لیلہ" میں ملتی ہے۔ الف لیلہ دُنیا کی مشہور ترین کتاب ہے۔ جس میں انوکھے قصّے ملتے ہیں، ہر قصّے کے اندر سے ایک نیا قصّہ شروع ہوجاتا ہے۔ اسی الف لیلہ کی طرز پر سیّد ابو شمیم صاحب نے بچّوں کے لیے ایک الف لیلہ لکھ ڈالی ہے۔ اس کتاب میں آٹھ کہانیاں ہیں اور ہر کہانی دوسری کہانی سے زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ کتاب چھوٹی عمر کے بچّوں کو سُنانے کے لیے اچھی ہے۔ کیونکہ ننھے بچّے شہزادے، شہزادیوں، پریوں اور جنوں کی کہانیوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس سے ان کے اندر تصوّر کرنے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔

بچّوں کی الف لیلہ کا ٹائیٹل دیدہ زیب اور کاغذ و طباعت عمدہ ہے۔ اندر کے صفحات پر کہانیوں کی مناسبت سے خاکے اور اسکیچ بھی ہیں لیکن اس کی قیمت ۴ر روپے ہے جو بہت زیادہ ہے۔ فیروز سنز کا ادارہ اگر سستی کتابیں شائع کرے تو پڑھنے والوں کی تعداد یقیناً بڑھ جائے گی۔

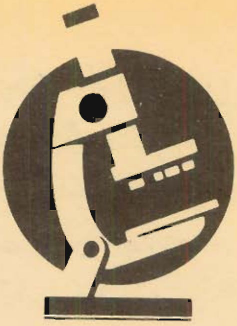

سائنس انکوائری

نیر ابدالی

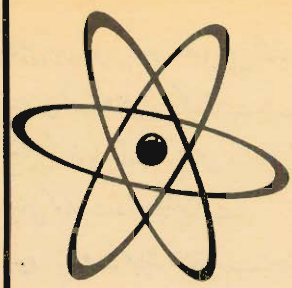

○ کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آنسو گیس کس طرح بنائی جاتی ہے؟ (سلطان بشیر۔ اسلام آباد آصف محمود اعوان۔ ملتان)

دوستو! آنسو گیس کے بارے میں جولائی ۱۹۸۸ء کا شمارہ دیکھ لیجیے۔ اس میں آپ کو اس گیس کے اہم اجزا اور اس سے بچنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

○ ہمارے نظامِ شمسی کا مرکزی ستارہ کونسا ہے؟ (محمد رضوان۔ اورنگی ٹاؤن)

ہم نے اگست ۱۹۸۸ء کے شمارے میں اس کا تفصیلی بیان پیش کیا تھا۔ اس کے مطابق ہمارے نظامِ شمسی کا مرکزی ستارہ سورج ہے۔ جو ہماری زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل دُور واقع ہے۔ نظامِ شمسی کے نو سیارے اپنے اپنے چاند کے ہمراہ ایک مخصوص مدار میں اس کے گرد چکر مکمّل کرتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اگست کا شمارہ دیکھ لیجیے۔

○ میدانی علاقوں کی نسبت پہاڑی علاقے زیادہ سرد کیوں ہوتے ہیں؟ مہر اکرم سیال حیدر۔ ننکانہ صاحب۔ عائشہ صدیقی۔ نارتھ کراچی۔ کراچی حنا زبیری۔ نارتھ کراچی۔ کراچی۔

پہاڑی علاقے چونکہ میدانی علاقوں کی نسبت زیادہ اونچائی پر واقع ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں درجۂ حرارت میدانی علاقوں کی نسبت کم ہوتا ہے۔ آپ نے اکثر سُنا ہوگا یا آپ کو تجربہ بھی ہُوا ہوگا کہ گرمیوں کے موسم میں کراچی اور لاہور کے لوگ مری، ایوبیہ، چترال اور کاغان وغیرہ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ علاقے گرمی کے موسم میں بھی ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ ہم جوں جوں بلندی پر جاتے جائیں ویسے ویسے درجۂ حرارت کم ہوتا جاتا ہے۔

○ کیا یہ بات ٹھیک ہے کہ کاجل دھوئیں سے بنایا جاتا ہے؟ سید عاطف امام۔ شادمان ٹاؤن کراچی۔ نازش امام۔ شادمان ٹاؤن کراچی۔

جی ہاں۔ مگر اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟ بھئی کاجل، پیرافین، پٹرول اور تیل کو کم ہوا میں جلا کر اس سے دھواں پیدا کیا جاتا ہے۔ جسے ٹھنڈی سطح پر جما لیا جاتا ہے۔ اس دھوئیں میں کاربن کے باریک ذرات شامل ہوتے ہیں۔ یہی

کاجل کہلاتے ہیں۔ جو آنکھوں میں لگایا جاتا ہے۔ دوسری قسم کا کاجل سُرمہ کہلاتا ہے۔ اسے بعض معدنیات کو پیس کر بنایا جاتا ہے۔ کاجل اور سُرمہ لگانے سے بینائی کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔

○ زراعت کا پیشہ کتنا قدیم ہے؟ مقبول ادیب انجم۔ زاہد اختر۔ بیرون دولت گیٹ۔ ملتان۔

زراعت کا پیشہ بڑا قدیم ہے۔ سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ زراعت کا پیشہ آج سے سات ہزار سال قبل شروع ہُوا تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک یہ پیشہ ایک حالت پر قائم رہا۔ یعنی آلاتِ زراعت اور طریقۂ زراعت ایک ہی حالت پر قائم رہے۔ گویا زراعت سے مقصود صرف زمین کا کھودنا، جوتنا اور آباد کرنا سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب نئے آلات اور مختلف اقسام کی کھاد اور مناسب دواؤں کا استعمال شروع ہوگیا ہے۔ زراعت کے علم کو اب ایک باقاعدہ علم کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اور اس علم کی باقاعدہ فنی اور عملی تعلیم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے۔ مشینی زراعت کی وجہ سے اب فی ایکڑ پیداوار میں کئی گُنا اضافہ ہوگیا ہے۔ اب زراعت میں نت نئی تحقیقات نے زرعی پیداوار میں بڑا اضافہ کیا ہے۔

○ بعض لوگ بالکل سفید ہوتے ہیں اور بعض بالکل کالے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا کالا ہونا خراب بات ہے۔؟ کریمو ذوالفقار علی۔ کراچی

آپ کے اس سوال کا تفصیلی جواب تو دسمبر ۸۴ء کے شمارے میں موجود ہے۔ جس کو پڑھ کر آپ اس کی سائنسی وجوہات سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کالا ہونا کوئی خرابی ہے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یاد رکھیے! باعلم اور باعمل ہونا اور اخلاق و کردار کے حوالے سے اچھی شہرت رکھنا ہمیشہ کی نیک نامی کا سبب ہوتا ہے۔ تاریخ میں بھی ایسے لوگوں کو سنہرے حروف میں لکھا جاتا ہے۔ ہمارے پیارے دین اسلام میں بھی تقویٰ کو اچھائی کا معیار بتایا گیا ہے۔ رنگ کو نہیں۔

○ دنیا کی پہلی ایجاد کیا تھی اور اُسے کس نے ایجاد کیا؟ حسن مہدی خراسانی۔ انچولی۔ کراچی

یہ بات تو ہم آپ کو بتا سکتے ہیں کہ "پہیّہ" دُنیا کی پہلی ایجاد تھی۔ جس نے انسانی ترقی کے نئے راستے ہموار کیے۔ البتہ یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس اہم ایجاد کا موجد کون ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ یہ اہم ایجاد بھی کئی ہزار برس پہلے وجود میں آچکی تھی۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس کو ایجاد کرنے کا سہرا بہرحال کسی انسان کے سر پہ بندھا ہوگا!

○ ڈائناگراف کس مشین کا نام ہے؟ سید حسین عالم۔ سید فرید عالم۔ حمیرا تبسم علوی۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی۔

ڈائناگراف (Dynagraph) نامی مشین ریل کے انجن میں لگی ہوتی ہے۔ اس سے ریل کے انجن اور ریلوے لائن سے متعلق مفید معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ یہ مشین ریل گاڑی کی رفتار اور

صرف شدہ کوئلے اور پانی کی مقدار کا ریکارڈ خود بخود کرتی جاتی ہے۔ ریلوے لائن میں موجود خرابی کو بھی ڈائنا گراف کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں وقت میں فلاں گاڑی کس رفتار سے جا رہی تھی۔

○ ڈیلٹا کس زبان کا لفظ ہے اور اس سے کیا مُراد ہے؟ آصف مسعود۔ راولپنڈی۔ نادر ایوب۔ کوئٹہ۔

ڈیلٹا یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اسے یونانی زبان میں △ اس طرح تکونا لکھا جاتا ہے۔ اس لفظ کا عام مفہوم کسی دریا کے دہانے کے قریب اس کی منتشر شدہ شاخوں کی جگہ ہے۔ ڈیلٹا قسم کی زمین نہایت زرخیز ہوتی ہے۔ دُنیا کے بڑے بڑے ڈیلٹاؤں میں ہم آپ کو چند ایک نام بتا رہے ہیں۔ دریائے سندھ کا ڈیلٹا۔ مصر میں دریائے نیل کا ڈیلٹا۔ افریقہ میں دریائے نائجر کا ڈیلٹا۔ امریکہ میں دریائے مسی پسی کا ڈیلٹا وغیرہ وغیرہ۔

○ سورج کا قطر کتنا ہے اور یہ ہماری زمین سے کتنے گُنا بڑا ہے؟ راشد ندیم۔ اٹک۔ عبدالحیٔ۔ لاہور۔ عزیز الرحمٰن پشاور۔

سورج کا قطر ۸۶۴،۰۰۰ میل ہے۔ یہ ہماری زمین سے ۱۰۹ گُنا بڑا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہماری زمین جیسے دس لاکھ کُرے اس میں بڑی آسانی سے سما سکتے ہیں۔

○ کاغذ کس طرح بنایا جاتا ہے؟ تفصیلاً بتائیے۔

فریحہ نصیر۔ رعنا نصیر۔ راولپنڈی

کاغذ قدیم زمانے سے انسان کے زیرِ استعمال ہے۔ پُرانے زمانے میں مصر کے لوگ ایک خاص قسم کے سرکنڈے کے گودے کو کوٹ کر کاغذ بنایا کرتے تھے اور اس کو "پیپرس" کہتے تھے۔ انگریزی لفظ پیپر اسی سے نکلا ہے۔ یہ سرکنڈا دریائے نیل کی دلدلوں میں پایا جاتا تھا۔ سینکڑوں سالوں کے بعد چین اور جاپان کے لوگ شہتوت کی لکڑی سے بنایا ہُوا کاغذ استعمال کرنے لگے۔ مختصر طور پر یہ سمجھیے کہ کاغذ لکڑی کے لعاب سے بنایا جاتا ہے۔ خاص طور پر صنوبر کے درخت سے جو گُودا نکالا جاتا ہے وہ بہت عُمدہ ہوتا ہے اور کاغذ بنانے کے کام آتا ہے۔ اس کے علاوہ لکڑی کے بیکار ٹکڑے اور پُرانے ردّی کاغذات سے بھی پیپر ملوں میں دوبارہ کاغذ تیار کیا جاتا ہے۔ کاغذ کا استعمال ہر ملک میں عام ہے بلکہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اخبارات، رسائل، کتابیں، کاپیاں، پوسٹر پمفلٹ وغیرہ اس کے عام استعمال کی ایک جھلک ہیں۔

○ انسان کے جسم میں کتنا خون موجود ہوتا ہے؟
ایم کبیر احمد صدّیقی۔ پشاور سٹی۔ آسیہ سحر نارتھ ناظم آباد، کراچی

ایک عام صحت مند آدمی کے جسم میں پانچ سے چھ لٹر خون موجود ہوتا ہے۔ جس سے خون کی دس سے بارہ بوتلیں باآسانی بھری جا سکتی ہیں۔ خون قدرت کا ایک بہترین عطیہ ہے جو اس نے انسان کو عطا کیا ہے۔

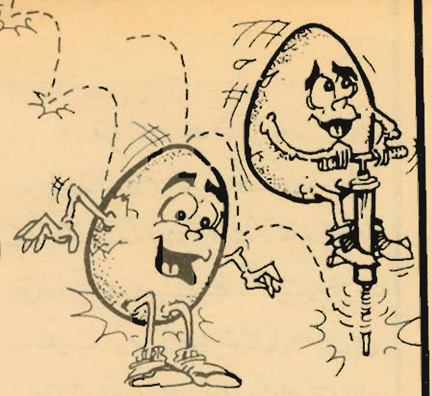

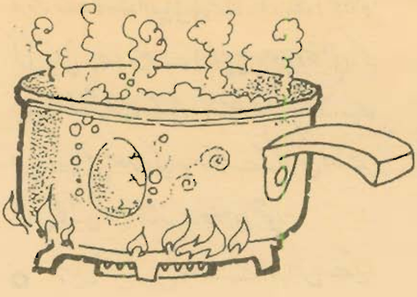

انڈے کی اُچھل کود

آپ نے ریچھ اور بندر کا ناچ اور اُچھل کود تو ضرور دیکھا ہو گا آج ہم آپ کو بتائیں گے کہ انڈے کو 'جی ہاں ! مرغی کے انڈے کو کس طرح "اُچھل کود" پر مجبور کیا جا سکتا ہے ۔ اس لیے آپ اپنی امی یا آپا سے کہیں کہ وہ انڈے کو گرم پانی میں پانچ یا سات منٹ تک خوب اُبالیں ۔ جب انڈا اچھی طرح اُبل جائے تو ایک گلاس لیں اور اس میں اتنا پانی ڈالیں کہ وہ آدھا بھر جائے ۔ اب انڈے کو گلاس میں ڈال دیجیے ۔ پھر گلاس میں اتنا سرکہ ڈالیے کہ گلاس مکمل طور پر بھر جائے ۔ اب اس گلاس کو احتیاط سے کسی محفوظ مقام پر چوبیس گھنٹوں کے لیے رکھ دیجیے چوبیس گھنٹوں کے بعد آپ گلاس سے انڈا نکالیے اور اسے فرش پر ہلکے سے دے ماریے ۔

ارے ! انڈا تو بالکل گیند کی طرح اُچھل کر اُوپر آ گیا ۔ ہے نا مزے کی بات ! اب آپ جلدی سے امی یا آپا کے پاس جائیے تاکہ کل اس وقت آپ انڈے کے اُچھلنے کا تماشہ دیکھ سکیں ۔

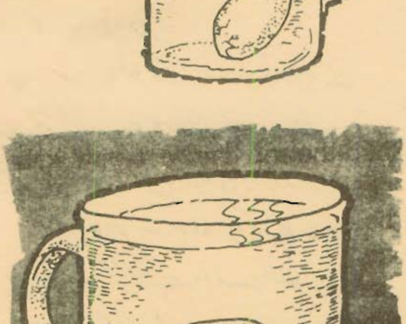

عقیل عبّاس جعفری

گنی چُنی مُعلُومات

اعداد کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ دُنیا کی اہم شخصیات ہوں یا بڑے بڑے واقعات، الف سے یے کا تعلق کسی نہ کسی طرح اعداد سے ضرور بنتا ہے۔ اعداد کے حوالے سے دُنیا بھر کی اہم معلومات پر مبنی یہ سلسلہ ہم ہر ماہ آپ کی دلچسپی اور معلومات میں اضافے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ صفر سے شروع ہونے والا سلسلہ دیکھیے کہاں تک جاتا ہے۔

(۴۰)

- بعثت کے وقت حضورِ اکرمؐ کی عمرِ مبارک ۴۰ برس تھی۔
- سورۂ بقرہ قرآنِ پاک کی طویل ترین سورت ہے۔ اس سورت میں ۴۰ رکوع ہیں۔
- حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمرِ مبارک ۴۰ برس تھی۔
- عیسائی مذہب میں چالیس دن کے جو روزے رکھے جاتے ہیں انھیں LENT کہتے ہیں۔
- ایک سال میں انسانی دل چالیس ملین مرتبہ دھڑکتا ہے۔
- گھوڑے کے منہ میں چالیس دانت ہوتے ہیں۔
- ۴۰- درجہ سینٹی گریڈ ۴۰- درجہ فارن ہائیٹ کے مساوی ہوتا ہے۔
- ایک عام آدمی، رات بھر میں اوسطاً ۴۰ مرتبہ کروٹ بدلتا ہے۔
- روس کی مشہور ملکہ کیتھرائن اعظم چالیس برس کی عمر میں تخت نشین ہوئی تھی۔
- شتر مرغ ۴۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔

(۴۱)

- زمین سے چاند کا ۴۱ فیصد حصّہ کبھی نظر نہیں آتا۔ یہ حصّہ امریکہ کے صرف ۲۱ خلا بازوں نے دیکھا ہے۔
- کمال اتاترک جب ترکی کے صدر بنے تو ان کی عمر ۴۱ برس تھی۔

○ قائدِ اعظمؒ کی میت کو تدفین سے پہلے ۴۱ توپوں کی سلامی دی گئی تھی۔

○ کولمبس نے امریکہ اور کیپٹن جیمز کک نے آسٹریلیا دریافت کیا۔ دونوں نے یہ کارنامہ ۴۱ برس کی عمر میں انجام دیا۔

○ اگر انسانی جسم کا درجۂ حرارت ۴۱ درجہ سینٹی گریڈ ہو جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

○ رڈیارڈ کپلنگ ادب کا نوبل انعام حاصل کرنے والے دنیا کے سب سے کم عمر شخص تھے انہوں نے یہ انعام ۴۱ برس کی عمر میں حاصل کیا تھا۔

○ مریخ کا دن زمین کے دن سے ۴۱ منٹ بڑا ہوتا ہے۔

○ مشہور سیاح مارکو پولو مشرقِ بعید کی سیاحت کے بعد وطن واپس لوٹا تو اُس کی عمر ۴۱ برس تھی۔

○ چھلانگ لگاتے وقت کنگارو کی رفتار ۴۱ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

○ ۱۹۸۱ء میں جان میکنرو کے ہاتھوں شکست کھانے سے پہلے ٹینس کے سویڈش چیمپئن بورون بورگ نے ۴۱ میچ مسلسل جیتے تھے۔

۴۲

○ دنیا کا مصروف ترین ایئرپورٹ شکاگو کا او ہیر فیلڈ ایئرپورٹ ہے۔ جہاں ہر ۴۲،۳۵ سیکنڈ کے بعد کوئی جہاز اُترتا

○ ہے یا پرواز کے لیے پَر تولتا ہے۔

○ مشہور فرانسیسی ادیب سو پساں کا انتقال ۴۲ برس کی عمر میں ہوا تھا۔

○ مجلسِ اقوام (لیگ آف نیشنز) کے ارکان کی تعداد ۴۲ تھی۔

○ مشہور گلوکار ایلوس پریسلے کا انتقال ۱۹۷۷ء میں ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۴۲ برس تھی۔

○ تھیوڈور رُوز ویلٹ کی عمر صرف ۴۲ برس تھی جب وہ امریکہ کا صدر بنا۔ وہ امریکہ کا سب سے کم عمر صدر تھا۔

○ دنیا بھر میں نابینا افراد کی تعداد ۴۲ ملین ہے۔

○ مشہور اسکاٹ سیاح ڈیوڈ لونگ اسٹون نے ۴۲ برس کی عمر میں وکٹوریہ آبشار دریافت کی تھی۔

○ نیپال اور بھوٹان میں مردوں کی اور گنی، مالی، ماریطانیہ، نائیجیریا، سینیگال، جنوبی یمن اور صومالیہ میں عورتوں کی اوسط عمر ۴۲ سال ہے۔

○ مشہور امریکی اداکار ال جوسن نے دنیا کی پہلی متکلم فلم دی جاز سنگر میں ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۴۲ برس تھی۔

○ کتے کے منہ میں ۴۲ دانت ہوتے ہیں۔

(۴۳)

- ظہیرالدین بابر نے جب ہندوستان فتح کیا تو اُس کی عمر ۴۳ برس تھی۔
- صحرائے صحارا میں دن کے وقت اوسط درجہ حرارت ۴۳ درجے سینٹی گریڈ ہوتا ہے۔
- ۴۳ برس کی عمر میں انگریزی کا مشہور شاعر جان ملٹن مکمل طور پر نابینا ہو چکا تھا۔
- دادا صاحب پھالکے نے جب ۱۹۱۳ء میں برِصغیر کی پہلی فیچر فلم راجہ ہریش چندر بنائی تو ان کی عمر ۴۳ برس تھی۔
- انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے تازہ ترین ایڈیشن میں جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے ۴۴ ملین الفاظ اور ۲۴ ہزار تصاویر ہیں۔
- شرلاک ہومز کی کہانیوں کا ۴۳ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے جنہیں ایسپرانٹو اور بریل بھی شامل ہیں۔
- دنیا کی پہلی خاتون صدر ارجنٹائن کی مسز میریا اسٹیلا پیرون تھیں۔ وہ جب اس عہدے پر فائز ہوئیں تو ان کی عمر ۴۳ برس تھی۔
- کیمیائی وزن کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بھاری دھات اریڈیم ہے۔ جس کا وزن سب سے ہلکی دھات لیتھیم سے ۴۴ گنا زیادہ ہوتا ہے۔
- ہارون رشید کا انتقال ۸۰۹ء میں ہوا۔ اس وقت اُن کی عمر ۴۳ برس تھی۔
- پشتو زبان میں ۴۴ حروف تہجی ہوتے ہیں۔

(۴۴)

- دوسری عالمی جنگ کے دوران امریکہ اور جاپان ایک دوسرے کے ساتھ ۴۴ ماہ تک برسرِ پیکار رہے۔
- سیّد احمد شہید جب ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہوئے تو ان کی عمر ۴۴ برس تھی۔
- گھڑی کی سوئیاں ۲۴ گھنٹے میں ۴۴ مرتبہ زاویہ قائمہ بناتی ہیں۔
- آئن فلیمنگ نے جیمز بانڈ کے کردار پر مشتمل اپنی پہلی کتاب ۴۴ برس کی عمر میں تحریر کی تھی۔
- روسی زبان کے مشہور ادیب انطون چیخوف کا انتقال تپ دق کے مرض میں ۱۹۰۴ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۴۴ برس تھی۔
- سعودی عرب میں مردوں کی اوسط عمر ۴۴ سال ہوتی ہے۔
- بدنامِ زمانہ اطالوی مفکر میکیاولی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب دی پرنس ۱۵۱۳ء میں لکھی تھی۔ اس وقت اس کی عمر ۴۴ برس تھی۔
- لندن کا مشہور سینٹ پال کیتھیڈرل، لندن کی آتش زدگی ۱۶۶۶ء کے ۴۴ برس بعد (۱۷۱۰ء) میں مکمل ہوا تھا۔

- ملکہ الزبتھ اوّل نے برطانیہ پر ۱۵۵۸ء سے ۱۶۰۳ء تک ۴۴ برس حکومت کی ۔
- قدیم یونان کے مشہور ادیب ارسٹوفینز نے ۴۴ ، ڈرامے تخلیق کیے تھے ۔

(۴۵)

- مواخات کے وقت مہاجرین کی تعداد ۴۵ تھی ۔
- دنیا کا پہلا ٹیسٹ میچ ۱۸۷۷ء میں انگلستان اور آسٹریلیا کے درمیان کھیلا گیا تھا ۔ آسٹریلیا نے ۴۵ رنز سے جیتا تھا ۔ حیرت انگیز اتفاق کی بات یہ ہے کہ جب ۱۹۷۷ء میں اس ٹیسٹ میچ کی یاد میں صد سالہ میچ کھیلا گیا تو وہ بھی آسٹریلیا نے ۴۵ ، رنز سے جیتا تھا ۔
- جب نپولین نے جنگ واٹرلو میں شکست کھائی تو اُس کی عمر ۴۵ برس تھی ۔
- پاکستان کے پرچم پہ ہلال ۴۵ ، درجے پر جھکا ہوا ہے ۔
- ا سے ۹ تک کے ہندسوں کا مجموعہ ۴۵ ہوتا ہے ۔
- باسکٹ بال میں باسکٹ کا قطر ۴۵ سینٹی میٹر ہوتا ہے ۔
- ۲۵ ، مئی ۱۹۳۵ء کو امریکی ایتھلیٹ جیسی اوونز نے صرف ۴۵ منٹ میں دوڑ کے چھ عالمی ریکارڈ قائم کیے تھے ۔
- دنیا کی پہلی دوربین ۱۶۰۹ء میں گلیلیو نے بنائی ۔ اس وقت اس کی عمر ۴۵ ، برس تھی ۔
- بنگلہ دیش میں مردوں کی اور بھارت میں عورتوں کی اوسط عمر ۴۵ برس ہے ۔
- بحرالکاہل کا رقبہ دنیا کے تمام سمندروں کے مجموعی رقبے کا ۴۵.۷۷ % ہے ۔

جانوروں کی عمریں

یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ عمر کے اعتبار سے جانوروں کو انسانوں پر سبقت حاصل ہے کیونکہ انسان زیادہ سے زیادہ ساٹھ برس یا بیاسی سال زندہ رہتا ہے ۔ جبکہ بعض جانور "صدیوں" زندہ رہتے ہیں ۔ ایسے ہی جانوروں میں مگرمچھ بھی شامل ہے ۔ جس کی عمر تین سو برس ہوتی ہے ۔ سانپ سو سال مزے سے جی لیتے ہیں ۔ بڑے سائز کے ہاتھی اور طوطے انسانوں جتنی عمر رکھتے ہیں ۔ ہاتھی اور طوطے دونوں ساٹھ یا ستر برس کی عمر پاتے ہیں ۔ جبکہ کچھ جانور تو انسانوں سے بھی کہیں کم عمریں پاتے پاتے ہیں ۔ جیسے کتّا اور بلی پندرہ برس جبکہ گھوڑا صرف پچیس برس زندہ رہتا ہے ۔

پلاٹینم

پلاٹینم ایک انتہائی قیمتی اور کمیاب دھات ہے ۔ یہ اپنی رنگت کے اعتبار سے سفید ہوتا ہے ۔ زیورات کی تیاری میں اس دھات کا استعمال عام ہے ۔ اس اہم دھات کو مشینری اور کیمیائی استعمال کے آلات کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ پلاٹینم کو دنیا کی سب سے قیمتی دھات سمجھا جاتا ہے ۔

قرآنِ پاک

مرسلہ: محمد نوید مرزا

، لاھور

جس پہ جنّ و انس کا ایمان ہے
وہ ضیائے زندگی قرآن ہے
یہ ہدایت کا ہے اِک روشن چراغ
اس سے نُورِ ذات کی پہچان ہے
اس سے تابندہ حروفِ بخت ہیں
اس سے حاصل وقت کا عرفان ہے
اس نے بخشیں آگہی کی منزلیں
اس کا ہم پر کس قدر احسان ہے
لوحِ دِل میں کیوں نہ یہ محفوظ ہو
مال ہے، دولت ہے، میری جان ہے
بھُول بیٹھا ہے جو قرآنِ خدا
خُود سے وہ بھٹکا ہُوا انسان ہے

خودغرض دوست

آصف اقبال، ناظم آباد کراچی

ایک نہایت خوبصورت خرگوش اپنے دوستوں بکرے، گائے اور چوہے کے ہمراہ ایک گھنے جنگل میں رہتا تھا۔ وہ آپس میں گہرے دوست تھے۔ اور وعدہ کرتے کہ ہم مشکل کے وقت ایک دوسرے کی مدد کیا کریں گے۔

ایک صبح خرگوش غذا کی تلاش میں جا رہا تھا کہ راستے میں شکاری کتوں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ خرگوش

بہت گھبرایا اور اُس نے سوچا کہ اپنے دوست بکرے سے مدد مانگنی چاہیے۔ وہ بکرے کے پاس پہنچا اور مدد مانگی تو بکرے نے کہا "میرے پیر میں بہت درد ہے اس لیے میں تمہاری مدد نہیں کرسکتا"۔ خرگوش دوڑتا ہوا گائے کے پاس پہنچا اور سارا واقعہ بیان کیا۔ گائے نے کہا "میں معافی چاہتی ہوں یہ وقت میرے دودھ دینے کا ہے - میں تمہاری مدد نہیں کرسکتی"۔ اب خرگوش اپنے آخری دوست چوہے کے پاس گیا تو چوہے نے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ "مجھے کتوں سے بہت ڈر لگتا ہے - میں تمہاری مدد نہیں کرسکتا"۔ اب کتے خرگوش کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ خرگوش نے فیصلہ کیا کہ اپنی مدد خود کرنی چاہیے - وہ تیزی سے دوڑتا ہوا ایک غار میں جا کر چھپ گیا اور شکاری کتوں سے اپنی جان بچائی۔

پھر ہوا یوں....

خالد ریاض ساھی، حافظ آباد

کسی گاؤں میں ایک جولاہا رہا کرتا تھا۔ جس کا نام کمال تھا۔ وہ بہت ہی غریب تھا۔ اس کے چار بچے تھے۔ اس وجہ سے اُسے زیادہ محنت کرنا پڑتی تھی۔ اچھی خوراک نہ ہونے اور زیادہ محنت کے باعث وہ اکثر بیمار رہتا۔ آج بھی اُسے سخت بخار تھا اور اُس کی حالت سخت خراب ہو رہی تھی۔ بخار کے سبب اس کی یادداشت بھی خاصی کمزور ہو چکی، اِدھر بات سنتا اُدھر بھول جاتا۔ بڑی مشکل سے کمال عرف کاموں۔ ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ جس کا کلینک شہر میں تھا۔ کاموں کا گاؤں شہر سے چھ سات میل کے فاصلہ پر تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کمال کی نبض دیکھی اور دوائی تجویز کر کے دے دی اور ساتھ ہی استعمال کرنے کا طریقہ لکھ دیا اور بتایا کہ کھچڑی کھانا واپس جاتے ہوئے کاموں نے سوچا کہ کہیں بھول نہ جاؤں اس لیے کھچڑی آ، کھچڑی آ کا ورد بلند آواز سے شروع کر دیا جو تھوڑی دور جانے کے بعد خود بخود ہی کھاچڑیا، کھاچڑیا میں تبدیل ہو گیا۔ الغرض کاموں کھاچڑیا بلند آواز سے کہتا ہوا اپنے گاؤں کی طرف رواں دواں تھا۔ راستے میں ایک کھیت آگیا۔ اس کی فصل پک چکی تھی۔ کسان فصل میں چڑیاں اُڑا رہا تھا۔ جب کسان نے کاموں کی زبان سے یہ الفاظ سُنے تو اُس کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے کاموں کو غُصّے سے دیکھتے ہوئے کہا بے وقوف آدمی میں تو چاہتا ہوں کہ چڑیاں فصل کو خراب نہ کریں اور تو میرا نقصان کرنے کا خواہاں ہے۔ خبردار اگر آئندہ تو نے یہ الفاظ زبان سے نکالے.... اگر خیریت چاہتا ہے تو یوں کہہ کہ اُڑجا چڑیا۔ اُڑجا چڑیا۔ کاموں بے چارہ اُڑجا چڑیا، اُڑجا چڑیا کے الفاظ بلند آواز سے دہراتا ہوا جا رہا تھا کہ راستے میں ایک چڑی مار جال بچھائے بیٹھا تھا۔ اُس نے کاموں کو یہ کہتے سُنا تو پہلے اس کی مرمت کی اور پھر کہا تجھے شرم نہیں آتی کہ مجھ غریب کی روزی پر لات مارتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ چڑیاں پھنسیں تو

کہتا ہے اُڑ جا چڑیا۔ خبردار آئندہ یہ الفاظ زبان سے مت نکالنا۔ البتہ تو یہ کہتا ہُوا جا کہ پکڑی جاؤ۔ پکڑی جاؤ۔ چنانچہ بے چارہ کاموں پکڑی جاؤ۔ پکڑی جاؤ کے الفاظ دہراتا ہوا جا رہا تھا۔

اب یہ کاموں کی بدقسمتی سمجھ لیں کہ آگے، ایک جگہ پر کسی گھر کو ڈاکو لوٹ رہے تھے اور گھر کا سارا سامان گٹھڑیوں میں باندھ کر بھاگنا چاہتے تھے۔ اب جو انہوں نے کاموں کی آواز پکڑی جاؤ پکڑی جاؤ سُنی تو بہت گھبرائے۔ پھر طیش کے عالم میں کاموں کی پٹائی کر ڈالی اور پھر اُسے سمجھایا کہ اب یہ الفاظ دہراتے ہوئے جاؤ، ایک پہنچاؤ دوسری لے آؤ۔ یعنی ایک گٹھڑی پہنچاؤ اور دوسری لے آؤ۔ کاموں نے ڈاکوؤں کی ہدایت کے مطابق ان الفاظ کا وِرد بلند آواز سے شروع کر دیا۔

یہی الفاظ دہراتا ہُوا جب اگلے گاؤں میں داخل ہوا۔ تو لوگ جنازہ لے کر جا رہے تھے۔ کچھ لوگ کلمۂ شہادت کا وِرد کر رہے تھے اور کچھ رو رہے تھے۔ جب انہوں نے کاموں کے الفاظ سُنے تو اُنھیں بہت دُکھ ہُوا میّت کے لواحقین میں سے ایک نے تو اس کو مارا بھی۔ اور سمجھایا کہ بے وقوف تو کہہ کہ یہ وقت کسی پر بھی نہ آئے وہاں سے مار کھا کر اور ہدایات پلّے باندھ کر کاموں اپنے گاؤں میں داخل ہوا، آج گاؤں میں اس کے پڑوسی کے لڑکے کی شادی ہو رہی تھی اور لڑکے کی بارات، جا رہی تھی مگر کاموں اپنی دائمی بے وقوفی کے سبب بلند آواز سے پکار رہا تھا کہ "یہ وقت کسی پر بھی نہ آئے، یہ وقت کسی پر بھی نہ آئے"۔ سارے باراتیوں نے اُسے سخت سُست کہا کاموں کی بیوی نے بھی سُنا تو اُس کو بھی بہت غصّہ آیا۔ چند لوگوں نے اُسے آرام سے چارپائی پر لٹا دیا اور اُس سے شروع سے رام کہانی سُنی۔ اُنہیں معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر نے کھچڑی کھانے کو کہا۔ جو اس نے کھا چڑی سمجھ لیا۔۔۔ اور یہ اس انجام کو پہنچا۔

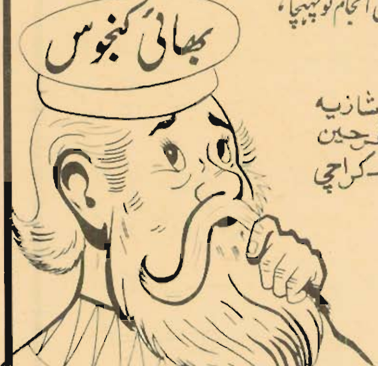

شازیہ فرحین
—کراچی

اپنے بھائی بڑے کنجوس
یعنی پورے مکھّی چُوس
کبھی کسی کو کچھ نہ دیا!
اوروں سے پر بہت لیا
روزانہ کنگھا نہ کریں
ماہ بہ ماہ کپڑے بدلیں
گھر آنے والے مہمان
اُن کی نظروں میں شیطان
گر کوئی پانی بھی پیئے
دل میں ان کے بہت کھلے
بُخل کی اک تصویر ہیں یہ
کنجوسوں کے پیر ہیں یہ

۱۳ سوال

(احمد جلیانی ناگن چورنگی کراچی)

۱۔ راشد کی بیوی راشدہ کا ایک ہی بھائی ہے جس کا نام ارشد ہے۔ ارشد، ارشاد کا ماموں ہے۔ بتائیے راشد اور ارشاد میں کیا رشتہ ہے؟

۲۔ وہ کیا چیز ہے جس کے گرنے سے چوٹ نہیں لگتی؟

۳۔ ذرا جلدی سے بتائیے آپ سو کر اٹھنے سے پہلے کیا کرتے ہیں؟

۴ کون دن میں کئی مرتبہ شیو بناتا ہے؟

۵ سونے پر زنگ لگ جائے تو کس طرح دور کیا جاتا ہے؟

۶۔ کولمبس نے دنیا کے گرد تین چکر لگائے انہی میں سے کسی ایک چکر کے دوران اس کا انتقال ہو گیا۔ بتائیے اس کا انتقال کس چکر کے دوران ہوا؟

۷۔ اسپتالوں میں کیا ہمیشہ لیا جاتا ہے لیکن پھر بھی غائب نہیں ہوتا؟

۸۔ ذرا جلدی سے بتائیے جہانگیر، شاہجہاں کے باپ کا کیا تھا؟

۹۔ کس کے پاس ہزاروں سوئیاں ہیں مگر وہ سی نہیں سکتا؟

۱۰۔ آپ نے ہزماسٹرز وائس کے مونوگرام پر بنی ہوئی یہ تصویر بارہا دیکھی ہو گی۔ بتائیے یہ تصویر کتے کی ہے یا کتیا کی؟

۱۱۔ وہ کیا چیز ہے جس کی ہر جگہ ضرورت ہوتی ہے، کچھ لوگ دیتے ہیں کچھ مانگتے ہیں مگر لیتے نہیں؟

۱۲۔ وہ کون سا لفظ ہے جو ہمیشہ غلط بولا جاتا ہے؟

۱۳۔ کون شخص کام کے دوران سیٹیاں بجاتا ہے۔

جوابات

۱۔ باپ بیٹے کا۔
۲۔ بارش
۳۔ سوتے ہیں
۴۔ حجام
۵۔ سونے پر زنگ نہیں لگتا۔
۶۔ ظاہر ہے تیسرے چکر کے دوران ہی ہوا ہو گا اور تیسرا چکر بھی نامکمل تھا۔
۷۔ درجۂ حرارت
۸۔ نام
۹۔ جنگلی چوہا یا سیہہ
۱۰۔ کتے کی، کیونکہ مونوگرام پر ہز

کے الفاظ تحریر ہیں۔

۱۱۔ مشورہ

۱۲۔ غلط

۱۳۔ ٹریفک پولیس مین یا ریفری

ہمسائے

صبوحی بانو ـــــ کراچی

آج سال کا پہلا دن تھا فاطمہ اور سعد کی امّی نے سوچا۔ سال کا پہلا دن ہے۔ مُرغ کا سالن اور پلاؤ پکا لیتی ہوں تاکہ مل بیٹھ کے سب کھا سکیں۔ یہ سوچ کر انھوں نے اپنے خانساماں کو آواز دی اور کھانے کا حکم دے کر ابھی بیٹھی ہی تھیں کہ سعد دوڑا دوڑا آیا۔

"امّی! مجھے کچھ پیسے دے دیں میں سال کا نیا کیلنڈر لے آؤں۔"

امّی جان نے اُسے پیسے دیتے ہوئے تاکید کی کہ تصویروں والے کیلنڈر مت لانا۔ اس سے گھر میں فرشتے نہیں آتے۔ سعد "اچھا امی جان" کہتا ہوا چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد جیسے ہی امّی دروازہ بند کرنے کے لیے اُٹھیں، دیکھا کہ اُن کی ہمسائی رشیدہ ہاتھ میں مٹّی کا پیالہ لیے کھڑی ہے۔

"بی بی جی سلام!" رشیدہ نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ امّی ابھی سلام کا جواب دینے کا ارادہ کر ہی رہی تھیں کہ یکایک اُن کو خیال آیا، خانساماں کھانا تیار کرتے کرتے کھانا خراب نہ کر دے۔ یہ سوچ کر وہ تیزی سے چلی گئیں۔ رشیدہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ کافی دیر بعد جب وہ کچن سے آئیں تو دیکھا کہ اب بھی رشیدہ ویسے ہی کھڑی ہے۔

"کیا بات ہے کیوں کھڑی ہو؟" انھوں نے پوچھا۔

"بی بی جی!" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ شاید وہ امّی کا خشمگیں چہرہ دیکھ کر مرعوب ہوگئی تھی۔

"جلدی سے بات کرو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" امی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"وہ جی پیسے نہیں ہیں۔ میرے بچے بھوک سے رو رہے ہیں تھوڑا سا سالن ہو تو عنایت فرما دیں۔"

"سالن؟" امی نے منہ بگاڑ کر کہا۔ "میں کیا تمھارے سالن کے لیے بیٹھی ہوں۔ کوئی سالن والن نہیں ہے جاؤ یہاں سے۔ بے حیاؤں کو مانگتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی۔" یہ کہتے ہوئے وہ کھٹ کھٹ کرتی چلی گئیں۔

رشیدہ کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ "آہ غریبی!..." اُس نے دل میں سوچا۔ اُس کی وجہ سے کیا کچھ سُننا پڑا۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئی۔

سعد کی بہن فاطمہ اپنے کمرے میں بیٹھی سب کچھ دیکھ اور سُن رہی تھی۔ امی جان اُس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں "فاطمہ! تم نے دیکھا۔ ان لوگوں کو شرم بھی نہیں آتی مانگتے وقت باسی ہوتا تو دے بھی دیتی۔ مگر میں تو تازہ مُرغی کا سالن پکوا رہی ہوں بھلا کیسے دے دیتی۔ میں نے بھی اس کو ایسا جواب دیا ہے کہ اب کبھی نہیں آئے گی۔" امی نے مُسکراتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا۔

فاطمہ نے کہا: "مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے آپ نے اُسے جھڑک کر اُس کے دل کو ٹھیس پہنچائی اور خداوند کریم کو ناراض کیا۔ آپ آج مجھے کھانے کو نہ دیں بلکہ رشیدہ آپا کو بھجوا دیں۔"

"تمھارا کھانے کو جی نہیں چاہتا تو مت کھاؤ کون تمھیں زبردستی کھلا رہا ہے تمھارا باپ لوگوں کے لیے نہیں کما تا پھرتا۔" امیّ نے بے حد غصّے سے کہا۔ جواباً فاطمہ خاموش رہی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

سعد کو صحن میں گھومتا دیکھ کر امیّ جان اس سے بولیں "بیٹے! کیلنڈر لے آئے؟"

"جی ہاں، لے آیا ہوں یہ دیکھئے اس پر حدیث ہے کہ وہ شخص ایمان نہیں رکھتا، جو خود تو پیٹ بھر کر کھا لے اور اُس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا سو جائے!"

یہ سُنتے ہی امیّ جان شرم سے پانی پانی ہوگئیں اور کہا "وہ محمدؐ، جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں ابھی ابھی اُن کے فرمان کے خلاف میں نے عمل کیا میرے خدا میں کتنی گنہگار ہوں کہ میری ہمسائی دانے دانے کو ترسے اور میں قورمہ پلاؤ اُڑاؤں صرف پانچ نمازیں اور روزے رکھ کر جنت میں جانے کی اُمید رکھوں۔" پھر انھوں نے فاطمہ کو آواز دی اور کہا: "جلدی سے رشیدہ کو ایک تھال پلاؤ اور ایک ڈونگہ سالن کا بھیج دو۔" فاطمہ کو تو جیسے قارون کا خزانہ مل گیا۔ وہ حیرت اور خوشی سے ماں کا منہ دیکھنے لگی۔

"جلدی کرو بیٹی! دیکھ کیا رہی ہو خدا جانے میرے اس سلوک کی وجہ سے اس بے چاری پر کیا گزری ہوگی۔" یہ سُن کر فاطمہ پھولی نہ سمائی اور تمام چیزیں سجا کر رشیدہ آپا کو دینے کے لیے چل دی۔

سواری بس کی

فوقیہ مشتاق
کراچی

اللہ کے فضل و کرم سے ہم بس کی سواری سے اب تک کسی نہ کسی طرح محفوظ رہتے آئے تھے، مگر پھر ایک دن بد قسمتی سے ہمارے ساتھ بس کی سواری کا اندوہناک سانحہ پیش آ ہی گیا، جب ہمیں اپنی ایک عزیز ترین سہیلی کے گھر اس کی سالگرہ میں جانا تھا۔ چھوٹے بھائی جان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں ڈراپ کر دیں گے مگر جب ہم بالکل تیّار ہو گئے تو معلوم ہوا کہ بھائی جان ہمیں دھوکہ دے کر کار اُڑا لے گئے ہیں۔

"اب کیا ہو گا سونیا! ہمیں جانا تو ضرور ہے۔" ہم نے منہ بسورتے ہوئے اپنی کزن سے کہا۔

"ہاں تو چلتے ہیں۔"

"مگر کیسے؟"

"بس سے!" سونیا بڑے اطمینان سے بولی۔

"سونیا! تم میری سہیلی ہو تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم مصیبت کے وقت بھی مذاق کرو۔" ہم غصے سے بولے، مگر پھر کافی بحث و مباحثے کے بعد مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق یہ سوچ کر جانے پر رضا مند ہو گئے کہ چلو تجربہ ہی ہو جائے گا۔ ہمیں بس کس طرح ملی اور کس طرح ہم سوار ہوئے؟ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ مگر بس میں سوار ہو جانے کے بعد ہم سوچنے لگے کہ ہم نے غلطی کی۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ سونیا نے ہمیں بازو سے پکڑ کر سیٹ پر دھکیل دیا اور خود بھی بیٹھ گئی ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے اتنی ساری عورتوں کو کس طرح جگہ دے دیا؟ اگلے اسٹاپ تک رش ذرا کم ہو گیا۔

"اے کم بخت! نجر (نظر) لگا دی۔ کیلا گر گیا میرے منّے کا!" سامنے بیٹھی ہوئی عورت نے کس کو کہا، ہم سمجھ نہ سکے۔

"میں تجھ سے کہہ رہی ہوں۔ اے تو نے نجر لگا دی کیلا گر گیا۔" اب ہم سمجھے، وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اصل میں ہم سوچ میں اتنے مگن تھے کہ اس طرف ہمارا خیال ہی نہیں گیا کہ ہماری آنکھیں اس بچے پر جمی تھیں، جو کیلا کھا رہا تھا، مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ ہم نے اُس کے کیلے پر نظر لگا دی۔ اب اس عورت کا بچہّ زور زور سے رونے لگا۔

"اے منحوس! تو نے نجر لگا دی میرے مُنّے کا کیلا گرا دیا۔" اب دوسری عورتیں بھی متوجّہ ہو گئی تھیں۔

"دیکھیے، آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ یہ نظر ذظر کیا

ہوتا ہے ۔" ہم غصّے سے بولے ۔

"اے تو نے نجر لگائی ہے، کیلے پر۔" اب تو ہمارے غصّے کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ہم نے چلّا کر کہا "ہم کوئی آپ کو ایسے ویسے نظر آرہے ہیں جو آپ کے بچّے کے کیلے پر نظر لگا دیں گے ۔"

"اے اور کیا ! کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیلے کو دیکھ رہی تھی ۔"

"شٹ اپ !" ہم اتنے زور سے چلّائے کہ پیچھے بیٹھے لوگ بھی متوجّہ ہو گئے ۔

"اے پرکٹی ! اپنی انگریجی سے ہم پر رُعب مت ڈال تو نے کیلے کا نخصان (نقصان) تو کرا دیا نا۔۔۔ میرا منّا رو رہا ہے ۔"

"جہنّم میں گیا آپ کا منّا ! یہ پکڑو کیلے کے روپے۔" ہم نے بیگ سے پانچ روپے نکال کر اُس کے منہ پر دے مارے ۔"اور اب اگر بک بک کی تو۔۔۔" جملہ مکمّل ہونے سے پہلے ہی سونیا نے پکڑ کر ہمیں بٹھا دیا ۔

"تم کیوں اس کے منہ لگ رہی ہو ۔ چُپ ہو جاؤ۔ خواہ مخواہ تماشا بننے سے کیا فائدہ ؟" ایک مرتبہ پھر بس میں بھیڑ ہو گئی اور ہمارا موڈ آف ہونے لگا ۔ ایک محترمہ مسلسل ہم پر نوّے درجے کا زاویہ بنا کر جھکتیں اور ان کا بچّہ ہمارے بھورے بالوں کو مُٹھی میں دبوچ لیتا اور وہ بتیسی نکال کر کہتیں "میرے گڈّو کو باجی کے بال پسند آ گئے ہیں !" ہم نے جل کر سوچا ۔ پسند آ گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سر پر ایک بال نہ چھوڑو ۔ جب ساتویں بار اُس نے یہی حرکت کی تو ہم سے رہا نہ گیا ۔ سونیا سے بولے "ان کو بٹھا دیتے ہیں ورنہ ان کا لاڈلا مجھے گنجی کر دے گا۔" جس پر سونیا نے مضبوطی سے ہمارا ہاتھ پکڑا اور کہا "خبردار ! ایک اِنچ نہ ہلنا ورنہ تم تو بس کی کھڑکی سے پار ہو جاؤ گی ۔"

"میرا گڈّو، باجی کی گود میں بیٹھے گا ۔" اُن محترمہ نے نہایت بے تکلّفی سے اپنے بچّے کو ہماری گود میں بٹھانا چاہا ۔

"نہیں۔۔۔ نہیں" ہماری چیخ نکل گئی "ایسا نہ کیجئے" ہم نے اُن کے بچّے کو پرے کرتے ہوئے کہا ۔ جس پر وہ چراغ پا ہو گئیں ۔

"اے شکل اچھی ہونے اور کپڑے اچھے پہن لینے سے کیا ہوتا ہے ذرا سی بھی انسانیت نہیں ہے ۔ انسان کا بچّہ ہے اس سے نفرت کیسی ؟ نہ جانے کیا پڑھتی ہیں، آج کل کی لڑکیاں ۔ پکڑو اس کو، گر جائے گا ۔" ہم نے سوچا بات تو ٹھیک ہے انسانوں سے کیا نفرت اور یہ طبقاتی نظام بھی تو ہمارے ہی بنائے ہوئے ہیں ہم نے ان کے بچّے کو گود میں لے لیا اور جبراً مُسکرا کر کہا "دراصل بات یہ ہے کہ ہم نے کبھی کسی چھوٹے بچّے کو گود میں نہیں لیا، نا اس لیے۔۔۔" مگر اگلے ہی لمحے۔۔۔ اپنی اس عظیم غلطی کا ہمیں احساس ہو گیا جب اُن کے لاڈلے گڈّو نے اپنا منہ کھولا ایک جماہی لی اور اس کے منہ کا دودھ قے کی شکل میں ہماری قمیض اور دوپٹے کو تر کر گیا ۔

"آخ تھو ۔" ہم گھبرا کر کھڑے ہو گئے "پکڑ لیجئے اسے ۔" ہم نے ان کے بچّے کو غصّے میں انھیں واپس تھما دیا ۔ ہمارا دِل چاہ رہا تھا، اپنا سر پیٹ لیں ۔ اپنے پرس سے ٹشو پیپر نکال کر صاف کیا لیکن وہ صاف ہونے والی

پچیز ہی نہیں تھی، جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر، یہی سوچ کر ہم آنے والے ہر مصیبت کے لیے سر تھامے تیار بیٹھے تھے کہ پہاڑ کا تودا ہم پر آن گرا۔ بس یہی ایک کسر باقی تھی وہ بھاری بھرکم محترمہ نہ صرف ہم پر گریں، بلکہ ان کے ہاتھ سے تیل کا برتن چھوٹا اور ہمارے بالوں اور چہرے کی سیر کرتا ہماری گردن تک آگیا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ جہاں انھوں نے ہمارے چھوٹے چھوٹے بالوں کو تھام کر سہارا لینا چاہا، وہیں پوری قوت سے ہمارے نازک پیروں کی چٹنی بھی بنا ڈالی۔ اُف خدایا! ساری کسر آج ہی نکلنی تھی۔ ہم نے کبھی اپنے بالوں پر تیل نہیں لگایا تھا۔ مگر اس وقت ہمارے چھوٹے چھوٹے بال ہمارے چہرے اور گردن سے بُری طرح چپک گئے تھے۔ کہتے ہیں مصیبت بتا کر نہیں آتی اور جب آتی ہے تو آتی ہی چلی جاتی ہے اور اس وقت بھی یہی ہُوا۔ جب برابر بیٹھی ہوئی عورت کے لڑکے نے ہمارے ستاروں سے جھلملاتے اور تیل میں بھیگے دوپٹے کو کونے سے پکڑ کر کھینچا اور ہمارا دوپٹہ دو بالشت تک دو حصّوں میں تقسیم ہوگیا۔

"یہ کیا کیا تم نے! ہم تمھیں اُٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔" ہم غصّے میں چلّائے۔ "اے ہے۔ بڑی آئی باہر پھینکنے والی! بچّہ ہی تو ہے... معصوم... ناسمجھ!"

"یہ... یہ معصوم اور ناسمجھ ہے۔ گدھا کہیں کا! نہ جانے اتنے سارے بچّوں کو لے کر کیسے بس میں سفر کرتی ہیں۔ جاہل...!"

"اے اپنی شکل دیکھ۔ تیلی کہیں کی...!"

"بکواس...!"

"خدا کے لیے بس کرو۔ تمھیں کیا ہوگیا ہے کیوں جاہلوں کی طرح لڑ رہی ہو۔ تم تو اونچی آ۔ زیں بنی تک نہیں تھیں۔ تمھیں ہو کیا گیا ہے؟"

"مجھے کیا ہوگیا ہے... میرا ستیاناس کردیا ہے ان عورتوں کے بچوں نے!" ہم بے بسی سے رونے والے انداز میں بولے۔

"اے ماسی! ٹکٹ لاؤ۔" کنڈیکٹر کے ماسی کہنے پر ہمارا بلڈ پریشر ایک دم ہائی ہونے لگا مگر اگلے ہی لمحے ایک دم لو ہوگیا۔ کیونکہ جب پیسے نکالنے کے لیے ہم نے ہینڈ بیگ اُٹھانا چاہا تو نہ وہاں ہمارا بیگ تھا اور نہ ہی وہ گفٹ، جو ہمیں سالگرہ پر دینا تھا۔

"کیا ہوا۔ ٹکٹ لو نا!" سونیا نے ہمارا شانہ ہلایا

"سونیا! ٹکٹ تم لے لو..." اُس نے ٹکٹ لیا پھر پلٹ کر بولی۔ "میرا پرس نکال دو اپنے بیگ سے" اس کی یہ بات سُن کر ہمارا دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگ جائیں۔

"سونیا! پلیز اس بس سے یہیں اُتر جاؤ۔"

"ارے بس اگلا اسٹاپ ہی تو ہے۔" سونیا نے کہا اور اپنے اسٹاپ پر اُترنے کے لیے جب ہم کھڑے ہوئے تو معلوم ہوا کہ صرف ہمارا پیر ہی زخمی نہیں ہوا تھا بلکہ ہماری نازک سینڈل بھی کئی حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ خیر کسی طرح بس سے اُترے تو سونیا کہنے لگی۔ "زیادہ دیر نہیں ہوئی بس پانچ منٹ میں پہنچ جائیں گے وہ تیسری گلی ہی تو ہے۔"

"تو تمہارا مطلب ہے، ہم سالگرہ میں جا رہے ہیں؟"

"ہائیں، تو اور کہاں جا رہے ہیں۔"

"واپس گھر چلو۔"

"مگر کیوں، ہم ۔۔۔!"

"بکواس مت کرو۔ تمہارے خیال میں ہم تیل سے بھرے اُلجھے بال، گندے پھٹے کپڑے، ہونق پریشان چہرے، ٹوٹی چپل، زخمی پاؤں اور ۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر بغیر گفٹ کے ۔۔۔!" باوجود ضبط کے ہماری ہچکی بندھ گئی اور آنسو ہماری آنکھوں سے ٹپاٹپ بہنے لگے۔ اب سونیا نے پلٹ کر دیکھا کہ نہ تو ہمارے ہاتھ میں گفٹ تھا نہ کاندھے پر بیگ۔

"اچھا اب بس کرو۔ سڑک پر کھڑے ہو کر روؤ تو نہیں۔۔۔"

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے مجھے اتنا ذلیل کروایا۔ نہ جانے تم کیسے بس میں سفر کرتی ہو اور اب بھی صحیح سلامت ہو۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ جو جتنا بچتا ہے، اُتنا ہی پھنستا ہے۔ اچھا چلو، سڑک کراس کر لو۔ گھر واپس جانے والی بس دوسری طرف سے ملے گی۔"

"ہائے ۔۔۔ نہیں!" ہم اتنے زور سے چلائے کہ سونیا کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں اور بقول اس کے، اس وقت اس کے دل کی رفتار ۷۲ سے ۱۷۲ مرتبہ فی منٹ ہو گئی تھی اور اس دنیا میں اس کا واپس آنا کسی معجزے سے کم نہیں۔

"تو پھر یہیں لمبی لمبی لیٹ جاؤ۔ میں بین کرنے لگتی ہوں۔ ادھر سے اگر ایدھی ایمبولینس گزری تو وہ ہمیں گھر پہنچا دے گی۔ اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس رکشے کا کرایہ نہیں ہے۔ صرف کھلے پیسے ہیں۔ ایدھی ایمبولینس والے اس حالت میں ہمیں یا تو پاگل خانے چھوڑ آئیں گے یا پھر خیراتی اسپتال ۔۔۔ سمجھیں!"

"بکو مت ۔۔۔ ہمت کر کے رکشہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ گھر پر اُتر کر کرایہ ادا کر دیں گے۔" یہ ترکیب سونیا بی بی کو پسند آئی اور اس طرح ہماری واپسی ہوئی۔ وہ اور بات ہے کہ گھر والوں نے پہچاننے سے انکار کر دیا مگر بار بار کی یقین دہانی، زبانی اور حلف بیانی پہ راضی اور رضامند ہوئے۔ یوں ہماری زندگی کے تجربات میں ایک تجربے کا مزید اضافہ ہو گیا۔

حافظ جی

محمد رضوان،

اورنگی ٹاؤن۔ کراچی

ایک دن جب ہم نے بی پڑوسن کا گھڑا غُلّا مار کر توڑ دیا تو بڑی گڑبڑ مچی۔ ابا جان شام کو گھر آئے تو امّی بولیں "اے میں نے کہا سُنتے ہو۔ اپنے لاڈلے کے لچھن تو دیکھو۔ اس نے تو سارا محلّہ سر پر اُٹھا رکھا ہے۔"

ابا جان بولے "لاحول ولاقوۃ، حد کر دی۔ اتنا سا بچّہ محلّہ کیسے اُٹھا سکتا ہے؟"

امّی بولیں "اُئے تمہیں تو سُوجھتا ہے مذاق ۔ میں کہتی ہوں' اللہ رکھے اب یہ پانچ سال کا ہو گیا ہے ۔ اب اس کی پڑھائی کا بھی تو کچھ بندوبست کرو۔"

"اچھا بھئی ناراض مت ہوا سکول میں تو میں اُسے داخل کرادوں مگر وہ یہاں سے بہت دُور ہے ۔ اتنا سا بچّہ وہاں اکیلا کیسے جائے گا؟ ... ارے' اپنے محلّے کے حافظ جی کو تو ہم بھُول ہی گئے ۔ محلّے کے بچّے ان ہی کے پاس تو پڑھتے ہیں :" ابّا جان بولے

"لے لو! میری سمجھ پر پتھر پڑیں ۔ حافظ جی کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا" ۔ امّی جان خوش ہو کر بولیں "بس کل ہی چوٹی کی جلیبیاں لے جا کر اسے حافظ جی کے حوالے کردو۔"

صبح کو ابّا جان چوٹی کی جلیبیاں لائے اور ہمیں حافظ جی کے سپرد کر آئے ۔ اللہ میاں نے دُنیا میں عجیب عجیب چیزیں بھی پیدا کی ہیں ۔ ان ہی چیزوں میں ایک عجیب چیز حافظ جی بھی تھے ۔ دُبلے پتلے چیچک سے بھرا چہرہ، سر پر ترکی ٹوپی، کُچیا داڑھی، جب غُصّہ آتا تو ٹوپی کا پھُندنا کھڑا ہو جاتا اور داڑھی تھر تھر کانپنے لگتی ۔ حافظ جی حافظ تھے اور قاری بھی ۔ ابّا جان ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تو انھوں نے ہمیں اِدھر اُدھر ٹٹول کر دیکھا اور بولے "کیا نام ہے تمہارا؟"

ہم نے ڈرتے ہوئے کہا "سس... سعید"

بولے "اچھّا، چلو قاعدہ کھولو" ۔ ہم نے قاعدہ گھر پر ابّا جان سے پڑھا تھا اسی لیے فر فر سُنا دیا ۔ پہلا دن تو ساتھ خیریت کے گزر گیا ۔ دوسرے دن ہماری شامت آ گئی ۔ حافظ جی نے ہمیں الف لام میم کا پارہ شروع کرایا ۔

بولے "پڑھو اَعُوذُ بِاللّٰہِ"

ہم نے کہا "اَعُوذُ بِاللّٰہِ"

بولے "آ اُوذُ نہیں' اَعُوَ ۔ عین کو حلق سے نکالو"

ہم نے بہتیرا زور لگایا' مگر عین حلق سے نہ نکلا ۔ حافظ جی نے غصّے میں بایاں ہاتھ گھُما کر مارا پھر کمر پر ایک دھموکا لگایا ۔ ہم رونے لگے ۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی ۔ ہم نے ناک کو کرُتے کے دامن میں زور سے جھاڑا تو آواز نکلی "ھُوں' اُوں".....

حافظ جی خوش ہو کر بولے "شاباش' اب کہنا اَعُوَ"

حافظ جی جب تک روزانہ دو چار بچّوں کو مار نہ لیتے تھے کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا ۔ ایک دو ہفتے ہم پر بہت سخت گزرے مگر پھر ہم بھی چنٹ ہو گئے ۔

صبح کو حافظ جی کا لڑکا انھیں مدرسے چھوڑ جاتا تھا شام کو بچّے باری باری اُنھیں گھر پہنچاتے تھے ۔ جب ہماری باری آئی تو بڑی گڑ بڑ ہوئی ۔ آسمان پر رنگ برنگی پتنگیں اُڑ رہی تھیں ۔ راستے میں کوئی گڑھا یا نالی آتی تو سب سے پہلے ہم گرتے پھر حافظ جی بھی اللہ کا نام لے کر گر پڑتے ۔ جب کوئی آدمی مر جاتا تھا تو حافظ جی سب بچّوں کو لے کر جاتے تھے ۔ اگر مرنے والا امیر ہوتا تو حافظ جی دیر تک دُعا مانگتے اور بچّے بھی زور زور سے آمین کہتے کیونکہ یہاں مٹھائی

وغیرہ زیادہ ملتی تھی۔ غریب ہوتا تو چار پانچ منٹ ہی میں ٹرخا دیتے اور بچے بھی مری ہوئی آواز میں آمین کہتے۔ بلکہ آپ سے کیا پردہ، ہم تو چُپ ہی رہتے اور دل میں سوچتے کہ ایسے آدمی کے مَرنے کا کیا فائدہ، جس کے ختم پر ایسی سڑی بُسی مٹھائی ملے۔

معصوم بچے انہیں کیا پتا کہ موت کیا ہوتی ہے۔ انہیں تو مٹھائی کھانے کو ملتی تو وہ بہت خوش ہوتے اور صبح کو جب مدرسے آتے تو ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگتے۔ اللہ میاں! آج بھی کوئی مر جائے۔

غلطی کا احساس

بشریٰ اعجاز ——— لاھور کینٹ

پیریڈ ختم ہونے کے بعد جونہی ماسٹر صاحب کلاس روم سے باہر نکلے ایک ہنگامہ سا مچ گیا، سارے بچے بے مہار اونٹوں کی طرح کلاس میں بھاگنے دوڑنے لگے، چھیڑ چھاڑ، ہاتھا پائی اور طرح طرح کی آوازوں سے ایک شور سا مچ گیا، تمام بچوں میں امتیاز اور عرفان کی شرارتیں اور بدتمیزیاں عروج پر تھیں کہ حساب کے استاد صداقت صاحب اندر داخل ہوئے جن بچوں نے انہیں دیکھ لیا وہ تو جلدی سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے اور جنہوں نے نہیں دیکھا وہ بدستور اپنے شغل میں مصروف رہے۔ صداقت صاحب چند لمحے تو انہیں دیکھتے رہے، مارے غصّے کے ان کا چہرہ لال ہو گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہو رہی ہے"۔ وہ کڑک کر بولے، ان کی آواز سن کر کلاس روم میں سناٹا چھا گیا، تمام لڑکے سر نیچے کر کے بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے۔

"میں پوچھتا ہوں، یہ کلاس روم ہے یا مچھلی بازار نالائقو تم یہاں پڑھنے آتے ہو یا والدین کا پیسہ اور وقت برباد کرنے" وہ غصے کی زیادتی سے کانپ رہے تھے۔ "ادھر آؤ تم سب آخر تم لوگوں نے سمجھ کیا رکھا ہے، یہاں تفریح کرنے آتے ہو یا علم حاصل کرنے اگر اسی طرح کرنا ہے۔ تو مت آیا کرو یہاں" وہ قہر آلود آواز میں بولے۔

تمام لڑکے سر جھکائے ان کے قریب آ گئے مگر امتیاز اور عرفان بجائے شرمندہ ہونے کے مسکرا رہے تھے۔

"سر پلیز ہمیں معاف کر دیں"۔ تمام لڑکے ایک آواز ہو کر بولے، "ہم آئندہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ صرف ایک موقع ہمیں اور دے دیجئے"

صداقت صاحب جواب دیئے بغیر انہیں کڑی نظروں سے تک رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ عرفان اور امتیاز دونوں بڑی دیدہ دلیری سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ ان کے انداز میں بدتمیزی نمایاں تھی۔

"عرفان، امتیاز! ادھر آؤ" ان کے پکارنے پر دونوں بڑی بے نیازی سے چلتے ہوئے ان کے قریب آئے۔

"یس سر"

"کیا تم لوگوں کو نہیں معلوم کہ استاد کا احترام

کیسے کیا جاتا ہے، کیا معذرت کرنے کا یہ طریقہ ہے؟" انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔
"سر ہم نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی جس کی ہم آپ سے معافی مانگیں" وہ ڈھٹائی سے بولے!
"کیا... یعنی تم لوگوں نے کوئی غلطی نہیں کی؟ کلاس میں ہنگامہ، بدتمیزی اور شرارتیں کرنا کوئی غلطی نہیں ہے۔ استاد کا احترام نہ کرنا کوئی غلطی نہیں ہے، چلو میں تمہیں پرنسپل صاحب کے سامنے پیش کرتا ہوں وہ تمہیں بتائیں گے، غلطی کیا ہوتی ہے" ماسٹر صداقت انہیں ساتھ لئے پرنسپل صاحب کے دفتر پہنچ گئے دونوں ماسٹر صداقت کے تیور دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے وہ سمجھ رہے تھے کہ ماسٹر صاحب ہمیشہ کی طرح دھمکی دے رہے ہیں، وہ حسب سابق معاف کردیں گے مگر جب انہوں نے خود کو پرنسپل صاحب کے روبرو پایا تو مارے خوف کے ان کا رنگ زرد پڑ گیا وہ ایک دوسرے کی طرف چور نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے، اب کیا ہوگا؟ ان کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے، ماسٹر صداقت نے پرنسپل صاحب کو ساری بات تفصیلاً بتائی، پرنسپل نے بغور ان کی بات سنی۔
"ٹھیک ہے صداقت صاحب! میں ان کے والدین کو ان کے کارنامے سے آگاہ کردیتا ہوں۔ میرے اسکول میں ان جیسے بے ادب اور بدنظمی پھیلانے والے بچوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے"
"سر جب سے یہ میری کلاس میں آئے ہیں ان کا یہی معمول ہے میں انہیں سمجھاتا رہا ہوں، معاف کرتا رہا ہوں کہ چلو بچے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کی زندگی کے قیمتی سال ان کی ذرا سی غلطی کے نذر ہو جائیں، مگر آج تو انہوں نے حد کردی، کم از کم میں تو انہیں مزید برداشت نہیں کر سکتا" ماسٹر صداقت غم و غصے کی ملی جلی کیفیت سے بولے۔ امتیاز اور عرفان ساکت کھڑے تھے۔
اب کیا ہوگا؟ ہمارے امی ابو، تو یہ بات سن کر ہماری جان ہی نکال دیں گے یا اللہ اب ہم کیا کریں، دونوں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ ان دونوں کے والدین اسکول پہنچ گئے، ماسٹر صاحب اپنی کلاس میں چلے گئے تھے امتیاز اور عرفان کو آفس کے باہر کھڑا کردیا گیا، پھر نجانے پرنسپل صاحب اور ان کے والدین کے درمیان کیا گفتگو ہوئی۔ آدھے گھنٹے بعد ان کے امی ابو باہر نکلے تو بہت خاموش تھے۔
"چلو، نالائقو! خوب نام روشن کیا ہے ہمارا"۔ عرفان کے ابو غصے سے بولے، عرفان اور امتیاز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مرے مرے قدموں سے چل دیئے، وہ ایک دوسرے کے ہمسائے تھے ان کے والدین میں بہت دوستی تھی اور شاید یہی وجہ ان کی دوستی کا بھی سبب تھی وہ دونوں اسکول میں اور باہر ہی گزارتے تھے، کھیل کود نت نئی شرارتیں، ان کے مشاغل تھے، پڑھائی سے صرف انہیں اتنا ہی واسطہ تھا کہ وہ بستے پکڑ کر اسکول جاتے وہاں سے جیسے تیسے

وقت گزار کر واپس آتے اور بستے کو یوں بھول جاتے جیسے کبھی پکڑا ہی نہ تھا، امی ہوم ورک کے لیے بٹھاتیں تو کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر بھاگ جاتے۔

"اب ان دونوں کی دوستی چھڑانی ہوگی اور انہیں جوتے مار مار کر سیدھا کرنا ہوگا" امتیاز کے ابو نے عرفان کے ابو سے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، اگر آئندہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ نظر آئے تو ان کی خیر نہیں" عرفان کے ابو بولے، گھر پہنچ کر امتیاز کے امی ابو چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ بہت خاموش لگ رہے تھے۔

امتیاز نے تو سوچا تھا کہ گھر پہنچ کر امی ابو اس کی خوب ٹھکائی کریں گے، مگر یہ کیا انہوں نے تو کچھ بھی نہ کہا، ان کی خاموشی اور بھی تکلیف دہ تھی، پھر سارا دن یونہی گزر گیا، اس کا کھانا کمرے میں پہنچا دیا گیا مگر اس کا دل قطعاً کھانے کو نہ چاہا، زندگی میں پہلی بار گھر میں اس کے ساتھ غیروں والا سلوک ہو رہا تھا اور یہ سلوک اسے بہت نادم کر رہا تھا اس سے تو بہتر تھا، امی ابو پٹائی کر لیتے مگر بولنا نہ بند کرتے اس نے سوچا۔

شام ہوگئی۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑا تھا۔ کہ اسے باہر سے بہت سی آوازوں کا شور سنائی دیا جھجکتے جھجکتے اس نے دروازے سے باہر جھانکا تو سامنے ٹی وی لاؤنج میں اس کا خالہ زاد بھائی طارق اور بہن مینا بیٹھے نظر آئے۔ وہ بہت سے نئے نئے کھلونوں سے کھیل رہے تھے، جن میں اس کا پسندیدہ ریموٹ کنٹرول جہاز بھی تھا جو اس کے ابو نے امتحان کے بعد اسے دلانے کا وعدہ کر رکھا تھا، جہاز دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا! یہ طارق اور مینا میرا پسندیدہ جہاز کہاں سے لائے؟ ہائے اللہ کتنا خوبصورت ہے کیسے چمک رہا ہے، اس جہاز سے کھیلنے کے لیے میں کتنا بے قرار تھا، مگر یہ ان کے پاس کہاں سے آیا؟ تجسس میں ڈوبا ہوا وہ آہستہ آہستہ چلتا ان کے قریب پہنچ گیا، مینا اور طارق بدستور کھیلنے میں مصروف رہے، یوں جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو، پہلے تو وہ خاموش کھڑا انہیں دیکھتا رہا پھر

ہولے سے بولا "طارق، مینا! تم لوگ یہ جہاز کہاں سے لائے ہو؟"

ان دونوں نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہ تھی کھیل میں مگن رہے ان کی بے رخی پہ وہ جل کر چیخ اٹھا، "میں پوچھتا ہوں، یہ جہاز تم لوگ کہاں سے لائے ہو؟"

"آہستہ بولو امتیاز! کیوں چلا رہے ہو! یہ جہاز ہمیں خالو جان نے دیا ہے" وہ کہہ رہے تھے، "یہ میں نے امتیاز کیلئے خریدا تھا کہ امتحانات کے بعد

اسے تحفہ دوں گا مگر اب چونکہ وہ اسکول ہی چھوڑ چکا ہے اور امتحان کبھی نہیں دے سکے گا کیونکہ پرنسپل صاحب نے اسے اسکول سے نکال دیا ہے۔ لہٰذا اب اس جہاز سے تم کھیلو" طارق بڑے اطمینان سے بولا یہ بات سُن کر امتیاز کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو طارق! کیا اب میں کبھی اسکول نہیں جا سکوں گا؟" وہ بے یقینی سے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"جی ہاں تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ پڑھائی میں تو تم ویسے ہی کورے ہو۔ اور اب تم نے جو بدتمیزی ماسٹر صاحب سے کی ہے اس کے بعد تمہیں اسکول میں کون رکھتا اب تو پڑھائی ختم سمجھو"۔ طارق کی بات سن کر امتیاز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اپنی شرارتوں اور غلطیوں کا اسے بڑی شدت سے احساس ہوا۔ وہ تو پڑھائی کو صرف ایک کھیل سمجھتا تھا، اسے اب معلوم ہو رہا تھا کہ پڑھائی انسان کی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔

اپنے کمرے میں آکر وہ بے اختیار رونے لگا، اب کیا ہوگا؟ کیا میں جاہل رہ جاؤں گا؟ کبھی بھی کچھ نہ بن سکوں گا؟ علم کے فائدے پر ماسٹر صاحب کا لکھا ہوا مضمون اسے یاد آنے لگا، وہ باتیں جنہیں پڑھ کر وہ لاپروائی سے بھلا دیا کرتا تھا اسے یاد آنے لگیں علم کی قدر و منزلت کا احساس، اس کے دل میں جاگنے لگا استاد کی عزت اور احترام کے بارے میں پڑھا ہوا سبق اس کے ذہن میں گونجنے لگا، "ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استاد کو والدین کے برابر درجہ دیا ہے اور فرمایا ہے کہ علم دینے والا تمہارے والدین کا درجہ رکھتا ہے اس کی اتنی ہی عزت کرو، جتنی ماں باپ کی کرتے ہو"۔

"اُف وہ کتنی بھول ہوئی مجھ سے کتنا خراب بچہ ہوں میں کہ میں نے ماسٹر صاحب اور امی ابو سب کا دل دکھایا، میرے اللہ مجھے معاف کر دے۔ آئندہ میں ایسی کوئی بھی حرکت نہیں کروں گا جس سے کسی کا دل دُکھے۔

وہ چپ چاپ بستر پر پڑا نجانے کیا کیا سوچتا رہا۔ عرفان سے مشورہ کرنا چاہیئے کہ اب ہم کیا کریں یہ سوچتے ہی وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ ٹی وی لاؤنج خالی پڑا تھا، سارے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا، شاید امی ابو طارق اور ٹینا کو چھوڑنے گئے تھے، گیٹ پر پہنچا تو وہاں ان کا نوکر بشیر بابا کھڑا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو امتیاز بیٹا!" بابا نے شفقت سے پوچھا۔

"ذرا عرفان کے گھر جا رہا ہوں ابھی لوٹ آؤں گا"۔ خلافِ معمول امتیاز نے بڑی تمیز سے جواب دیا اور عرفان کے گھر چل پڑا۔ وہاں بھی امتیاز کے گھر والا منظر تھا اس کے امی ابو کہیں گئے ہوئے تھے اور عرفان اپنے کمرے میں چپ چاپ لیٹا تھا، امتیاز کو دیکھ کر جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

"بھائی امتیاز ہم سے بڑی غلطی ہوئی اب ہم کیا کریں"، عرفان اسے دیکھ کر رونے لگا۔ امتیاز کی آنکھیں بھی بھر آئیں تھوڑی دیر بعد دونوں چپ..... ہوئے تو امتیاز بولا" دوست میں نے سوچا ہے کہ کیوں نہ ہم

ماسٹر صاحب سے معافی مانگنے چلیں مجھے اُمید
ہے کہ وہ ہمیں ضرور معاف کر دیں گے۔"
"نہیں امتیاز! مجھے تو ڈر لگتا ہے کہیں وہ ہمیں
کوئی سزا نہ دے دیں" عرفان خوفزدہ ہو کر بولا۔
"بڑے بیوقوف ہو تم یہ نہیں سوچتے کہ ہمارا
معافی نہ مانگنا ہی ہمارا سب سے بڑا جرم تھا، جس کی
ہمیں یہ سزا ملی ہے دیکھو نا ہم سب لڑکے اکٹھے ہی
کلاس روم میں شرارتیں کر رہے تھے جن لڑکوں نے
معافی مانگ لی انہیں ماسٹر صاحب نے معاف
کر دیا اور ہم دونوں نے بدتمیزی کی تو ہمیں یہ سزا ملی،
میں کہتا ہوں اب بھی وقت ہے، چلو صداقت صاحب
کے گھر چلیں" امتیاز اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔
"اس وقت رات کے آٹھ بجے ہم اکیلے کیسے
جائیں گے" عرفان بولا۔ "اور پھر ہمیں تو صداقت صاحب
کے گھر کا ایڈریس بھی نہیں معلوم۔"
"تم اس کی فکر نہ کرو ان کا گھر ہماری کالونی میں
ہی ہے ارشد کے گھر کے نزدیک۔ میں ابھی فون کر کے
ارشد سے ان کے گھر کا نمبر لے لیتا ہوں۔ بس تم تیار
ہو جاؤ" امتیاز جلدی سے فون کی طرف بڑھتے ہوئے
بولا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں رکشے میں
اُڑے جا رہے تھے، ماسٹر صاحب کی گلی میں پہنچ
کر وہ رکشے سے اُترے اور نمبر پڑھتے پڑھتے آخر مطلوبہ
نمبر انہیں مل گیا۔
وہ گیٹ پر پہنچ کر چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔
"کال بیل بجاؤ" امتیاز نے کہا۔ "نہیں
مجھے تو ماسٹر صاحب سے ڈر لگ رہا ہے، ایسا
کرتے ہیں اندر چل کر حالات کا جائزہ لیتے ہیں پھر فیصلہ
کریں گے، ہمیں کیا کرنا چاہیئے" عرفان خاصا خوفزدہ
تھا۔
"یار تم بھی عجیب ہو، کوئی بات مانتے ہی
نہیں خیر چلو" امتیاز اس کے ہمراہ اندر چل دیا، گھر کے برآمدے
میں ایک کم قوت کا بلب پیلی پیلی روشنی بکھیر رہا تھا وہ
سہمے ہوئے سے برآمدے میں کھڑے تھے کہ اندر سے
ماسٹر صاحب کی آواز آئی۔
"نہیں بھئی آج کھانے کو ذرا بھی دل نہیں چاہ
رہا ہے۔ تم کھا لو"۔
"کیوں آخر کیا بات ہے آپ نے دوپہر کو
بھی نہیں کھایا اور اب بھی انکار کر رہے ہیں طبیعت
تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟" کسی عورت کی آواز آئی۔
"طبیعت کو کیا ہونا ہے بس آج دل پریشان
سا ہے" ماسٹر صاحب اُداس لہجے میں بولے۔
"کیوں خیر تو ہے کس وجہ سے پریشان ہیں
آپ؟"
"کیا بتاؤں عجیب سی بات ہے آج میری
شکایت پر میری کلاس کے دو بچّے اسکول سے نکال دیئے
گئے ہیں اب میں پچھتا رہا ہوں" میں نے ان کی
شکایت کیوں کی انہیں پہلے کی طرح معاف کیوں
نہ کر دیا۔ کیا ہوا جو انہوں نے شرارت کی آخر
بچّے تھے اور بچّے شرارتیں کرتے ہی ہیں پھر میں نے
کیوں ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ ماسٹر صاحب

پشیمانی سے بولے۔

"یہ تو واقعی بُرا ہوا... اگر بچوں نے بدتمیزی کی تھی تو انہیں خود سزا دیتے معاملہ پرنسپل تک پہنچانے کی کیا ضرورت تھی"۔ عورت کی آواز میں ناراضگی کا اظہار تھا۔

"بس یہی تو پچھتاوا ہے"۔ ماسٹر صاحب تاسّف سے بولے، برآمدے میں کھڑے امتیاز اور عرفان بے اختیار روتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

"سر، سر ہمیں معاف کر دیں، واقعی غلطی ہماری تھی آپ نے جو کچھ بھی کیا، وہ آپ کو کرنا چاہیئے تھا" وہ ماسٹر صاحب کے سامنے مُجرموں کی طرح گردن جھکائے کھڑے تھے۔ ماسٹر صاحب پہلے تو انہیں حیرت سے دیکھتے رہے پھر آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگا لیا۔

"میرے بچّو! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں مجھے تم سب بچّے اپنی اولاد کی طرح عزیز ہو"۔ ماسٹر صاحب پیار سے بولے "اب یہ رونا دھونا بند کرو اور منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ، کیونکہ مجھے یقین ہے، میری طرح تم لوگوں نے بھی کھانا نہیں کھایا ہوگا"

کھانا کھانے کے بعد ماسٹر صاحب انہیں ان کے گھروں تک چھوڑنے آئے۔ ان کے والدین سے مل کر انہیں معاف کرنے کی سفارش کی اور پرنسپل صاحب سے انہیں معافی دلانے کا وعدہ کیا۔ تو امتیاز کے ابّو مسکراتے ہوئے بولے "ماسٹر صاحب! پرنسپل صاحب نے ان کو اسکول سے نہیں نکالا بلکہ ایک آخری موقع دیا ہے کہ اگر اس کے باوجود دوبارہ انہوں نے ایسی حرکت کی تو پھر انہیں بنا نوٹس کے اسکول سے نکال دیا جائے گا، وہ تو ہم نے انہیں بتایا نہیں اس لئے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور خدا کا شکر ہے، یہ بہت جلدی سنبھل گئے ہیں۔ اب انشاءاللہ یہ اچھے بچّے بن جائیں گے۔ کیوں بچّو؟" ابّو نے امتیاز اور عرفان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ تو وہ بھی مسکرا پڑے

"جی ہاں۔ اب ہم اچھے بچّے ہیں"۔ دونوں نے ایک ساتھ کہا اور سب لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

ببلو کی کار

ثمینہ شہزاد، ٹاؤن شپ لاہور

ببلو میاں جب اسکول سے واپس آئے تو ان کا موڈ کچھ خراب نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی بستہ زمین پر پٹخا۔ جوتے اُتار کر ایک طرف پھینک دیے۔ موزے بھی الگ الگ جگہ پر پھینک دیے۔ ان کی امی کچن میں کھانا تیار کر رہی تھیں۔ ببلو میاں ننگے پاؤں کچن میں گئے۔ "کیا بات ہے بیٹے! آج طبیعت تو ٹھیک ہے نا، نہ سلام نہ دُعا۔" ان کی امی نے پیار سے کہا۔ "امّی میں اپنے کمرے میں جا کر سو رہا ہوں مجھے کوئی نہ جگانے آئے۔" ببلو میاں نے کہا۔

"کیا بات ہے بیٹے، کھانا تو کھا لو۔ اس کے بعد بے شک سو جانا"۔ ان کی امی نے کہا، تو ببلو میاں بولے "امی مجھے بھوک نہیں ہے"۔ "کیوں بھوک نہیں ہے؟" ببلو میاں کی امی پریشان ہو کر بولیں۔ "بس امی کہہ جو دیا ہے کہ مجھے نہیں کھانا ہے"۔ ببلو میاں نے یہ کہا اور اپنے کمرے میں

جاکر لیٹ گئے۔ ببلو کی امی تھوڑی دیر بعد اس کمرے میں گئیں اور کہا "بیٹے آخر کیا وجہ ہے کہ تم آج کسی چیز میں دلچسپی نہیں لے رہے ہو۔"

"امی میرے سب کلاس فیلوز میں سے کئی کار پر اسکول آتے ہیں۔ کئی موٹر سائیکل پر اور کئی سائیکلوں پر جب کہ میں روزانہ پیدل اسکول جاتا ہوں۔" ببلو میاں نے کہا۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔" ببلو کی امی نے کہا۔

"اچھا اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو۔"

"امی میں اپنی کار میں اسکول جانا چاہتا ہوں۔" ببلو میاں بولے۔ "بیٹے تمہارے ابو کی تنخواہ اتنی قلیل ہے کہ کہ ہم بمشکل پیٹ کاٹ کر تمھیں پڑھا رہے ہیں۔ ہم اس تنخواہ میں کار نہیں خرید سکتے۔" ببلو کی امی نے ببلو کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن امی میری کلاس کے سب بچے کسی نہ کسی سواری پر آتے ہیں، میں کیوں پیدل جاؤں۔" ببلو میاں نے کہا۔

ببلو کی امی جانتی تھیں کہ ببلو بہت ضدی ہے۔ جس بات پر اڑ جائے اُسے منوا کر ہی چھوڑتا ہے۔ "بیٹے تمہاری کلاس میں ذرا سوچو تو وہ بھی لڑکے ہیں جو پیدل اسکول آتے ہیں۔ تم تو پھر بس سے اسکول جاتے ہو۔"

"نہیں امی میں ان پیدل جانے والوں میں شامل ہو جاؤں۔ یہ میری برداشت سے باہر ہے۔" ببلو میاں غصّے میں آکر بولے۔ ان کی امّی باہر چلی گئیں۔ وہ سمجھ گئیں کہ ببلو اس وقت ان کی ایک نہ سُنے گا۔

"ببلو میاں۔ ارے ببلو بیٹا۔" ببلو کو اپنے ابو کی آواز سنائی دی۔ "اوہ! تو ابو آگئے۔" ببلو میاں نے کہا اور فوراً ابّو سے ملنے باہر نکل آئے۔ سامنے اُن کے ابّو کھڑے تھے۔

"دیکھو بیٹا میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔" ببلو کے ابّو نے کہا۔ ببلو نے چونک کر دیکھا، ان کے ابّو کے ہاتھ میں چابیاں تھیں۔

"بیٹا! یہ بالکل نئی کار کی چابیاں ہیں۔ جاؤ جب کر دیکھو، باہر کار کھڑی ہے۔" ببلو میاں کے ابّو نے کہا۔

ببلو میاں خوشی سے جھوم اُٹھے۔ وہ فوراً باہر دوڑے باہر سڑک پر نئی نویلی، چمکتی ہوئی کار کھڑی تھی۔ کار کا رنگ سُرخ تھا۔ ببلو میاں نے فوراً کار کا دروازہ کھولا اور فرنٹ

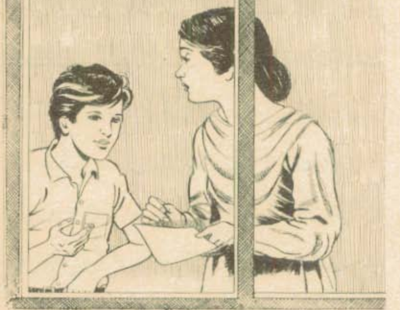

سیٹ پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے چابی اگنیشن میں گھمائی اور کار کو اسٹارٹ کیا۔

یہ جان کر انہیں بے حد خوشی ہوئی کہ انہیں خود بخود کار چلانے کا طریقہ آگیا ہے۔ وہ مزے سے کار چلاتے ہوئے مارکیٹ گئے۔ اس کے بعد وہ مینارِ پاکستان گئے۔ بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ دیکھا۔ چڑیا گھر اور عجائب گھر کی سیر کی۔ ببلو میاں جلّو موڑ بھی گئے۔ انہوں نے مزے سے سارے شہر کی سیر کی۔ سڑکوں پر گاڑیوں کا ایک ہجوم تھا۔ ببلو میاں بڑی شان سے گاڑی چلا رہے تھے اور پیدل چلنے والے لوگوں پر ہنس رہے

تھے۔ انہیں کار چلاتے ہوئے بہت مزہ آرہا تھا۔ اب شام ہونے کو آرہی تھی۔ ببلو میاں کار چلاتے ہوئے کافی دور نکل آئے تھے۔ شام ہونے کو تھی۔ ببلو میاں نے سوچا کہ اب واپس چلو۔ تو انہوں نے کار کو موڑنا چاہا، لیکن یہ کیا۔ کار نہیں مُڑ رہی تھی وہ سیدھی ہی جارہی تھی۔ ببلو میاں نے گھبرا کر کار کو روکنا چاہا، لیکن وہ نہ رُکی اور سیدھی چلتی رہی۔ چلتے چلتے کار پہاڑیوں میں پہنچ گئی۔ اب شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ببلو میاں فکرمند ہو گئے تھے۔ کار نے پھر اچانک زمین کو چھوڑ دیا اور ہوا میں چلنے لگی۔ ببلو میاں بہت گھبرا گئے تھے۔ کار ہوا میں اُڑ رہی تھی۔ ببلو میاں نے کار کی کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا تو ان کا دل دہل گیا۔ وہ زمین سے کئی سو فٹ کی بلندی پر اُڑ رہے تھے۔ "یا اللہ یہ کار مجھے کہاں لے جارہی ہے۔" ببلو میاں نے اللہ میاں سے کہا۔ انھوں نے کار کا اسٹیرنگ ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ کیوں کہ کار اسٹیرنگ پر اُن کے کنٹرول کے بغیر ہی چل رہی تھی۔ اب کار خلا میں داخل ہوگئی تھی۔ خلا میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ لیکن ہوا بہت کم تھی۔ ببلو میاں کا دم گھٹنے لگا۔ کار خلا میں اوپر ہی اوپر جارہی تھی۔ پھر اچانک کار ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ ببلو میاں فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ ان کی خوف سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ان کے اردگرد کئی خوفناک بلائیں کھڑی تھیں۔ "ہاہاہاہا۔ آج پھر ہمیں ایک نافرمان بچے کا گوشت کھانے کو ملے گا۔" ایک بلا نے کہا۔ دوسری بلا جو بہت خوفناک تھی۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہنے لگی۔

"کافی دیر ہوگئی تھی ہمیں کوئی بھی نافرمان بچہ کھانے کو نہ ملا آج ہم اپنی بھوک اس نافرمان بچے کا گوشت کھا کر مٹائیں گے۔ ہاہاہا۔"

سب بلائیں مل کر قہقہے لگانے لگیں۔ ببلو میاں کی آواز رندھ گئی۔ وہ دل ہی دل میں اللہ میاں سے دُعا مانگنے لگے۔ بلائیں ان کی طرف بڑھنے لگیں۔ ببلو میاں کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ایک بلا نے انھیں ہاتھوں پر اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ ببلو میاں کی چیخ نکل گئی۔ "کیا ہوا میرے لعل" ببلو میاں کی امی نے انھیں سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"امّی... وہ کار... بلائیں... امّی مجھے معاف کر دیں۔ میں کبھی آپ سے نافرمانی اور فضول ضد نہیں کروں گا۔" ببلو میاں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ببلو کی امّی سمجھ گئیں کہ ضرور ببلو نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔

نظم

مرسلہ: سیّد مظہر عاصم - سکھر

ہم ہیں ننھے منّے بچّے
نام کے سچّے کام کے پکّے

نام ہمارے جھلمل جھلمل
جیسے ہوں آکاش پہ تارے

ابّو کے ہیں ہم متوالے!
امّی کی آنکھوں کے تارے

باتیں ہماری پیاری پیاری
روتے روتے ہنستے، ہنستے!

تختی بستہ بھاری بھاری
تھک جاتے ہیں چلتے چلتے

ربِّ زِدنی علما کہہ کر
ہاتھ اُٹھے ہیں منّے منّے

شبنم کا تاج

ثمرین معین، لطیف آباد، حیدرآباد

کسی بادشاہ کی ایک ایک ہی بیٹی تھی وہ بہت ضدی تھی۔ ایک دن صبح وہ باغ میں ٹہلنے کے لیے گئی تو اُس نے پھول پتیوں پر شبنم کے قطرے چمکتے ہوئے دیکھے شبنم کے یہ قطرے اُسے ان ہیروں سے زیادہ چمک دار اور خوبصورت لگے جو شہزادی کے پاس تھے شہزادی سیدھی محل میں واپس آئی اور بادشاہ سے کہنے لگی مجھے شبنم کا تاج بنوادیجیے جب تک مجھے تاج نہیں ملے گا میں نہ کچھ کھاؤں گی اور نہ کچھ پیوں گی یہ کہہ کر شہزادی نے اپنا کمرہ بند کر لیا اور چادر اوڑھ کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ بادشاہ جانتا تھا کہ شبنم کے قطروں سے تاج نہیں بنایا جاسکتا، پھر بھی اس نے شہزادی کی ضد پوری کرنے کے لیے شہر کے تمام سناروں کو بُلا بھیجا اور اُن سے کہا کہ تین دن کے اندر شبنم کے قطروں کا تاج بنا کر پیش کرو ورنہ تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔ بے چارے سُنار حیران پریشان تھے کہ شبنم کا تاج کس طرح بنائیں ان سناروں میں ایک بوڑھا سنار بہت عقلمند تھا سوچتے سوچتے اُس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی وہ دوسرے دن صبح محل کے دروازے پر آیا اور سپاہیوں سے کہا کہ وہ شہزادی کا تاج بنانے آیا ہے۔ سپاہی اُس کو شہزادی کے پاس لے گئے۔ بوڑھے سنار نے شہزادی کو سلام کیا اور بولا حضور میں آپ کا تاج بنانے کے لیے آیا ہوں لیکن میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔

کہو کیا کہنا چاہتے ہو شہزادی نے کہا۔ سنار بولا آپ باغ میں چل کر مجھے شبنم کے وہ قطرے دے دیجیے۔۔ جن سے آپ تاج بنوانا چاہتی ہیں جو قطرے آپ پسند کر کے مجھے دیں گی میں فوراً ان کا تاج بنادوں گا شہزادی سنار کے ساتھ باغ میں گئی پھولوں اور پتوں پر شبنم کے قطرے جگمگا رہے تھے لیکن شہزادی نے جس قطرے کو بھی چھوا وہ اُس کی اُنگلیوں پر پانی کی طرح بہہ گیا تب شہزادی نے کھسیانی ہو کر بوڑھے سُنار سے معافی مانگی اور عہد کیا کہ وہ اب کبھی ایسی ضد نہیں کرے گی۔ بادشاہ نے اس سنار کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور بہت سے تحفے دے کر رخصت کیا۔

جھوٹ کی سزا

اسما رانی بدر، عثمانیہ کالونی، کراچی

کسی زمانے میں ملک مصر پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ بادشاہ نہ تو خود پڑھا لکھا تھا اور نہ ہی پڑھے لکھے لوگوں کو پسند کرتا تھا۔ بادشاہ بہت بے وقوف بھی تھا۔ ہر وقت بادشاہ کے دربار میں خوشامدی اور ہنسنے ہنسانے کی باتیں کرنے والے لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اور بادشاہ کو ایسے لوگ بھی بہت پسند تھے جو اس کو جھوٹی سچی باتیں گھڑ گھڑ کر سُناتے رہتے تھے اور بادشاہ کو حیران کرتے رہتے۔ یوں تو بادشاہ کے دربار میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہ تھی مگر شہباز گل بادشاہ کے قریب ترین مصاحبوں میں سے ایک تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی کہانی گھڑ کر بادشاہ کو سناتا رہتا۔ ایک دن بادشاہ نے اُس کی آنکھ میں لال دھبّہ دیکھ کر پوچھا "شہباز گل یہ کیا ہے" تو وہ بولا۔

"یہ میری آنکھ میں جو بڑا سا سُرخ دھبّا نظر آرہا ہے نا!

یہ لعل ہے جناب اور میرا اصلی نام بھی لعل گل ہے۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو میری ماں نے میری آنکھ میں یہ لعل چھپا دیا تھا۔ تاکہ وہ دُور ہی سے مجھے پہچان لے اور محلّے پڑوس کے لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ ہم لوگ ایسے ویسے خاندان سے تعلق نہیں رکھتے رئیس زادوں کا خاندان ہے۔ بادشاہ یہ سُن کر بہت خوش ہوا۔ یہ بات پھیلتے پھیلتے ڈاکوؤں کے ایک گروہ تک پہنچی۔ ایک روز لعل گل بادشاہ کے دربار میں شریک ہونے جا رہا تھا کہ ہاتھ میں بڑا سا خنجر سنبھالے ایک دیو ہیکل شخص نے تنگ سی گلی میں اُسے گھیر لیا۔ لعل گل نے جلدی جلدی اپنی ساری جیبیں خالی کر دیں اور جو کچھ تھا اُسے دے دیا مگر وہ

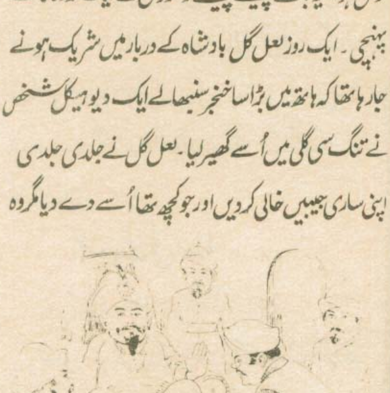

بولا یہ چیزیں تو مجھے اور لوگوں سے بھی مل جاتی ہیں۔ نکالو اپنی آنکھ سے یہ لعل۔ لعل گل کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا وہ اس کے پیروں میں گر کر بولا۔ بھائی تم خود سوچو، کوئی اپنی آنکھ میں لعل کیسے چھپا سکتا ہے۔ میں نے تو یہ کہانی صرف بادشاہ اور دوسرے بے وقوف لوگوں کی نظروں میں عزّت حاصل کرنے کے لیے کہی تھی، مگر وہ نہ مانا تھا وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ اپنا لعل بچانے کی خاطر جھوٹ بول رہا ہے اور اس نے لعل گل کی منتوں سماجتوں کی پروا کیے بغیر اُسے دبوچ لیا اور خنجر کی نوک اُس کی آنکھ میں اُتار دی مگر وہاں لعل کہاں تھا وہ تو صرف آنکھ میں سُرخ دھبّا تھا خنجر کی نوک لگتے ہی آنکھ سے خون کا فوّارہ نکلا اور وہ درد سے تڑپنے لگا۔ وہ ڈاکو لعل گل کو درد سے تڑپتا ہوا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ لعل گل کی آہ و بُکا سُن کر لوگ آ گئے۔ انھوں نے اُسے اُٹھایا اور حکیم پاس لے گئے۔ حکیم نے مرہم پٹّی کر دی اور جب چند روز کے بعد آنکھ کی پٹّی کھُلی تو وہ اپنی ایک آنکھ سے محروم ہو چکا تھا۔ اب تو اُسے عالم کی نصیحتیں بہت یاد آئیں بہت رویا خدا کے آگے گڑگڑایا مگر آنکھ کی بینائی واپس نہ آسکی اسی حالت میں جب دربار پہنچا تو اُس نے بادشاہ اور تمام درباریوں کے سامنے کبھی جھُوٹ نہ بولنے کا عہد کیا اور بادشاہ کو بھی سمجھایا کہ وہ ان خوشامدی اور جاہل لوگوں کی باتوں میں آکر اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں۔ بادشاہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی لعل گل نے باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا اور پڑھے لکھے لوگوں کی بہت عزت کرنے لگا اور دوسروں کو بھی یہ تلقین کرتا کہ کبھی جھُوٹ نہ بولنا۔ آیئے اب ہم بھی یہ عہد کریں کہ کبھی جھُوٹ نہ بولیں گے

اگر دنیا میں

فرخ مبین، شادمان ٹاؤن۔ کراچی

عمران خان نہ ہوتے تو پٹّھے نہ ہوتے۔

قادر نہ ہوتا تو ڈسکو ڈانس نہ ہوتا۔

مارشل نہ ہوتا تو کالا رنگ نہ ہوتا۔

وسیم اکرم نہ ہوتا تو لمبا قد نہ ہوتا۔

مائیک گیٹنگ نہ ہوتا تو بے ایمانی اور موٹاپا نہ ہوتا۔

قلمی دوستی

آؤ ملائیں ہاتھ

ماہنامہ آنکھ مچولی ۔ گریبنہ گائیڈ اکیڈمی

۔۔۔ ڈی ۔ نورش روڈ سائٹ کراچی نمبر ۱۰

آؤ ملائیں ہاتھ

محمد عمران عبدالوہاب، ۱۴ سال
جماعت ہشتم، حساب، انگریزی
پائلٹ بننا چاہتے ہیں۔
وجہ، ملک و قوم کی خدمت۔

۳۰/۲ بانواما ٹاؤن فیڈرل بی ایریا ۔ کراچی

عبدالرشید بلوچ ۱۸ سال
فرسٹ ایئر ۔ قلمی دوستی
مضمون، اسلامیات
الیکٹریکل انجینئر بنیں گے۔

رول نمبر ۶۹ گورنمنٹ پولی ٹیکنیک کالج جیکب آباد

شفیق احمد اعوان ۱۵ سال
جماعت دہم، قلمی دوستی
لوا کار کا پیشہ اختیار
کریں گے۔

مسلم ٹاؤن وارڈ نمبر ۱۴ پنڈی گھیب ضلع اٹک

محمد جاوید ۔ ۱۳ سال
جماعت ششم ۔ کہانیاں پڑھنا
مضمون ۔ اُردو ۔ فوجی
بن کر اپنے ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں

مکان نمبر ۳ ۔ بلاک نمبر ۱۴ ۔ ایریا ۵۔۵ ۔ نئی کراچی

عبدالصادق، ۱۴ سال
جماعت نہم، قلمی دوستی
مضمون، حساب ۔ فوجی بن کر
ملک کی حفاظت کرنے کا عزم ہے۔

میر علی سبزی فروش ۔ ارباب غلام علی روڈ ۔ کوئٹہ

محمد ساجد، ۱۵ سال
جماعت نہم، مطالعہ کرنا
مضمون، حیاتیات۔
پائلٹ بن کر ملک کی خدمت کریں گے۔

سی ۲۴ ، نفیس آباد ۔ تین ہٹی ۔ کراچی

ناصر سعید، ۱۵ سال
جماعت دہم، لکھنا لکھانا
مضمون، فزکس، کرکٹر بنیں
گے، کیونکہ اچھی کرکٹ کھیلتے ہیں۔

آر ۔ ۵۸۹ بلاک ۲۰ ۔ فیڈرل بی ایریا ۔ کراچی ۳۸

خیر بخش الماس مری ۱۵ سال
جماعت ہفتم، قلمی دوستی
مضمون، اردو ۔ ایک اچھے
انسان بنیں گے، کیونکہ دنیا اچھے افراد سے خالی ہو رہی ہے

گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ اللہ یار ضلع جعفر آباد بلوچستان

کاشف محمد علی ۱۵ سال
جماعت دہم، قلمی دوستی
مضمون، عربی۔
استاد بن کر قوم کی خدمت کریں گے۔

۲۸۹ بیرون قلعہ روپا سنگھ نزد چشتیہ آٹس فیکٹری چونیاں ضلع قصور

عرفان شہزاد، ۱۶ سال
جماعت ہشتم، کراٹے
مضمون حساب، فوجی بن
کر ملک کے دشمنوں کا خاتمہ کریں گے۔

۸ لال شہباز کالونی نمبر ۵ نیو کراچی ۔ کراچی

سید اظفر کاظمی، ۱۴ سال
جماعت دہم، مطالعہ کرنا
مضمون، فزکس، الیکٹرونک
انجینئر بنیں گے کیونکہ اس طرف رجحان ہے۔

۳۳۳ ۔ بلاک سی ۔ یونٹ ۱۰ ۔ لطیف آباد ۔ حیدر آباد

محمد نعمان ملک ۱۳ سال
جماعت ہشتم، قلمی دوستی
انجینئر بنیں
گے۔۔۔

۴۷/۶۷ ۔ گلشنِ راوی ۔ لاہور

ذاکر حسین ۱۵ سال
میٹرک، کرکٹ کھیلنا،
مضمون، ریاضی۔
پائلٹ بننے کا ارادہ ہے۔
۵۰/۱۴۰۸ نصرت کالونی نمبر ۵ پرانا سکھر، سکھر

ارشد اقبال، ۱۴ سال
جماعت ہفتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، اردو۔ خواہش
کرکٹر بنیں گے۔
۵۹۸۔ ل ریلوے کالونی۔ لاہور

ارشد محمود ۱۴ سال
جماعت نہم۔ مطالعہ کرنا
کھیلنا۔ انجینئر بن کر
ملک کی خدمت کریں گے۔
ڈاکخانہ جک مجاہد تحصیل پنڈ دادنخان، ضلع جہلم

انعام الرحمٰن ۹ سال
جماعت سوم، مطالعہ کرنا
مضمون، ریاضی،
انسپکٹر بن کر رشوت کو مٹائیں گے۔
گورنمنٹ پرائمری اسکول۔ عثمان والا

جسٹن چارلس ۱۷ سال
میٹرک، آنکھ مچولی پڑھنا
مضمون، انگریزی
انجینئر بننے کا شوق ہے۔
اے ۳۵۔ گلی نمبر ۱۸۔ قیوم آباد۔ کورنگی۔ کراچی۔

شاہد خان ۱۰ سال
جماعت ششم، مطالعہ کرنا
مضمون، اردو۔ فوجی
بن کر ملک کی حفاظت کریں گے۔
اے ون بلاک اے طاہر مینشن، نارتھ ناظم آباد، کراچی۔

ارشد عمران ارشی ۱۵ سال
جماعت نہم، خط و کتابت
مطالعہ، مضمون حیاتیات
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں۔
۶۷۔ بی مسلم ٹاؤن۔ پنڈی گھیب۔ ضلع اٹک

فرخ شہزاد جمن ۱۱ سال
جماعت ہشتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، سائنس، پائلٹ
بن کر ملک کی حفاظت کریں گے۔
آر ۱۸/۴۹۸ سمن آباد فیڈرل بی ایریا، کراچی

محمد رضوان ۱۱ سال
جماعت ششم، فٹ بال
مضمون، اسلامیات
فوجی بنیں گے۔
۱۴۴ سیکٹر ۱۱ جی نئی کراچی۔ کراچی۔

ذوالفقار حسن ۱۶ سال
جماعت نہم، جاسوسی،
سائنس، سیکرٹ
ایجنٹ بننا چاہتے ہیں۔
اے ۱۹۳۸۔ گلبہار گولیمار نمبر ۲۔ کراچی ۱۸۔

نوید شہزاد ۱۲ سال
جماعت ششم، جوڈو کراٹے
مضمون، انگریزی خواہش
پائلٹ بنیں گے۔
۱۷۳ بی۔ شاہ رکن عالم کالونی۔ نیو ملتان، ملتان

محمد خان ۱۳ سال
جماعت ہفتم، کرکٹ کھیلنا
انگریزی، اسلامیات۔
انجینئر بننا ہے۔
واپڈا کالونی۔ ٹنڈو جام۔ ضلع حیدرآباد

عزیز سلطان ۱۲ سال
جماعت ہفتم، کرکٹ
ریاضی۔ فوج میں
جائیں گے۔
چک نمبر چھ آر ۸۲۔ ساہیوال

احمد توفیق ۱۴ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ
تصاویر جمع کرنا۔ مضمون،
حساب۔ انجینئر بنیں گے۔
زریاب کالونی فقیر آباد نمبر ۲۔ مخدوم لائن۔ پشاور

حماد ترین ۱۰ سال
جماعت پنجم، کرکٹ
مطالعہ کرنا، سائنس، آرمی
آفیسر بننا چاہتے ہیں۔
۹-۳۷ فیروز ون۔ ایجنسی اپارٹمنٹس، گلشن اقبال بلاک ۱۳، کراچی

ناصر نصیب ۱۲ سال
جماعت پنجم، مطالعہ کرنا
مضمون، انگریزی،
ڈاکٹر بننے کا شوق ہے۔
مکان نمبر ۶۴۔ گلی نمبر ۳، ۱۷۳۔ نیو سمن آباد۔ کالج روڈ۔ لاہور

عبدالملک ۱۵ سال
جماعت نہم، جوڈو کراٹے
مضمون۔ انگریزی
پائلٹ بننے کا شوق ہے۔
ای ۶/۷ سٹیلائٹ کوئٹہ۔ کوئٹہ

محمد فیصل ہارون ۱۱ سال
جماعت چہارم، آنکھ مچولی
پڑھنا، حساب، سائنس
دان بن کر ایجادات کریں گے۔
سی ۲۰-۱۔ اے ون۔ پہلی منزل حسینی منزل جیلانی روڈ سکھر

محمد یوسف، ۱۲ر سال
جماعت ہفتم، ٹکٹ جمع کرنا
مضمون انگریزی ۔ ڈپٹی کمشنر
بن کر ملک کی خدمت کریں گے ۔
معرفت یونس برلورز کلاتھ مرچنٹ نیو کلاتھ مارکیٹ میرپور خاص

خلعت عباس ۹ر سال
جماعت چہارم، کرکٹ کھیلنا
مضمون انگریزی، اردو، فوجی
بن کر وطن کی خدمت کا جذبہ ہے ۔
نزد ٹیوب ویل نمبر ۱۴ نیو نارتھ گل گشت کالونی ۔ ملتان

محمد فیصل شہزاد ۱۳ر سال
جماعت نہم، مطالعہ کرنا
مضمون، ریاضی، انگریزی
انجینئر بن کر خدمت وطن کا ارادہ ۔
۸۷ ۔ بی رحمانپورہ ۔ لاہور

محمد مشتاق ۰ ۱۶ر سال
جماعت دہم، وڈیو گیم کھیلنا
مضمون، اردو، آرمی آفیسر
بن کر وطن کی حفاظت کریں گے ۔
غوثیہ پارک نزد شیراز فیکٹری بند روڈ ۔ لاہور

اظہر راشد، ۱۳ر سال
جماعت ہشتم، قلمی دوستی
مضمون، اسلامیات، ڈاکٹر
بن کر غریبوں کا مفت علاج کریں گے ۔
محلہ بھٹہ کالونی ۔ فاضل پور ۔ تحصیل و ضلع راجن پور

محمد سمیع اللہ ۱۷ر سال
جماعت دہم، قلمی دوستی و
مطالعہ، اسلامیات، آرمی
افسر بن کر ملک کا دفاع کریں گے ۔
معرفت امیر دکاندار محلہ مبارک علی ۔ دیپالپور ۔ اوکاڑہ

سید امجد گردیزی، ۱۱ر سال
جماعت ہفتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، ریاضی، انگلش، کرکٹر
بننا چاہتے ہیں، وجہ ۔ شوق ہے ۔
۵۵۵ N ۔ سمن آباد ۔ لاہور

سنتوش کمار ۱۷ر سال
جماعت دہم، خدمت کرنا
مضمون، سائنس، بائیالوجی
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ، مریضوں کی خدمت
معرفت چندر لعل چپل اسٹور ۔ شاہی بازار ۔ پنو عاقل ضلع سکھر

محمد زاہد قیوم ۰ ۱۶ر سال
جماعت دہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، ریاضی، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ، لوگوں کی خدمت
مکان نمبر ۴۷، ۔ ۴ گلی نمبر ۳ ۔ محلہ باغ کالونی ۔ رحمانیہ روڈ ۔ فیصل آباد

مکرم رضا، ۱۵ر سال
جماعت نہم، قلمی دوستی
مضمون، انگریزی، فوجی آفیسر
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ، ملک کا دفاع
۴۲/۲ ۔ جانسن کول بلاکس ۔ ریلوے کالونی ۔ مغلپورہ ۔ لاہور

ظہور احمد، ۱۳ر سال
جماعت ہفتم، مشغلہ
فٹ بال کھیلنا، مضمون
حساب، پائلٹ بننے کا شوق ہے ۔
راشن شاپ نمبر ۳۲-۳ مہاجر کیمپ بلدیہ ٹاؤن کراچی ۵۱

ظفر عباس، ۱۲ر سال
جماعت ششم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، حساب، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ، قوم کی خدمت
مکان نمبر ۱۳ ۔ گلی ۸/۱ ۔ سردار چپل چوک ۔ بلال گنج ۔ لاہور

- قلمی دوستی کے اِس کالم میں صرف اسکول کے طلب شریک ہو سکتے ہیں ۔
- کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا ۔
- خراب اور نامکمل کوپن قابل قبول نہ ہوں گے ۔

نام ———— عمر ———— جماعت ————
مشاغل ———— اسکول میں پسندیدہ مضمون ————
بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ۔ ———— وجہ ————
پتہ ————————————

امّی ابّو کا صفحہ

اُمِّ رُمیصاءؔ

ادھر ہمارے بچّے نے رونا شروع کیا، اُدھر لمحے بھر میں بچّے کو خاموش کروانے کی ترکیب ہمارے ذہن میں آگئی... "چُپ کر جاؤ ورنہ بھوّ آجائے گا... بچّے نے دُودھ پینے سے انکار کیا اور ہم نے ایک ساعت کی دیر کیے بغیر کہہ دیا... دُودھ پی لو ورنہ چُڑیل آجائے گی... جلدی سے سو جاؤ ورنہ بھُوت پکڑ کرلے جائے گا، اپنی دانست میں ہم اپنے بچّے کو خوف زدہ کرکے کسی عمل سے باز رکھنے یا کسی خاص عمل پر اُکسانے کا جو کارنامہ سرانجام دے رہے ہوتے ہیں تو سچ یہ ہے کہ ہم عین اُس وقت اُس کی تباہی کا سامان کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے ہم نے جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے وہ ہمارے بچّے کے مستقبل کے لیے کس قدر بھیانک ہے۔ معصوم ذہن کے اسکرین پر خوف کی جو چھاپ ابھی سے پڑجاتی ہے، وہ زندگی بھر ختم نہیں ہوتی اور بچّہ شعوری یا لاشعوری طور پر خوف کے دائرے سے باہر نہیں نکل پاتا۔ اس طرح وہ زندگی کے بڑے مقاصد کو حاصل کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

بہادر مُہم جو اور تاریخ ساز شخصیات کے بچپن کا مطالعہ کرکے دیکھ لیجیے آپ کو اندازہ ہوجائے گا اُن کا بچپن خوف کے ماحول میں گزرا یا بہادری اور شجاعت کے ماحول میں۔ مغل بادشاہ اکبر ابھی گیارہ یا بارہ برس کا تھا کہ اقتدار کی ذمہ داری اُس پر آن پڑی... ایسے میں اُس کے اتالیق بیرم خان نے اُس کی تربیت کے لیے ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا کہ خطرناک جگہوں پر لے جاکر اکبر سے ہر وہ کام کرواتا جو اُس کے خوف کو کم کرنے اور ہمّت بڑھانے کا باعث بنے... ٹیپو سلطان کا بچپن جس طرح شیر کے بچّوں سے کھیلتے گزرا یہ آپ کے لیے نئی بات نہیں ہوگی...

یہ ساری باتیں جو ہمارا ورثہ تھیں اب یورپ اور امریکہ کے لوگوں نے اپنالی ہیں، اور وہاں ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ مہم جُو اور بہادر بچّے پیدا ہو رہے ہیں... اس کے برعکس خوف ہماری گھٹّی میں پڑ گیا ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ بچّوں کی تربیت خوف کے ماحول میں کرنے کے بعد بھی ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں محمّد بن قاسم اور محمود غزنوی کی طرح کے جیالے پیدا ہوں۔

ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ ہم بچّوں کو اس لیے ڈراتے ہیں کہ ہم خود شعوری یا لاشعوری طور پر خوف زدہ ہوتے ہیں... بس پہلے اپنا خوف ختم کیجیے... پھر اپنے بچّوں کو بے خوف بنائیے... اگر اپنے بچّوں کو کل کا بڑا آدمی بنانا مقصود ہے تو بھوّ، جن، بھُوت اور چڑیلوں کا ذکر آئندہ اُن کے سامنے اس انداز سے کبھی نہ کیجیے، کہ وہ اُن سے خوف کھانے لگیں۔

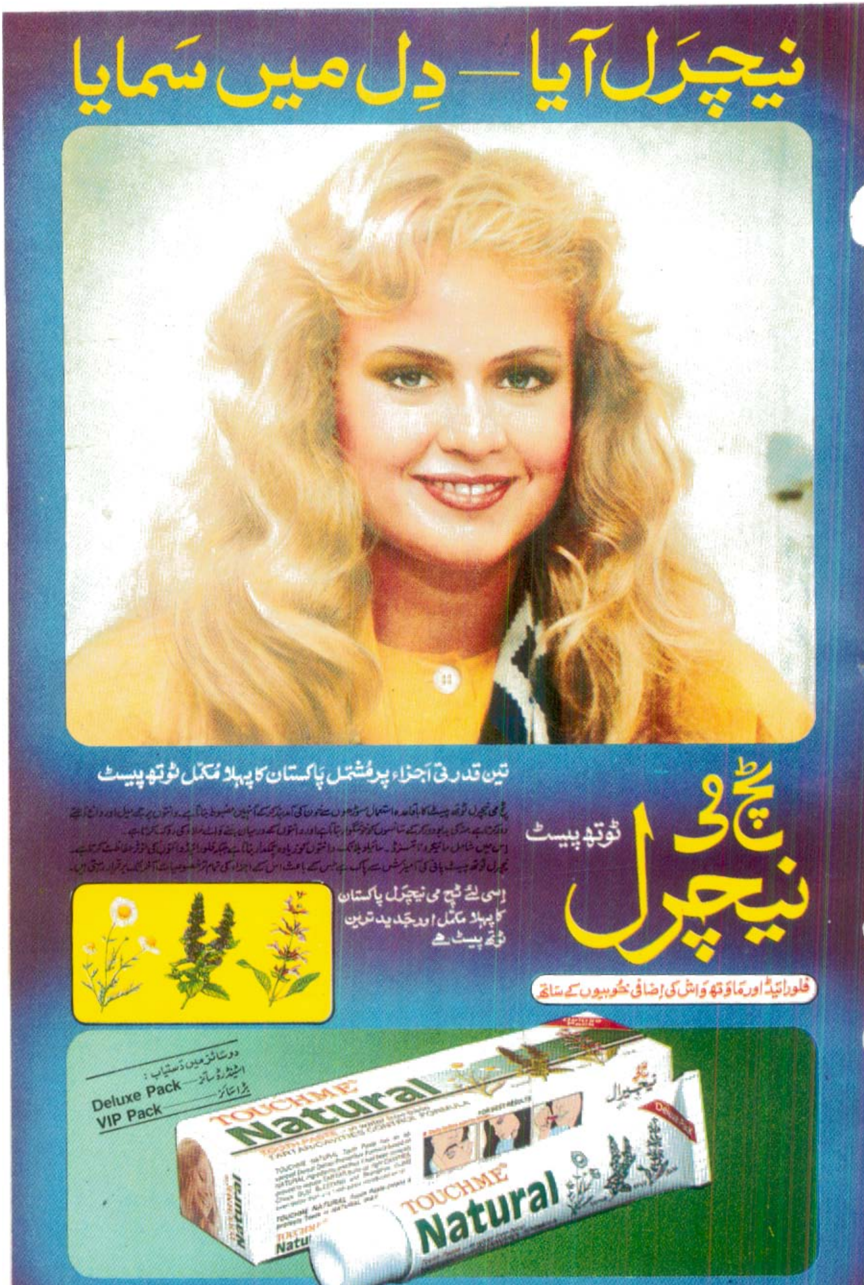

نیچرل آیا — دِل میں سَمایا
تین قدرتی اَجزاء پر مُشتمل پاکستان کا پہلا مُکمّل ٹوتھ پیسٹ
ٹچ می نیچرل
ٹوتھ پیسٹ
اِسی لئے ٹچ می نیچرل پاکستان کا پہلا مکمّل اور جدید ترین ٹوتھ پیسٹ ہے
فلورائیڈ اور ماؤتھ واش کی اضافی خوبیوں کے ساتھ
دو سائز میں دستیاب :
اسٹینڈرڈ سائز — Deluxe Pack
بڑا سائز — VIP Pack
TOUCHME
Natural

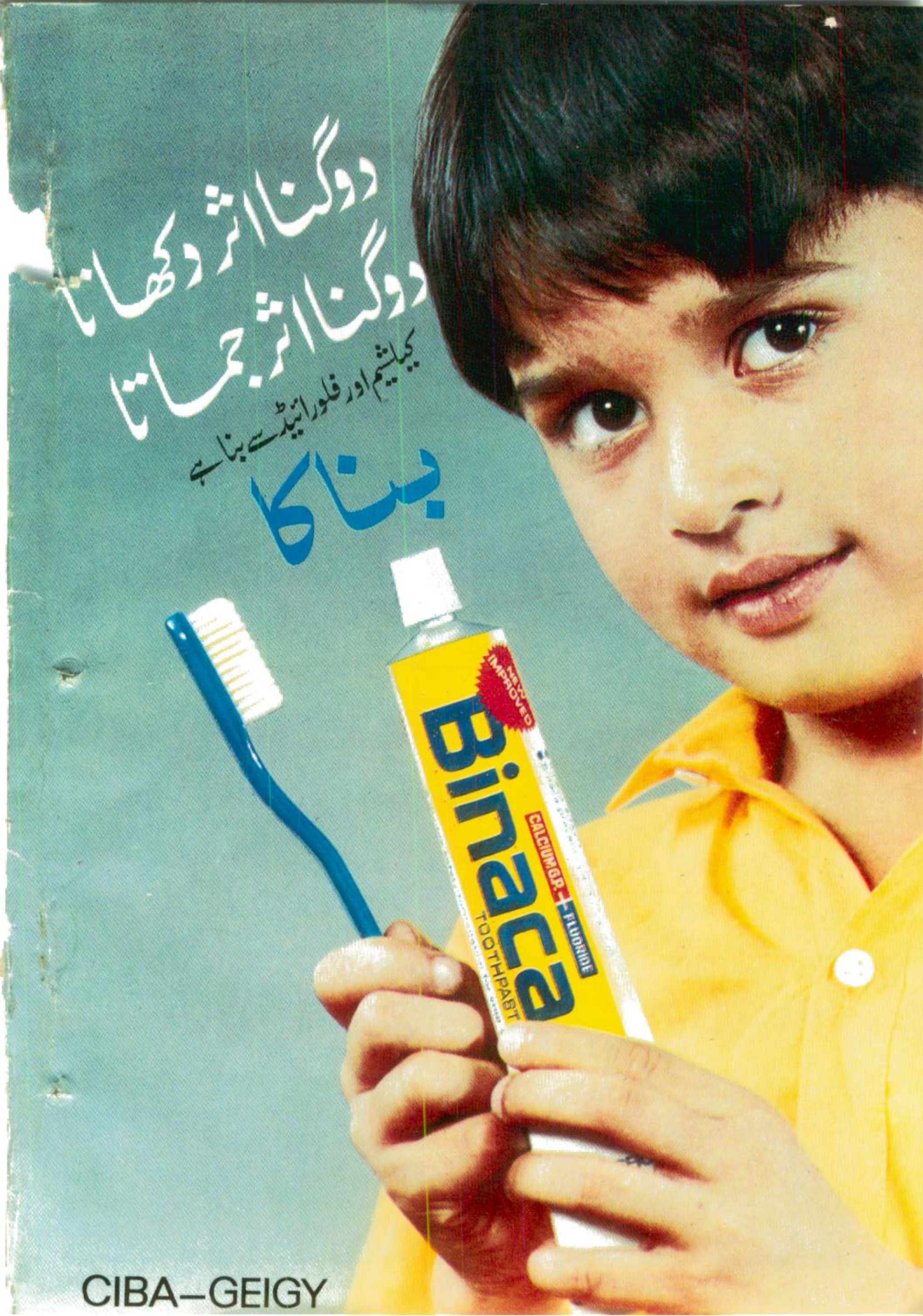
دوگنا اثر دکھاتا
دوگنا اثر جماتا
کیلشیم اور فلورائیڈ سے بنا ہے
بناکا
NEW IMPROVED
Binaca
CALCIUM G.P. + FLUORIDE
TOOTHPASTE
CIBA–GEIGY